إن اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یا أیہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ اوّل

از ولادت تا ختم سلسلۂ غزوات مع مقدمہ مشتمل بر نقد فن سیر و تاریخ عرب قبل ظہور و بعثت

...... ((تالیف)) ......

حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

المتوفی ۲۸ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۲ھ

باہتمام: مولوی مسعود علی ندوی

در مطبع معارف اعظم گڑھ مطبوع گردید

طبع ششم

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حصہ اول

مقدمہ
(فن روایت)
۱ — ۱۰۳

آفتاب رسالت کا طلوع

۱۹۹ - ۲۶۷

مدینہ منورہ اور انصار

۲۵۸

۳ھ

غزوۂ احد

۳۶۹ - ۳۸۶

مضمون	صفحہ

سنہ ۶ ھ

صلح حدیبیہ و بیعت رضوان

۴۴۷ – ۴۶۱

سنہ ۶ ھ (آخر)

سلاطین کو دعوت اسلام

۴۶۲ – ۴۷۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع چہارم سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور مرتب دونوں کے لئے بڑی نعمت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء مین مصنف کی وفات کے بعد جب سیرۃ کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ مین آیا، تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہئے استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب مین بھی ڈرجاتا تھا، مسودہ کا مبیضہ مصنف کے سامنے ہوچکا تھا اس لئے اس مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذون سے مین نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جون کی تون ناظرین کے سپرد کردی، بجز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشارون کے مطابق بعض چیزون کا اضافہ [ ] مین کردیا جس کی تصریح دیباچہ مین موجود ہے

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی، اور بار بار تصحیح ماخذ کی ضرورت نہین سمجھی،

لیکن اس اثنا مین کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقامون پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا،

اس دفعہ جب نئے نسخہ کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذون سے ملا کر دیکھا جائے، اور مقابلہ و مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسیون کتابون کو پھر سے دیکھنا، اور ہزارون صفحون کو الٹنا، متعدد و مختلف روایتون کو پرکھنا، اور ضرورت کے مقام پر حاشئے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی اس کام مین میرے دست و بازو ثابت ہوئے، واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتون کی چھان بین، اصل عبارتون سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابون کی طرف از سر نو مراجعت مین اون سے بڑی مدد ملی،

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہان اس ہیچمدان جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا اس دفعہ وہان حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا کہین کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا رفع شبہہ کی ضرورت تھی، وہان اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی، [illegible] کہین قرآن [illegible] کے حوالے تھے اور اشعار کے [illegible] ان سب کا اصل ماخذ ملا تو اس کا حوالہ [illegible] دیا گیا

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار مقام مین مدد کی غلطی جو اردو ہندسون مین اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ مین بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت ان کی غلطی معلوم ہوئی، اور اب ان کی تصحیح

کردی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپیہ چھپ گئی تھی، حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوہ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہو گئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایت میں ۱۲ ہزار لیکن صحیح روایات میں دس ہزار ہے،

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں جیسے زرقانی جس سے پورا استفادہ دقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی ان کو تلاش ہی رہی، مگر ان کو نہ مل سکی، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مصنف نے اکثر حسرت کے ساتھ اس کا افسوس کیا کہ تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آجانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح واضافہ میں ان سے کام لیا گیا،

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں :-

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو ازسرِ نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے، اور اس میں جہاں غلطی نظر آئی دور کیا گیا ہے،

۲۔ تصحیح بیان، دفع شبہہ، رفع ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں،

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے،

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں

کے نام تھے، اس دفعہ اُن کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے،

۵۔ جہان صرف صفحون کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دیدیئے گئے، تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو اڈیشن ہو اس مین نکال کر دیکھ لیا جاسکے،

۶۔ طبع اوّل کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابین چھپی تھین، اُن سے استفادہ کرکے اگر کوئی نئی بات اُن مین ملی ہے، تو اُس کا اضافہ کیا گیا،

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجہ کا تھا، اور بعد کو اُس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو اُس کو بڑھا یا گیا،

۸۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا اہتمام کیا گیا، تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو،

غزوۂ بدر کی روایتون کی تنقید کے سلسلہ مین ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خطا کار قلم سے حضرت کعبؓ بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان مین سوءظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے، اور اب مین اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلمزد کرکے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برأت کرتا ہون، اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار رہون،

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیر خویش عذر بدرگاہ خدا آورد

جن لوگون کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہون وہ اپنے نسخے سے ان سطرون کو کاٹ دین۔

لہ جن لوگون کے پاس سیرۃ النبی [illegible] کے صفحہ ۲۵۶ کی سطر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور طبع ما بعد کے ۲۸۳ کی سطر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

توبڑی مہربانی ہو، اب یہ موجودہ نسخہ طبع اوّل سے بہت سی باتوں میں بہتر ہوگیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان انسان ہے خطا ونسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظر کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرماکر ممنونِ کرم کریں،

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہ عالی میں دعا ہے کہ وہ میری خطا ونسیان سے درگذر فرماکر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرماکر اس گنہگار کیلئے بخشایش کا ذریعہ بنائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ۰

ہیچمدان

سید سلیمان ندوی

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ نبویؐ جلد اوّل طبعِ اوّل کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے اس اثنا میں خداوند تبارک تعالیٰ نے اُس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکسارانِ دار المصنفین کے لئے تحرّو ناز کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدر دانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا، اور امرا اور والیانِ ملک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا، بلکہ خواص اور علما کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی، ہندوستان میں اہلِ علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیاتِ قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اُس کی حدیثین جانچین، ادیبون نے اُس کے عربی اشعار اور ترجمون پر نقد کیا، علماے انساب نے اسمار کی تنقیح کی، منجمون اور حساب دانون نے اس کے زائچون اور تاریخون پر نظر ثانی کی، اہلِ تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پرتال کی، اور ہم ممنون ہین کہ نہایت خلوص و محبت سے انھون نے اپنے نتائجِ افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے اُن سے فائدہ اٹھایا

طبعِ اوّل میں جیسا کہ خاتمہ مین ہم نے اقرار کیا تھا چھاپہ کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات

رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے، اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ یہ غلطیوں اور سہو کتابت سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرۃ پر نقد کرنا چاہتے ہوں، اُن کو یہی نسخہ پیش نظر رکھنا چاہیے

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو تاکہ وہ بآسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ اُن کی تعمیل ہے، انشاء اللہ ہر جلد کے طبعِ اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبعِ ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی،

سید سلیمان ندوی

۲۰ر ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

سیرۃ نبوی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے آج ۴ سال کے بعد اُسکی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ مین جاتی ہے مین اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہون کہ استاد مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ مین جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمد للہ کہ اُس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہون ع

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت و اطمینان کے ساتھ یہ حسرتناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کرسکا، اور حسن عقیدت کے جو پھول اس نے گردِ چمن کے دامن سے چن کر اُس کے ہاتھ مین تھے اُن کو آستانہ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا،

مصنف مرحوم کو سیرۃ نبوی کے لکھنے کا خیال الفاروق کے بعد ہی پیدا ہوگیا تھا چنانچہ ۱۳۲۳ھ مین اس کو ایک مختصر سا خاکہ یعنی غزوۂ احد تک وہ لکھ بھی چکے تھے[1] کہ بعض مشکلات

---

[1] یہ مسودہ اب تک موجود ہے،

کی بنا پڑ گئے لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انھوں نے سنہ ۱۳۳۰ھ میں اس بار امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کرلیا، چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لئے انھوں نے قوم میں مراسلہ پیش کیا، سیکڑوں دولت مندوں اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، ان میں فقرائے ہمت بھی تھے، اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت بخت ازلی سے خادمۃ الملۃ النبویۃ مخدومۃ الامۃ المحمدیۃ نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمانروائے بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا ودوام ملکہا کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب کے آگے بڑھیں، اور سوانح نگاری نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کرکے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کرلیا فرمانروائے خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں آئندہ مورخ غالباً اس کارنامہ کو ان میں سب سے بڑا قرار دیگا کہ اس کا تعلق اس ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گذاری کے لئے مسلمانوں میں چندہ اندازی ہوتی لیکن فرمانروائے بھوپال نے مصنف کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلۂ فیض کو بدستور جاری رکھا، مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق[۱] اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے جن کی مرہون منت یہ نسیم سعادت کے جھونکے اس باغ قدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا، اس میں اس حصہ تک بیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی، اور مطالب کی اشارہ تھا، ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم

[۱] مکاتیب شبلی جلد اول ص ۲۶۱؛

ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد اُن کو خیال آیا کہ قدیم مورخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب کیکر ہر سنہ کے آخرمین جزئی حالات "واقعات متفرقہ" کے عنوان سے لکھدیے جائین، چنانچہ سبتینہ پرسنہ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو مین نے بقیہ سنین کے آخر مین اسی قسم کے جزئیات متفرقہ کا اضافہ کردیا، حواشی یا حوالے کہین کہین چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف کی عبارت مین نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافون کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بنا پر لفظ "صلعم" یا جملہ ہائے معترضہ کے سوا جو چند فقرے اور عبارتین قوسین مین ہین اضافہ ہین،

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اول کو وفات تک وسعت دی جائے لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۰۰ ۸ صفحے تک پہنچ جائے گی، اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچیگا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی اُس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدون مین تقسیم کردیا جائے چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ و غزوات پر ختم کردی گئی، اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعتِ اسلام، وفات، اور اخلاق کی الگ کردی گئی، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے، حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل،

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے، اُن کے مسودات مین اتفاقاً یہ تحریر ملزدہ مل گئی، اسی کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخل کتاب کیا جاتا ہے

جامع

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین اعظم گڈھ ۲۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۶ھ

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا شہنشاہِ کونین کے دربار
میں، اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے
زچشمم آستین بردار و گوہر را تماشا کن

شبلی

شوال سنہ ۱۳۳۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ پند و موعظت ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جائیں اور تمام ملک میں پھیلائی جائیں، اور لوگوں کو اُن کی تعلیم دی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بجبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے، اور رذائل سے روکے جائیں،

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی کے دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ

عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے، جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے دیگر اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں،

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے اُس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ کے مکتبِ درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر مرتبہ پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی بادشاہ کشور کشا بھی، اور گدا بھی، فرمانروائے جہان بھی ہو، اور سبحہ گردان بھی مفلس فاقہ کش بھی ہو، اور غنی دریادل بھی، یہ بزرخ کامل

(۱) یہاں پر کتاب کی اس عبارتِ بالا کے مخاطب اہلِ کتاب ہیں، جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں، وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے اُن کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک با کمال و ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے،

لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا، اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے،

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ (بقرہ۔۴۰) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے

یہ ہستی جامع، صحیفۂ یزدانی، عالم کون کی آخری معراج ہے، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ، (۱)
عالم فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع، دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے
ضروری ہوا کہ اُس کی زبان کا ایک ایک حرف، اُس کی حرکات وسکنات کی ایک ایک ادا اُس کے
حلیۂ وجود کے ایک ایک خط وخال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے

(بقیہ حاشیہ ص ۲) اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے،

دوسری طرف ارشاد ہے،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ، (بقرہ - ۳۳)

یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں کو بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے اُن کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل) سے فرمائی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے، ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے،

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالاتِ نبوت وفضائلِ خلاق سے یکساں سرفراز تھے، مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات اور مصالحِ الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور، تمام انبیاء میں یکساں نہیں ہوا، بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی، وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا، اور دوسرے کمال کا جس کی اُس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، یہ مصلحت یہ کمال ظہور نہیں ہوا،

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع ومحل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو، تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورتِ حال ان انبیائے کرام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت یں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات وفضائل سے متصف نہ تھے،

رہنمائی کے کام آئے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیانِ مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، اُن کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام رہ گئیں، جناب مسیحؑ کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحِ دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے، جو حضرت موسیٰؑ کے ۳۰۰ برس بعد وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ اُن کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اُترا، اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ دان ہے، اور جب

(بقیہ حاشیہ ص ۳) غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کر دینے کا مشورہ دیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت و رحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں، اے ابوبکر تمہاری مثال ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کی، اور اے عمر تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے، یعنی ایک فریق سے رحم و کرم کا، اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا (دیکھئے مستدرک حاکم غزوۂ بدر)۔

اس حدیث میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوال مبارکہ میں رہا ہے لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ عالمگیر اور عمومی تھی، اس لئے یہ ضرورت تھی کہ تمام کمالاتِ نبوت آپ کی زندگی میں یکجا ہو کر جلوہ گر ہوئے، اور آپ کی نبوت کے آفتاب عالمتاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعلِ ہدایت ہو، غرض یہ کہ عالم کا ہر گوشہ آپ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پرنور ہوا صلی اللہ علیہ وسلم اب توضیح ہے، یہ رکھنا چاہئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایک پہلو خود بخود پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسرِ شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھیے ... ہمارا مضمون "خلیل کی بشریت" "س"

جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خود مہیا کر دیتی ہے

(تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے، جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے کہ دنیا میں وہ کون شخص گذرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلمبند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لیے بھی نہ ہو سکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال وغیرہ وضع قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے، (محمد عربی فداہ ابی و امی))

یہ جو کچھ کہا گیا مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے، دنیا سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیلِ راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی و عمل، جد و جہد، ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہ

یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے،

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو شخص کا سوال نظرانداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصا و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں، تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے،

وجوہ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجودِ مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے جس کا نام مبارک محمد رسول اللہ ہے، اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ صَلٰوۃً کَثِیْرًا کَثِیْرًا، یہ نہ صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے، اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریات دینی و دنیوی ہے،

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرۂ نبوی کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں،

اگلے زمانہ میں سیرۃ کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام

نے اس کو مسئلہ یہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزوِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟ یورپ کے مؤرخین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہرآلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں، اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اُس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامنِ اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرۂ نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب، اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کرین گے کہ خاص سیرت پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہین لکھی گئی جس مین صرف صحیح روایتون کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرۃ نبوی مین لکھتے ہین،

سنہ ۱؎ اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہو، جو آج کل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث مین سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات سے متعلق ہین، تو یہ سیرت بن گئی، اور چونکہ حدیث مین متعدد کتابین ایسی موجود ہین، جن مین ایک حدیث بھی ضعیف نہین مثلاً صحیح بخاری و مسلم، تو یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہو کہ سیرت مین کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہین لکھی گئی"، اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہییں،

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے، چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہین، اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی مین یہ دونون نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہین، فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہو، فقہ مین جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہین اُس مین سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہین،

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا، چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابین سیرت کے نام سے مشہور ہین، مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ ان مین زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہین، البتہ زمانہ مابعد مین مغازی کے سوا، اور اور چیزین بھی داخل کر لی گئیں، مثلاً مواہب لدنیہ مین غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے،

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح مین مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے لیکن تاہم

وليعلم الطالب ان السيرا   تجمع ما صح وما قد انكرا

یعنی طالب فن کو جاننا چاہیے کہ سیرۃ میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں صحیح بھی اور قابل انکار بھی

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلّم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں

(بقیہ حاشیہ ص ۹) اگر بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعے مثال کے طور پر لکھتے ہیں:۔

غزوات میں ایک غزوہ **ذو قرد** کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے، اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

لا يختلف اهل السير ان غزوة ذي قرد كانت قبل الحديبية فيكون ما وقع في حديث سلمة من وهم بعض الرواة،	اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے، وہ کسی راوی کا وہم ہوگا،

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں:۔

فعلى هذا ما في الصحيح من التاريخ لغزوة ذي قرد اصح مما ذكره اهل السير،	تو اس بنا پر (صحیح مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو ارباب سیر نے بیان کی ہے،

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں، انھوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے، اس میں انھوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی، لیکن جب زیادہ تحقیق کی تو ان کو معلوم ہوا کہ حدیث صحیح

اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور اُن سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ص ۹) اکو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے، اس لئے نہ کر سکے،

حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کرکے لکھتے ہیں:-

ويدل هذا على انه كان يعتقد الرجوع عن كثير مما وقع فيه، هل السير وخالف الاحاديث الصحيحة وان ذلك كان قبل تضلعه منها ولخروج نسخ كتابه وانتشاره لم يتمكن من تغييره، (زرقانی بر مواہب جلد ۲ صفحہ)	اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیر سے اتفاق کرکے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں گے، اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن کے قبل صادر ہوا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے

۲- ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا، لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے، کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:-

واما شيخه الدمياطي فادعى غلط الحديث الصحيح وان جميع اهل السير على خلافه (فتح الباری جزو ہفتم صفحہ ۳۲۲)	باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انہوں نے حدیث کی نسبت غلطی کا دعوی کیا ہے، اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں،

حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کرکے اس کا دعوی رد بھی کیا ہے،

ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لئے ایک مجلسِ تصنیف کی ضرورت تھی جس میں قابل عربی دان اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا، تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی،

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے، اور نہ آیندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے، اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا، طبقات ابن سعد کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰) اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہٖ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدتِ احتیاط کا لحاظ نہیں رکھا جاتا جو فنی صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ (باستثنائے قرآن) اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پایہ ہے،

۳۔ مغازی کا اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے ساتھ نہیں مل سکتیں، اس سے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑا ہے، اسی لئے سیرت و مغازی کا رتبہ حدیث سے کم ہے،

۴۔ جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرۃ کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج جس قدر کتابیں قدماء سے لیکر متاخرین تک کی موجود ہیں مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ کسی میں یہ التزام نہیں،

تفصیل مذکورۂ بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ ہماری اس تصنیف سے کہ سیرت میں درج تک کون کتب صحیحہ

لابن سعد، کتاب عبداللہ بن علی بن الجارود، کتاب العقیلی فی الصحابہ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الازدی، کتاب الدولابی، کتاب البغوی[۱]، طبقات ابن ماکولا، اسد الغابہ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابہ، صرف انہی بزرگوں کے حالات میں ہیں۔ کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکے ہیں؟

سیرت نبوی کے متعلق قدما نے جو ذخیرہ[۲] مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ

عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا، اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج اگرچہ کم سہی، مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نبطی خط تھا جس کے کتبے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱) ... نام کے ساتھ نہیں لکھی گئی تو اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے؟

۱؎ ان کتابوں کا ذکر تہذیب کے دیباچہ میں ہے۔ ۲؎ یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں، جو سیرت میں کام آ سکتے ہیں، تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، حدیث کی کتابوں سے علاوہ ہیں۔

آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں، اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے، اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے،

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں اکثر افسانے ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا ان کے یہ نام تھے، ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشات، یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں، اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کئے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلۂ بولان (قبیلۂ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے ان کے نام مرامر بن مرة، اسلم بن سدرة، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمر بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد بن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا، اور غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب قریش نے مکہ پر قبضہ کر لیا تھا، اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے، ابن الندیم نے ذکر کیا ہے کہ مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب ابن ہاشم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے،

حق عبد المطلب بن هاشم من	یعنی عبدالمطلب بن ہاشم جو مکہ کے رہنے والے ہیں ان کا
اهل مكة على فلان ابن فلان الحميري	فلاں شخص پر جو حمیری ہے، اتنے درم ہیں

من اہل ورزان صنعاء علیہ الف — یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں جب طلب کیا

درہم فضۃ کیلا بالحدید ومتی — جائے گا وہ ادا کرے گا، خدا اور دو فرشتے

دعا بھا اجابہ شہد اللہ والملکان[۱] — گواہ ہیں،

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، قبالہ میں دو فرشتون کی گواہی لکھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ مین فرشتون کا (اور شاید کرام کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا،

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتون کا خط ہوتا ہے،

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب بعثت ہوئی تو قریش مین ۱۷ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، طلحہؓ، یزیدؓ، ابوحذیفہؓ، ابوسفیانؓ، شفا بنت عبداللہ وغیرہ،[۲]

بدر کی لڑائی جو سنہ ۲ھ مین ہوئی، اس مین قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، اُن سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے، جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچون کو اپنے ذمہ لیکر اُن کو لکھنا سکھا دے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہین، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا،[۳]

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ مین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[۱] ابن ندیم، ... [۲] فتوح البلدان ذکر خط، مطبوعہ یورپ [۳] طبقات ابن سعد غزوہ بدر، صفحہ ۱۴،

کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں، اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي	مجھ سے جو سنو اس کو قلمبند نہ کرو (بجز قرآن کے)
غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ،	اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی تحریریں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے، کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں بعض صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ کہ صحابہؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمروؓ مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں، اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آپؐ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے، حق نکلتا ہے۔[1] خطیب بغدادی نے بہ

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۷۷

رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبد اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے، صادقہ تھا۔

ایک دفعہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، ان کے نام قلمبند کئے جائیں

چنانچہ پندرہ سو صحابہؓ کے نام دفتر میں درج کئے گئے۔[1]

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے، تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھ لی تھیں"

متعدد قبائل کو آپؐ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے، وہ تحریری تھے، اور کتب احادیث میں بعینہٖ منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوت اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے،

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال، جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس شخص کیلئے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے،

غرض متعدد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو رہا تھا،

(۱) جو حدیثیں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت علیؓ و حضرت انسؓ وغیرہ نے قلمبند کیں؛

[1] یہ تمام روایات صحیح بخاری وغیرہ میں ہیں، ان کا ذکر صحیح بخاری، باب جنگ، ج ۱ ص ۲۲ و صحیح مسلم کتاب [illegible] میں [illegible]۔

(۲) تحریری احکام اور معاہدات (صلح حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبائل کے نام بھیجے[1]،

(۳) خطوط جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سلاطین اور امراء کے نام ارسال فرمائے،

(۴) پندرہ سو صحابہؓ کے نام،

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی روایات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں[2]،

مغازی | عرب میں علوم و فنون نہ تھے صرف خاندانی فخر کے، اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں، اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا، خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ان اقوال و افعال پر توجہ کی جن کو شریعت سے تعلق تھا، اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے،

امام بخاری نے غزوۂ احد کے ذکر میں سائب بن یزید سے یہ روایت نقل کی ہے،

صحبت عبد الرحمن بن عوف — میں عبد الرحمن بن عوفؓ اور طلحہ بن عبید اللہؓ

---

[1] سنن ابن ماجہ ص ۱۳۰، و ابو داؤد جلد ۲ ص ۵۵، ۵۶، [2] بخاری جلد ۱ ص ۵ و ایضاً ص ۱۵ [3] بخاری جلد ۱ ص ۱۵
[4] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی تذکرۂ امام زہری،

وطلحة بن عبيد الله، لمقداد وسعد انما سمعت احدا منهم یحدث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا انی سمعت طلحة یحدث عن یوم احد

مقداد اور سعدؓ کی صحبت میں رہا، لیکن میں نے اُن کو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا، بجز اس کے کہ طلحہؓ غزوۂ اُحد کا واقعہ بیان کرتے تھے،

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ ومقدادؓ وسعدؓ وقاص، اکابر صحابہؓ میں ہیں، اور ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بجز اس کے کہ طلحہؓ جنگ اُحد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے،

یہی وجہ تھی کہ علما میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنایا تھا، وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے، خواص میں اُس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اسی درجہ کا دوسرا گروہ اُن کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئیگی،

امام احمد بن حنبل کا قول ہے،

ثلاثة کتب لیس لہا اصول المغازی والملاحم والتفسیر[1]

تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، مغازی اور ملاحم اور تفسیر،

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کرکے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل کی مراد اُن خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے،

---

[1] موضوعات ملا علی قاری، مطبع مجتبائی ص ۵۰،

اما كتب التفسير فمن اشهرها	باقی تفسیر کی کتابیں تو اُن میں سے کلبی اور
كتابا الكلبي ومقاتل بن سليمان	مقاتل کی کتابین بہت مشہور ہین، امام
وقد قال احمد في تفسير الكلبي	احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اوّل
من اوّله الى آخره كذب،	سے اخیر تک جھوٹ ہے،

پھر لکھتے ہین :-

واما المغازي فمن اشهرها	باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد
كتاب محمد بن اسحاق وكان	ابن اسحاق کی کتاب ہے، اور وہ عیسائیون
ياخذ من اهل الكتاب وقد قال	اور یہودیون سے روایت کرتے تھے اور
الشافعي كتب الواقدي كذب،	امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابین[1] جھوٹ ہین

باوجود ان باتون کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظرانداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جانچ تک خوب محفوظ ہوتے تھے، روایت کرتے تھے،

تصنیف و تالیف کی ابتدا، سلطنت کی وجہ سے ہوئی،

صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ مین اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنی اُمیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں لکھوائین، قاضی ابن عبد البر نے جامع بیان العلم مین امام زہری کا قول نقل کیا ہے،

كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا	ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے
عليه هؤلاء الامراء،	تھے، یہان تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا،

[1] مطبوعہ مصر ص ۱۳۶،

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدما کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضیین تھا۔[1]

امیر معاویہؓ کے بعد عبد الملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علما سے تصنیفیں لکھوائیں سعید بن جبیر جو امام علما تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی عطا بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے، اُن ہی کی تفسیر ہے، عطا کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آگیا تھا۔[2]

حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو انھوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی، تمام ممالک میں حکم بھیجدیا کہ احادیثِ نبویؐ مدون اور قلمبند کی جائیں، سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے، اور تمام ممالکِ مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبد البر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں :-

عن سعد بن ابراہیم قال امرنا	سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز
عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناها	نے ہم کو حدیث کے جمع کرنے کا حکم دیا ہم نے
دفترا دفترا فبعث الی کل ارض له	دفتر کے دفتر لکھے، عمرؓ نے جہاں جہاں اُن
علیها سلطان دفترا۔[3]	کی حکومت تھی، ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاذ اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔[4]

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۱۴۴ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ عطاء بن دینار [3] مطبوعہ مصر ص ۳۶ [4] طبقات ابن سعد جزو ثانی قسم ثانی ص ۱۳۳

حضرت عائشہؓ کی روایتیں

حدیث میں حضرت عائشہؓ کی روایت کی ایک خاص حیثیت ہے، یعنی ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں جو عقائد یا فقہ کے متعلق مسائل ہیں، اس لئے عمر بن عبدالعزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، عمرہ بنت عبدالرحمن ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوشِ تربیت میں پالا تھا، وہ بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علما کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا اُن سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرہ کے مسائل اور روایات قلمبند کرکے بھیج دیں،[1]

مغازی پر خاص توجہ اب تک مغازی و سیر سے چنداں اعتنا نہیں کیا گیا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی، اور حکم دیا کہ غزوات نبویؐ کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے، عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے، اُن کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں،[2]

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے علم اعلیٰ تھے، فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انھوں نے حدیث و روایت کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائی ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے، جوان، بڈھے، عورت، مرد، جو ملتا، یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور حالات پوچھتے، اور قلمبند کرتے، وہ نسباً قرشی تھے، بنو شہاب میں سے

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن محمد و عمرہ بنت عبدالرحمن، طبقات ابن سعد جزء دوم حصہ دوم ص ۱۳۴ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ، [3] تہذیب التہذیب ترجمہ زہری ...

بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا، سنہ ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اُس نے بہت قدر و منزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور مقربین خاص میں داخل تھے، ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم اُن کے سپرد کی تھی، ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، اُن کے حلقۂ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، اُن میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز، فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں اُن لوگوں کا امتیازی وصف صاحب المغازی لکھا جاتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی، اور یہی دو شخص ہیں، جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ خاندان زبیر کے غلام تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک اُن کے شاگرد ہیں، امام مالک اُن کے نہایت مداح تھے، اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، اُن کے مغازی کے خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا،

(۲) عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کئے جائیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی، اور صرف وہی روایتیں لیں جو اُن کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتاب بہ نسبت اور کتب مغازی کے

کے مختصر ہے،

(۳) چونکہ روایتِ حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغازِ شباب ہی سے حلقۂ درس مین شامل ہو جاتے تھے، اور حدیثین سن کر لوگون سے روایت کرتے تھے، لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتون مین تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگون کے بڑی عمر مین اس فن کو سیکھا تھا[1] سنہ ۱۴۱ھ مین وفات پائی،

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہین لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابون مین کثرت سے اس کے حوالے آتے ہین،

محمد بن اسحاق

محمد بن اسحاق نے فنِ مغازی مین سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امامِ فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہین، شہرتِ عام مین اگرچہ واقدی ان سے کم نہین لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلّمۂ عام ہے، اور اس لئے اُن کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہین، ایک صحابی (حضرت انسؓ) کو دیکھا تھا، علمِ حدیث مین کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہین چلے آئین، اُن کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین مین اختلاف ہے، امام مالکؒ اُن کے سخت مخالف ہین، لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر مین اُن کی روایتین استناد کے قابل ہین، امام بخاری نے صحیح بخاری مین اُن کی روایت نہین لی، لیکن جزء القراۃ مین اُن سے روایت کی ہے، تاریخ مین تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہین،

[1] تہذیب تہذیب ترجمۂ موسیٰ ابن عقبہ

فنِ مغازی کو انھون نے اس قدر ترقی دی، اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفاے عباسیہ جو زیادہ تر اور قسم کی تصنیفات کا مذاق رکھتے تھے، اُن مین مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن مین کوئی تصنیف اُن کی تصنیف کے رتبہ کو نہین پہنچی[1]،

ابن حبان نے کتاب الثقات مین لکھا ہو کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ اُن یہودیون سے دریافت کر کے داخلِ کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے، اور چونکہ یہ واقعات انھون نے یہودیون سے سنے ہون گے اسلئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہو کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاری سے روایت کرتے تھے، اور اُن کو ثقہ سمجھتے تھے، ۱۵۱ھ مین وفات پائی،

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدیؒ کے زمانہ مین ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی مین ہوا، اسی کا قلمی نسخہ الٰہ آباد مین ہماری نظر سے گذرا ہے،

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی، اور بڑے بڑے مشہور محدثون نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ تنقیح اور اضافہ کر کے مرتب کیا جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے، اس لئے آج اس کی جو یادگار موجود ہے وہ یہی ابنِ ہشام کی کتاب ہے،

ابن ہشام ابن ہشام جن کا نام عبد الملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور مورخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے،

---

[1] تہذیب التہذیب۔

اور غالباً اسی تعلق سے سلاطینِ حمیر کی تاریخ لکھی، جو آج بھی موجود ہے، انھوں نے سیرت میں یہ
اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، اُن کی تفسیر بھی لکھی، ۲۱۸ھ میں وفات پائی،

سیرت ابنِ اسحاق کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا، چنانچہ ابو نصر فتح بن موسیٰ
خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ و عبد العزیز احمد المعروف بہ سعد دیری المتوفی فی حدود ۶۰۷ھ و
ابو اسحاق انصاری تلمسانی، و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ
نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں، اور اس کا نام فتح القریب فی سیرۃ الحبیب ہے،

ابن سعد واقدی خود قابلِ ذکر نہیں لیکن اُن کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم، اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع و مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا،
ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو اُن کے استاد واقدی قابلِ اعتبار
نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں، خطیب بغدادی نے اُن کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں،

كان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة صنف كتاباً كبيراً
فی طبقات الصحابة والتابعين الى وقته فجاد فيه واحسن۔[1]

یہ موالی بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی،
بلاذری جو مشہور مورخ ہیں، انہی کے شاگرد ہیں، ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی،
اُن کی کتاب کا بڑا حصہ جس کی ۱۲ جلدوں میں سے دو جلدیں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے حالات میں ہیں، اور یہ حصہ دراصل سیرۃ نبوی ہے، باقی حصے میں صحابہ و تابعین کے حالات ہیں

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن سعد۔

اور چونکہ صحابہ کے حالات مین ہر جگہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر آتا ہے اس لئے ان حصون مین بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے،

یہ کتاب قریبا ناپید ہو چکی تھی یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ مین اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا شہنشاہ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا چنانچہ لاکھ روپئے جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزا فراہم کر کے لائین، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ مصر اور یورپ جاکر جابجا سے تمام جلدین بہم پہنچائین یورپ کے بارہ پروفیسرون نے الگ الگ جلدون کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) مین چھپ کر شائع ہوا،

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ تمام روایتین بہ سند مذکور ہین، اس لئے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جاسکتی ہین،

س زمانہ مین سیرت پر اور بھی بہت سی کتابین لکھی گئین، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ مین ان کے نام مذکور ہین لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہین نہ ان کا آج وجود ہے، اس لئے ہم ان کے نام نظرانداز کرتے ہین،

تاریخ صغیر و کبیر امام بخاری

سیرت کے سلسلہ سے الگ . . . تاریخی تصنیفات ہین، ان مین سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئین یعنی جن مین روایتین بہ سند مذکور ہین، ان مین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے وہ بھی دراصل سیرت نبوی ہے، ان مین سب سے مقدم اور قابل استناد امام بخاری کی دونون تاریخین ہین، لیکن دونون نہایت مختصر ہین، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے،

اس میں سیرت نبوی کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں، اور اُن میں بھی کوئی ترتیب نہیں، کبیر البتہ بڑی ہے، میں نے اس کا نسخہ جامع ایاصوفیہ میں دیکھا تھا لیکن سوانح نبوی اس میں بہت کم ہیں، اور جستہ جستہ واقعات بلا ترتیب مذکور ہیں،

امام طبری

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین اُن کے فضل وکمال، وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں، اُن کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں میں کسی کو اُن سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، سنہ ۳۱۰ھ میں وفات پائی،

بعض محدثین (سلیمانی) نے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے،

ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن	یہ جھوٹی بدگمانی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر
جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین	اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں،

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ ان میں فی الجملہ تشیع تھا لیکن مضر نہیں، تمام مستند مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر ابن خلدون، ابو الفداء وغیرہ انہی کی کتاب سے ماخوذ ہیں، اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی، اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی،

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور مستند ہیں، ان کا اور اُن کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں،[1]

---

[1] ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں، اور یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے، ان کے نام لکھنے سے

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر	سنہ ۹۴ھ	حضرت زبیرؓ کے بیٹے، اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نواسے تھے حضرت عائشہؓ کی آغوش تربیت مین پلے تھے، سیرت و مغازی مین کثرت سے اُن کی روایتین ہین، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ مین ان کے متعلق لکھا ہے کہ کان عالماً بالسیرۃ، صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان مین لکھا ہے کہ بعضون کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب انہی نے تدوین کی۔
شعبی	سنہ ۱۰۹ھ	مشہور محدث ہین، اکثر فنون مین کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی و سیر مین اُن کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ گو مین ان غزوات مین بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہین"
وہب بن منبہ	سنہ ۲ھ	یمن کے مجوسی خاندان سے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے کچھ حدیثین سُنی تھین، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارات اور پیشین گوئیان کثرت سے انہی سے مروی ہین،
عاصم بن عمر بن	سنہ ۱۲۱ھ	مشہور تابعی ہین حضرت انسؓ اور اپنے باپ، اور اپنی دادی رمیثہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷) غرض یہ کہ ہر قسم کی تصنیفین حتی یہ ان مین کثرت ان کے ہوتے آتے ہین، اس لئے ناظرین کو ان حالات کی صحت و عدم صحت یا قوت و ضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا،

قتادہ انصاری		سے روایت کرتے ہیں، مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے،
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	[illegible]	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے،
یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی	[illegible]	نہایت ثقہ تھے، عمال و گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبویؐ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا،
موسیٰ بن عقبہ اسدی	سنہ ۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے،
ہشام بن عروہ ابن زبیر	سنہ [illegible]ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انھوں نے بیان کیں، محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، فن سیرت میں ان کے متعدد نامور تلامذہ ہیں،
محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	سنہ ۱۵۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے،
معمر بن راشد الازدی	سنہ [illegible]ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے،

		اسماعیل علم حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب اُن کی تصنیف ہی جسکا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہی،
عبد الرحمن بن عبد العزیز الاوسی	سنہ ۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے اُن سے ایک روایت کی ہی محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے، ابن سعد نے اُن کے متعلق لکھا ہی، کان عالما بالسیرۃ وغیرھا،
محمد بن صالح بن دینار التمار	سنہ ۱۶۹ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں، ابن سعد کا بیان ہی کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہی، ابو الزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو،
ابو معشر نجیح المدنی	سنہ ۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ثوری اور واقدی نے اُن سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایتِ حدیث میں اُن کی تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں اُن کی جلالتِ شان کا اعتراف کیا ہی، امام بن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحبِ نظر ہیں، ابن ندیم نے اُن کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہی، کتب سیرت میں اُن کا نام کثرت سے آتا ہے،
عبد اللہ بن جعفر بن عبد الرحمن المخزومی	سنہ ۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ کے پڑپوتے تھے، فنِ حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے، سیرت نبوی کے اکابر علما میں تھے، ابن سعد نے

		اُن کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں من رجال اهل المدینة عالمًا بالمغازی،
عبد الملک بن محمد بن ابی بکر ابن عمرو بن حزم الانصاری،	سنہ ۱۷۶ھ	فنِ حدیث وسیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، ان کے دادا وہ شخص ہیں جنھوں نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے حکم سے سب سے پہلے فنِ حدیث کی تدوین کی، اُن کے رشتہ کی دادی عمرۃ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں، یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ اُن سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں اُن کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے،
علی بن مجاہد رازی الکندی	سنہ ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے اُن سے روایت کی ہے، مغازی کے جامع ومصنف ہیں، لیکن ارباب نقد کے نزدیک اُن کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں،
زیاد بن عبد اللہ ابن الطفیل البکائی	سنہ ۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد، اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگوں کے واسطہ منفرد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھربار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے، اور مدت تک سفر و حضر میں اُن کے شریک رہے، محدثین کی بارگاہ میں گو اُن کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں،

سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	سنہ ۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد، اور اُن کی سیرت کے راوی ہیں، رے کے قاضی تھے، اہل نقد کے نزدیک قابل احتجاج نہیں، لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں اُن کی توثیق کرتے ہیں، اُن کی سیرت کو بہترین سیر تمام سیر نبوی کہتے ہیں، طبری میں اُن کے واسطہ سے کثرت روایتیں مروی ہیں،
ابو محمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی	سنہ ۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ قلیل الروایت ہیں، لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفین مغازی میں اُن کا نام بھی لیا ہے،
ولید بن مسلم القرشی	سنہ ۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے، شام میں اُن کے زمانہ میں اُن سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے اُن کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا، اُن کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے جن میں ایک کتاب مغازی کی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے،
یونس بن بکیر	سنہ ۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فن روایت و حدیث میں اُن کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں اُن کا نام بلقب صاحب المغازی لیا ہے، اور ان کی مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھی ہے، (زرقانی مواہب جلد ۲ ص ۱۰)

محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	سنہ ۲۰۷ھ	سیرت نبوی کے متعلق اُن کی دو کتابیں ہیں کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف مجموعہ کذب ہے کتب سیرت کی کی کثیر روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں؛
یعقوب بن ابراہیم الزہری	سنہ ۲۰۸ھ	حضرت عبد الرحمن بن عوف کی اولاد میں تھے زہری اور ابن سعد کے شاگرد تھے امام زہری میں ان کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا نقاد جال اُن سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبد الرزاق بن ہمام بن رافع الحمیری	سنہ ۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں اُن کا شمار ہے مگر شیعیت کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبد الرزاق مرتد بھی ہو جاتے تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے، آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، [illegible] [illegible]
عبد الملک بن ہشام الحمیری	سنہ ۲۱۳ھ	اُن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے
علی بن محمد المدائنی	سنہ ۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور عوانہ بن حکم وغیرہ کے شاگرد تھے تاریخ انساب غز

		مین نہایت وسیع المعلومات تھے. محدثین مین ان کا شمار نہین، لیکن مورخین کے امام ہین، اغانی کے دفتر بے پایان کا مخزن یہی ہین، تاریخ و انساب مین اُن کی کثرت سے تصنیفات ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مین اُن کی کتاب نہایت مبسوط ہے، اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد، اور متنوع عنوان قائم کئے ہین،
عمر بن شبۃ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری، و نحو کے امام ہین، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہین، علم سیر مین نہایت بلند پایہ تھے، حدیث مین ابن ماجہ، اور تاریخ مین بلاذری، اور ابو نعیم اُن کے شاگرد تھے،
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہین جن کی کتاب صحاح ستہ مین تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبوی مین اُن کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گذشتہ تصنیفات سے الگ ہی، اس رسالہ کا نام کتاب شمائل ہے جس مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات و عادات و اخلاق کا ذکر ہے اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہون اس رسالہ پر متعدد علماء نے شروح و حواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار مین شمار ہے، مسند جیسی ضخیم اُن کی تالیف ہے، جس کے

		آخر مین کتاب المغازی شامل ہے،
ابوبکر احمد بن ابی خیثمۃ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث مین ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد، اور تاریخ و سیر کے جلیل القدر امام تھے، تاریخ کبیر اُن کی تصنیف ہے جس میں سیرت نبوی کا حصہ بھی شامل ہے،
محمد بن عائذ دمشقی		اُن کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہین ،

یہ قدماء کی تصنیفات تھین، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل مین درج کرتے ہین، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابون سے ماخوذ ہین، اس نقشہ مین ان کتابون کا ذکر بھی ہے، جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہین، اُن کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات ہین، اور اُن مین جس قدر ذخیرہ معلومات ہے خود اصل کتابون مین نہین،

روض الانف، سیرت ابن اسحٰق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمٰن سہیلی ہے جنھون نے ۵۸۱ھ مین وفات پائی، یہ اکابر محدثین مین سے ہین، اور تمام مصنفین مابعد سیرت نبوی کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق اُن کے خوشہ چین ہین، مصنف نے دیباچہ مین لکھا ہے کہ مین نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابون کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ دار السلطنت قسطنطنیہ مین ہے،

سیرت دمیاطی حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابون مین اس کے حوالے آتے ہین، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سید البشر ہے تقریباً سو صفحون

میں ہے، پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے،

سیرتِ خلاطی علاء الدین علی بن محمد خلاطی کی تصنیف ہے، [illegible]ھ میں وفات پائی،

سیرتِ گازرونی شیخ سدید الدین علی بن محمد گازرونی المتوفی [illegible]ھ کی تصنیف ہے،

سیرتِ ابن ابی طے مصنف کا نام یحیی بن حمیدہ المتوفی ۶۳۰ھ ہے یہ کتاب تین جلدوں میں ہے،

سیرتِ مغلطائی مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام کشف اللثام ہے،

شرف المصطفیٰ حافظ ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں بعض نہایت ضعیف، بلکہ موضوع روایتیں بھی ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے،

شرف المصطفیٰ لحافظ ابن الجوزی،

الاکتفا فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلثۃ حافظ ابو ربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی [illegible]ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں

سیرت ابن عبد البر [illegible] مشہور محدث [illegible] ہیں اس کتاب کے حوالے کثرت سے آتے ہیں

[illegible] کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ [illegible] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیر کے عنوان میں ہے،

عیون الاثر ابن سید الناس کی تصنیف ہے، ابن سید الناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین، مفصل ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے، اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے، سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیش نظر ہے،

نور النبراس فی سیرۃ ابن سید الناس، عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم بن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بیش بہا معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے، ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے،

سیرت منظوم، حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب و یابس سب کچھ ہے،

مواہب لدنیہ، مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں، جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم زمانہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہر قسم کی موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں،

زرقانی علی المواہب، یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ زرقانی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے، اور مصر میں چھپ گئی ہے،

سیرت حلبی مشہور اور متداول ہے،

صحت ماخذ

سیرت نبوی کے واقعات جو قلمبند کئے گئے، وہ تقریباً ہجرت کے سو برس کے

بعد قلمبند ہوئے، اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ کثر زبانی روایتین تھین،

اس قسم کا موقع جب دوسری قومون کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہین، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہین قلمبند کرلی جاتی ہین جن کے راویون کا نام ونشان تک معلوم نہین ہوتا، ان افواہون مین سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہین، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہین، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہین، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہین،

اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول فن روایت

لیکن مسلمانون نے اس فن **سیرت** کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویون کا نام بترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت مین آئے، کون لوگ تھے، کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ، ؟ سطحی الذہن تھے؟ یا دقیقہ بین؟ عالم تھے، یا جاہل؟ اُن جزئی باتون کا پتہ لگانا سخت مشکل، بلکہ ناممکن تھا، سیکڑون ہزارون محدثین نے اپنی عمرین اسی کام مین صرف کردین ایک ایک شہر مین گئے، راویون سے ملے، اُن کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ اُن کے زمانہ مین موجود نہ تھے، اُن کے دیکھنے والون سے حالات دریافت کئے، ان

اسماء الرجال کی ایجاد

تحقیقات کے ذریعہ سے **اسماء الرجال** (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا جس کی

بدولت آج کم از کم لاکھ شخصون کے حالات معلوم ہو سکتے ہین، اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر[1] کے حُسن ظن کا اعتبار کیا جائے، تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے،

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے مین کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہون سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤن تک کی، خلاقی سُراغ رسانیان کین، اور ایک ایک کی پردہ دری کی،

اس سلسلہ مین سینکڑون تصنیفات تیار ہوئین جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے،

سب سے پہلے اس فن یعنی راویون کی جرح وتعدیل مین یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھون نے اُن کا نظیر نہین دیکھا" ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا، اور کثرت سے کتابین لکھی گئین، جن مین سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہین،

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایۃ لوگون کے حال مین ہی،
رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی سنہ ٢٦١ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے،
رجال امام عبد الرحمن بن حاتم الرازی المتوفی سنہ ٣٢٧ھ	بہت ضخیم کتاب ہی،

[1] ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی دان فاضل ہین، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مین کام کیا، اصابہ کا نسخہ انہی کی تصحیح سے کلکتہ مین چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ مین صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ نہ کوئی قوم دنیا مین ایسی گذری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانون کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی

کیفیت	نام مصنف
مشہور تصنیف ہے یہ کتاب خاص ضعیف الرواۃ اشخاص کے حال میں ہے،	رجال، امام دارقطنی،
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین و مؤرخین نے اس کو ماخذ قرار دیا ہے،	کامل ابن عدی

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں،

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع و مستند کتاب **تہذیب الکمال** ہے جو علامہ مزی (یوسف بن مزکی) کی تصنیف ہے جنہوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی علاء الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا، علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا خلاصہ کیا اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے، اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب تہذیب التہذیب لکھی جو بارہ جلدوں میں حیدرآباد دکن میں چھپ گئی ہے، [illegible] نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب **میزان الاعتدال** ہے جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا جس کا نام لسان المیزان ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹) [illegible] پانچ لاکھ حضرت عثمان کا [illegible] موسیٰ و

اسماء الرجال کی کتابین جو ہمارے پیش نظر ہین،

اسماء الرجال کی کتابون مین سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب التہذیب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبہ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گذری ہین،

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی،

یَا أَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا (حجرات-۱)	مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو

حدیث ذیل بھی اسی کی مؤید ہے،

کفٰی بالمرء کذبًا ان یحدث بکل ما سمع	آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کر دے،

دوسرا اصول درایت

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہین؟

درایت کی ابتداء، یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ مین آ گئے چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم مین ہے کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین مین شریک تھے، اور اسی بنا پر حد قذف جاری کی گئی قرآن مجید مین بھی اس کی تصریح ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ جَاءُوْ بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ (نور-۲)	جن لوگون نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ سے ہین،

تفسیر جلالین میں منکم کی تفسیر حسب ذیل کی ہی،

جماعۃ من المؤمنین، یعنی تہمت لگانیوالے مسلمانوں کا ایک گروہ!

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برات اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئین، اُن میں سے ایک یہ ہی :-

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ — اور جب تم نے سُنا توکیون نہین کہدیا کہ

لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا — ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہین سبحان اللہ

بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (نور-۲) — یہ بڑا بہتان ہی،

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویون کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایۃ ہین یا نہین؟ پھر اُنکی شہادت لی جاتی، لیکن خدانے اس آیت مین فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیون نہین کہہ دیا کہ یہ بہتان ہی،

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہئے کہ غلط ہی،

اسی طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتدا خود صحابہؓ کے عہد مین ہو چکی تھی،

فقہا مین بعض اس بات کے قائل ہین کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا اگر یہ صحیح ہو تو اُس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت

ـــــــ
صحیح الترمذی باب الوضوء

ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ اُن کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لیے، انھون نے تسلیم نہین کی، اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے مین غلطی ہوگئی ہوگی،

جب حدیثون کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کیے، جن مین سے بعض یہ ہین،

قال ابن الجوزیؒ وکل حدیث رأیته	ابن جوزی نے کہا ہی کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا
یخالف العقول او یناقض الاصول	اصولِ مسلمہ کے خلاف ہو تو جان لو کہ وہ موضوع ہی اسکی
فاعلم انه موضوعٌ فلا یتکلف اعتباره	نسبت اس بحث کی ضرورت نہین کہ اس کے راوی معتبر
ای لا تعتبر رواته ولا تنظر فی	ہین یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبارؔ
جرحهم او یکون مما یدفعه الحسّ	نہین جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو اور
والمشاهدة او مباینا لنص الکتاب	تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو، یا وہ حدیث جس مین ذرا سی
والسنة المتواترة او الاجماع القطعی	بات پر عذاب کی دھمکی ہو، یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب
حیث لا یقبل شیءٌ من ذلک التاویل	کا وعدہ ہو (اس قسم کی حدیثیں واعظون اور بیہودہ گویون
او یتضمن الافراط بالوعید الشدید	کے ہان بہت پائی جاتی ہین) یا وہ حدیث جس مین
علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم	لغویت پائی جائے مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح
علی الفعل الیسیر وهذا الاخیر کثیر موجودٌ	کئے نہ کھاؤ، اس لیے بعض محدثین نے لغویت کو
فی حدیث القصاص والطرقیة ومن	راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہی، یہ تمام تر خود

لہ فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۲، افسوس یہ ہو کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہو اس سے بعض عبارتین ہم نے اپنے نسخہ کے

وکذا المعنی لانها کلها القرینة حتی بحوها
ولذا جعل بعضهم ذلک دلیلا علی کذب
راویه وکل هذا من القرائن فی المروی
وقد تکون فی الراوی کقصة غیاث مع
المهدی ..... او انفراده عمن لم
یدرکه بما لم یوجد عند غیرهما او
انفراده بشئ مع کونه مما یلزم المکلفین
علمه وقطع العذر فیه کما قرره الخطیب
فی اول الکفایة او بامر جسیم تتوفر
الدواعی علی نقله بحضرة الجمع
عن البیت،

روایت سے متعلق ہیں، اور کبھی یہ قرائن راوی سے
متعلق ہوتے ہیں، مثلاً غیاث کا خلیفہ مہدی کے
ساتھ ... یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے
جو اس کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت
کرتا ہے اس سے ملاقات نہ ہو یا وہ حدیث جس کو ایک
ایک ہی راوی بیان کرتا ہو حالانکہ بات ایسی ہو کہ
اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب
بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی
تصریح کی ہے یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان
واقعہ کا ذکر ہو کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سیکڑوں
آدمی اس کو بیان کرتے جیسے یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے

[illegible]

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی، اور
اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے مخالف ہو،

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو،

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو،

بقیہ حاشیہ ص ۳۲، موافق غلط نقل کی ہیں یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے

۴۔ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماعِ قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجایش نہ ہو،

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو،

۶۔ معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو،

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ،

۸۔ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی دوسرے نے نہیں کی، اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو،

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، باایں ہمہ راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو،

۱۰۔ جس روایت میں ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سیکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو،

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ میں حدیث کے موضوع ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

۱۔ جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ "جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں" الخ،

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بیگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے"

---

[1] نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی صفحہ ۹۲ تا خاتمہ کتاب،

۳۔ وہ حدیث جو صریح حدیثون کے مخالف ہو،

۴۔ جو حدیث واقع کے خلاف ہو، مثلاً یہ کہ "دھوپ مین رکھے ہوئے پانی سے غسل نہین کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے"

۵۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہ السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزین نظر کو ترقی دیتی ہین، سبزہ زار، آب روان، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا،

۶۔ وہ حدیثیں جن مین آیندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے مثلاً یہ کہ فلان سنہ اور فلان تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا،

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبون کے کلام سے مشابہ ہین، مثلاً یہ کہ ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے، یا یہ کہ "مسلمان شیرین ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے"

۸۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہین، مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا،

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے مین اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں،

۱۰۔ وہ حدیثین جو نفرین و مذمت کے متعلق ہین،

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہون،

۱۲۔ وہ حدیثین جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتون کے فضائل مین وارد ہین حالانکہ

یہ حدیثین تفسیر سیف دی اور کشاف وغیرہ مین منقول ہین،

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا، اور ان کی بنا پر بہت سی روایتین رد کردین مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خیبر کے یہودیون کو جزیہ سے معاف کردیا تھا، اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی" ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہین کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے،

۱- اس معاہدہ پر سعد بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے، حالانکہ وہ غزوۂ خندق مین وفات پا چکے تھے،

۲- دستاویز مین کاتب کا نام معاویہ ہے، حالانکہ وہ فتح مکہ مین اسلام لائے،

۳- اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہین آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید مین جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے،

۴- دستاویز مین تحریر ہے کہ "یہودیون سے بیگار نہین لی جائے گی"، حالانکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ مین بیگار کا رواج ہی نہ تھا،

۵- خیبر والون نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیون معاف کیا جاتا؟

۶- عرب کے دور دراز حصون مین جب جزیہ معاف نہین ہوا، حالانکہ اُن لوگون نے چندان مخالفت اور دشمنی نہین کی تھی، تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے،

۷- اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہین، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیئے گئے،

تبصرہ

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ سیرت پر اگرچہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں تک پہنچتا ہے، سیرت ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد، طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ ان سے متاخر ہیں (ان میں جو واقعات مذکور ہیں زیادہ تر انہی کتابوں سے لئے گئے ہیں اور کتب حدیث کا جو ذخیرہ ہے اس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہئے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محققین کہتے ہیں کہ وہ خود اپنی طرف سے روایتیں گھڑ لیتا تھا، حقیقت میں واقدی کی تصنیفات خود اس بات کی شہادت ہیں، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی [illegible] تفصیلیں وہ بیان [illegible] [illegible] کوئی [illegible] ہے، واقعات [illegible] [illegible] اس طرح [illegible]

واقدی کے سوا باقی تینوں مصنف اعتبار کے قابل [illegible] ان کی نسبت اگرچہ امام مالک [illegible] محمد بن اسحٰق [illegible] [illegible] [illegible] سالہ [illegible] [illegible] نقل کرتے ہیں [illegible] ابن سعد

طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصل کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا، ابو حاتم کہتے ہیں "وہ استناد کے قابل نہیں" نسائی کہتے ہیں "وہ ضعیف ہے"

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ،

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں،

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ، کتب حدیث کا ہم پایہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت و استناد کے قابل ہے،

کتب حدیث و سیرۃ میں فرق مراتب

سیرت کی کتابوں کی کم پایگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے

شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں۔ حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرت منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا	طالب کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں سبھی طرح
تجمع ما صح وما قد انکرا	کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہوگئیں، اور بڑے بڑے علما نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل۱؎ میں لکھتے ہیں:-

قد رواہ من صنف فی عمل	اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے
یوم ولیلۃ کابن السنی وابی نعیم	جنھوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں
وفی مثل ھذہ الکتب احادیث	تصنیف کی ہیں، مثلاً ابن السنی اور ابونعیم اور
کثیرۃ موضوعۃ لا یجوز الاعتماد	اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے موضوع حدیثیں
علیھا فی الشریعۃ باتفاق العلماء	موجود ہیں جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے، اور یہ

[illegible]

حاکم نے مستدرک میں ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی، تو انھوں نے کہا "اے خدا میں تجھ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کردے" تو اس نے کہا "تم نے محمد کو کیونکر جانا" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر

۱؎ مطبوعہ مطبع منار مصر صفحہ ۱۹۹

اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہِ اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ ضرور تجھکو محبوب ترین خلق ہوگا۔" خدا نے کہا "آدم، تم نے سچ کہا، اور محمد نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا۔" حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، علامہ ابن تیمیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:-

واما تصحیح الحاکم لمثل هذا	حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث
الحدیث وامثاله فهذا مما	نے اس پر انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی
انکره علیه ائمة العلم	جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں۔
بالحدیث وقالوا ان الحاکم	اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی
یصحح احادیث وهی موضوعة	حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے، حالانکہ
مکذوبة عند اهل المعرفة	وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔
بالحدیث وکذلک احادیث	

[illegible]

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابو الشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں، (ص ۱۰۵، ۱۰۶)

وفیها احادیث کثیرة قویة صحیحة	اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں
وحسنة واحادیث کثیرة ضعیفة	اور حسن ہیں، اور بہت سی ضعیف اور موضوع
موضوعة واهیة وکذلک ما	بے اصل ہیں، اور اسی طرح وہ حدیثیں جو

ملہ کتاب التوسل مطبوعہ المنار صفحہ ۱۰۱ ۔ تذکرۃ الحفاظ و ترجمہ حاکم۔

يرويه خيثمة بن سليمان في	خیثمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت
فضائل الصحابة وما يرويه	کرتے ہیں، اور وہ حدیثیں جو ابونعیم صفہانی
ابو نعيم الاصبهاني في فضائل الخلفاء	نے ایک مستقل کتاب میں اور حلیۃ الاولیاء کی
في كتاب مفرد وفي اول حلية الاولياء	ابتدا میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں
.....وما يرويه ابوبكر الخطيب و	.....اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب
ابوالفضل بن ناصر وابوموسى المديني	اور ابوالفضل اور ابوموسیٰ مدینی اور ابن عساکر
وابوالقاسم بن عساكر والحافظ عبد الغني	اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے
وامثالهم ممن له معرفة بالحديث	لوگ روایت کرتے ہیں،

غور کرو، ابونعیم خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید و تحقیق کی ضرورت نہیں،

موضوعات ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ "قیامت میں خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا" امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشیں نہیں" اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے، اور امام موصوف کے

گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں،[1]

اس موقع پر ایک خاص نکتہ عاظہ کے قابل ہے، یہ مسلم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی، اس لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزار، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں بخاری و مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کتاب میں اس کا پتہ نہیں،

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابونعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں، اس لیے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں، اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں،

محدثین نے جو اصول قرار دیے تھے، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظرانداز کر دیے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں

[1] مواہب لدنیہ ... ص ۱۳ ...

مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں، صحابہ جن سے یہ روایتیں بیان ہیں جن کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان میں
سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابو نعیم نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے
تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید
بادل آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لے گیا، اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور
تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں"۔[1]

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے، لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن
ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں منقطع ہیں،

۲- نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ
نے سیرت پر جو کچھ لکھا اس میں اکثر جگہ مستند حدیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا، تصنیف سیر میں کتب حدیث کی طرف بے اعتنائی

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید
معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے لیکن سیرت اور تاریخ میں ان
معلومات کا ذکر نہیں، مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف
لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ

[1] مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے، اس میں بہت سی مبالغہ آمیز باتیں ہیں ہم نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے،

ہے۔ تمام ارباب سیر اور مؤرخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن اُبی کو یہ خط لکھا کہ "تم نے محمد کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے، ان کو نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمد دونوں کا استیصال کردیں گے"۔[1] سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں،

مصنفینِ سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا، اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہوگئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل گئی تھی، اس لیے اس کی اصلاح نہ ہو سکی،

حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کرکے لکھتے ہیں:-

ودلّ هذا على ان [illegible] كان يعتقد الرجوع	یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات
عن كثير مما وافق فيه اهل السير	جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت
وخالف الاحاديث الصحيحة	اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی
وان ذلك كان منه قبل ان تضلع	رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ
منها وبخروج نسخ كتابه وانتشارها	تصنیف کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لیے
لم يتمكن من تغييره[2]	اس کی اصلاح نہ کرسکے۔

مصنفینِ سیرت کی تدلیس

۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں، ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں

[1] غزوۂ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کو بلفظہٖ نقل کریں گے۔ [2] زرقانی جز ۱ صفحہ ۱۱

نقل کیں، ان ہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا، اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں، اس لیے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے، اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہوگئیں، اس تدلیس کا نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد کی اصل کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں،

اصول روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہؓ کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصولِ روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہؓ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں، اور جن کا ذکر اوپر گذر چکا، اسی بنا پر کیں،

اختلافِ مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآراء مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ

یہ ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا لیکن صحابیت میں اگر یہ اصول پیش نظر رہے ہوجاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہوجاتا ہے۔

علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں۔ انھوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (صفحہ ۱۰) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من رآه صلى الله عليه وسلم يوما ما أو زاره لماما أو اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب إنما نعني به الذين لازموه وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذي أنزل معه أولئك هم المفلحون	(اصابہ جلد ۱ صفحہ ۱۰)	یہ جو ہم کہتے ہیں سب عادل تھے، ہم اس کو ایسے شخص کو نہیں سمجھتے جس نے آنحضرت ﷺ کو ایک دن یا کبھی اتفاقیہ دیکھ لیا ہو یا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کسی غرض کے لئے آیا اور پھر چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بالتزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہؓ سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے

بجا نہیں، لیکن اس میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علت و معلول نہیں قائم کیا گیا

۵۔ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے، اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے، اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمحِ نظر کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے ذہن کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خاص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعہ کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر، اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے تمام جذبات اور مصلحتوں کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس احتیاط میں ان سے یہ غلطی ہوئی کہ اس بات سے بچنے کے لیے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ واقعہ کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتے، اور ہر واقعہ کو خشک اور بے جان چھوڑ دیتے ہیں، مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوج بھیجی، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد

کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر تھا، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا۔

۶- یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے، ایک معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے، اور پیش آسکتا ہے، تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائیگی، لیکن فرض کرو، وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی ہے، تجربۂ عام کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاج ثبوت ہے اس لیے اب راوی کا معمولی درجۂ وثوق کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیے۔

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لیے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے، یا مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابل اعتبار ہوگی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمود بن ربیعؓ ایک صحابی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات فرمانے کے وقت وہ ۵ برس کے بچے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ظرافت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انھوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا اور سب نے یہ

روایت قبول ہوں اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہو سکتی ہے

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کم سن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے:

ولکن قد منع قوم القبول هنا ای	لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت منع کرتی
فی مسألة الصبی خاصة فلم یقبلوا	ہے خصوصاً بچوں کی روایت کے سلسلہ میں، بلوغ
من تحمل قبل البلوغ لان الصبی	سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ
مظنة عدم الضبط وهو وجه	قبول نہیں کرتی، شوافع کی بھی ایک یہی رائے ہے
للشافعیة ... وکذا کان ابن المبارک	عبد اللہ بن مبارک بھی بچہ کی روایت حدیث
یتوقف فی تحدیث الصبی (کذا بنظر)[1]	کرنے میں توقف کرتے ہیں

لیکن اثبات ونفی دونوں میں بحث طلب ہیں، بے شبہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ خود بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے، یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گود میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو یہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

محدثین نے اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے:

فتقبل اخبار الصبی الممیز فیما	باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق
طریقه المشاهدة بخلاف ما طریقه النقل	مقبول ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن جو

[1] یہ پوری بحث فتح المغیث صفحہ ۱۰۴ تا صفحہ ۱۰۸ میں ہے۔

النقل كالافتاء ورواية الاخبار	باتیں نقلیات میں داخل ہیں جیسے فتوی، روایت
ونحوه (نسخه مطبوعه لكهنؤ ص ١٣٢)	کی روایت، ان میں ان کی روایت مسموع ہے [illegible]

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے، اما

ثم الضبط نوعان ظاهر وباطن	پھر ضبط[1] کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی
فالظاهر ضبط معناه من حيث	کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے
اللغة والباطن ضبط معناه من	باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس پر متعلق ہے اس کا
حيث تعلق الحكم الشرعي به وهو	لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں لیکن مطلق
الفقه ومطلق الضبط الذي هو	جو ضبط راوی کے لیے شرط ہے اکثروں کے
شرط في الراوي هو الضبط ظاهرا	نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے کیونکہ ان کے
عند الاكثر لانه يجوز نقل الخبر	کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے اسی بنا پر
بالمعنى فيلحقه تهمة تبديل	ایسے وقت قلت حفظ یا قلت فہم کے سبب
المعنى بروايته قبل الحفظ او قبل	روایت کے بدلنے میں راوی پر مفہوم کے بدل
العلم حين سمع ولهذا المعنى قلت	دینے کا شبہہ ہو سکتا ہے اور [illegible]
الرواية عن اكثر الصحابة تعذر	بہت کم حدیثیں روایت کیں [illegible]
هذا المعنى قال وهذا الشرط	روایت میں [illegible]
وان كان على ما بينا فان اصحاب	حق [illegible]

[1] ضبط کا لفظ محدثین کی اصطلاح میں جس کے معنی ہیں کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح [illegible]

الحديث قل ما يعتبرونه في
حق الطفل دون المغفل فانه
متى صح عندهم سماع الطفل
او حضوره اجازوا روايته (ص ۳۱)

نہیں کرتے بلکہ بچہ سے نزدیک جب
سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے
قابل ہوگیا تو اس کی روایت کو جائز
سمجھتے ہیں،

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہ فقیہ نہ تھے ان کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کرکے لکھتے ہیں:

ووجه قول الامام فخر الاسلام
ان النقل بالمعنى شائع وقلما
يوجد النقل باللفظ فان حادثة
واحدة قد رويت بعبارات
مختلفة ثم ان تلك العبارات
ليست مترادفة بل قد روى
ذلك المعنى بعبارات مجازية
فاذا كان الراوي غير فقيه احتمل
الخطاء في فهم المعنى المراد الشرعي
وحمل ما ليس بمقصوده فنسبه كذبا منه
الى الصحابي معاذ الله عن ذالك

(فواتح الرحموت مع المستصفی ج ۲ ص ۱۴۴)

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت
بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم
ہوتا ہے کہ روایت بلفظہ کی جائے کیونکہ ایک
ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے
اور یہ الفاظ باہم مترادف بھی نہیں بلکہ اکثر
مجازی عبارتوں میں مطلب ادا کیے گئے
ہیں، اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو
احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی
کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ
یہ مقصود نہیں کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی
نسبت کی جائے

محدثین اس اصول سے کہ واقعہ جس درجہ کا ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہئے باخبر تھے، امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں:

اذا روینا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سھلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال

جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کی حدیثیں روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب و عقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سند اور راوی میں تسامح کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هکذا وقبض اصابع یدیه الاربع

ابن اسحاق سے مغازی وغیرہ کی حدیثیں لی جا سکتی ہیں لیکن جب حلال و حرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہہ کر امام صاحب نے ہاتھ کی انگلیاں بند کر کے دکھائیں،

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راویوں کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے، اسی بنا پر مغازی کا جو حصہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک حلال و حرام میں ابن اسحاق کی شہادت معتبر نہیں لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے یہ ضروری ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہئے اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی حیثیت بدل جاتی ہے لیکن واقعہ کی اہمیت کا

فقیہ کے ساتھ مخصوص نہیں،

نوعیت واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بنا پر ان کا مذہب ہے کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں، منار میں ہے:

والراوي ان عرف بالفقه والتقدم في الاجتهاد كالخلفاء الراشدين والعبادلة كان حديثه حجة يترك به القياس خلافا لمالك وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كانس وابي هريرة ان وافق حديثه القياس عمل به وان خالفه لم يترك الا بالضرورة (نور الانوار)

راوی اگر فقہ و اجتہاد میں مشہور ہے جیسے خلفائے راشدین یا عبادلہ تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابل میں قیاس چھوڑ دیا جائیگا (بخلاف امام مالک) اور اگر راوی ثقہ و عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انس اور حضرت ابوہریرہ ہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک حضرت ابوہریرہ فقیہ اور مجتہد تھے لیکن یہ جزوی بحث ہے، اصول مسلّم ہے۔

۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقراء سے اکثر جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ درحقیقت راوی کا ذاتی ...

واقعہ میں راوی کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب ازواجِ مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی، تو مسجد نبویؐ میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی،

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ باختلافِ الفاظ مذکور ہے، کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں.

وان الاخبار التی تشاع ولو کثر	جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی
ناقلوها ان لم یکن مرجعها الی	کثرت سے ہوں، لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد
امر حسی من مشاهدة او سماع	محسوس یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا
لا تستلزم الصدق فان جزم	سچ ہونا ضرور نہیں، چنانچہ انصاری نے
الانصاری فی روایته بوقوع	اور ان صحابہؓ نے جنکو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس
التطلیق وکذا جزم الناس الذی	دیکھا تھا طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا
رآهم عمر عند المنبر بذلک	ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت (صلعم) کو علیحدہ دیکھ کر یقین

---

۱ صحیح مسلم فی الایلاء

محمول علی انہ شاع بینھم ذٰلک من تحص بناہ علی التوھم الذی توھمہ من اعتزال النبی صلی اللہ علیہ وسلم نساءہ فظن لکونہ لم تجر عادتہ بذٰلک انہ طلقھن فاشاع انہ طلقھن فشاع ذٰلک فتحدث الناس بہ واخلق بھذا الذی ابتداء باشاعۃ ذٰلک ان یکون من المنافقین۔

آپ نے ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کر لی اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت نہ تھی اس لیے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی، اس نے یہ خبر پھیلا دی اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے، اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔ . . .

. . . .

(فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۹ ص ۲۵۰)

غور کرو مسجد نبوی میں تمام صحابہؓ جمع ہیں اور سب بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی جو عموماً ثقہ اور عادل ہیں، اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجر نے بڑی جرأت کرکے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اول منافقین میں سے ہوگا۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعہ افک ہے۔ اُن کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیے، جو حافظ ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا یعنی یہ کہ منافقین نے انکی طرف منسوب کردیے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فن تاریخ پر خارجی اسباب کا اثر

۸- فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ اُن کا قلم تلوار سے نہیں دبا

حدیثوں کی تدوین بنو امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سرِ منبر علیؓ پر لعن کہلوایا، سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں، لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اُسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے، اور بنو امیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اُسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہیے تھا

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے" وہیں سرِ دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا؟ مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی،

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی،

اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ شاہ نامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں، اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں، اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں،

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لیے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لیے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے لیکن پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال، تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے، بلکہ عین اس وقت جبکہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے نکتہ بین نگاہ فوراً بھانپ لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتہ پیموا ہے،

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے،

تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بنو نضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) ارباب سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے" لیکن مورخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یونہی گذر جاتے ہیں۔

قیاس و درایت

۹- نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل، یا مسلمات یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گذر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے۔ حامیان روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دیدی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا انکار کر دیگا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے،

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو وہ باوجود خلاف عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں، ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا،

(۱) تلک الغرانیق العلی کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ) کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیے جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی:

لو وقع لارتد کثیر ممن اسلم	گر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام
ولم ینقل ذالک	سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں،

حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وجميع ذلك لا ينمشي على القواعد	یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں
فان الطرق اذا كثرت وتباينت	سکتے، ایسے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے
مخارجها دل ذلك على ان لها	ہیں، اور ان کے ماخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس
اصلاً[1]	بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

(۳) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دفعہ جھوٹ بولے تھے، امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا کہ "اس سے حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے" اس لیے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں، علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کرکے لکھتے ہیں:

فليس يبتنى اذ الحديث صحيح ثابت	امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے، ایسے کہ
وليس فيه نسبة محض الكذب	حدیث ثابت ہے، اور اس میں محض کذب کی نسبت
الى الخليل وكيف السبيل الى تخطئة	حضرت خلیل کی طرف نہیں ہے، اور راوی کا تخطیہ
الراوي مع قوله انى سقيم و	کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیم کا
بل فعله كبيرهم هذا وعن	یہ قول موجود ہے، انی سقیم اور بل فعله
سارة اختي اذ ظاهر هذه	کبیرهم هذا اور سارة اختی کیونکہ
الثلاثة بلا ريب غير مراد[2]	تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں،

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں

[1] فتح الباری جلد ۵ صفحہ ۲۳۳ مطبوعہ مصر [2] قسطلانی جلد ۵ صفحہ ۳۸۹

صحیح یہ دوگروہ

نقل کیں،

ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے، اور یہ طریقہ خود صحابۂ کرام کے عہد میں شروع ہو گیا تھا، اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے، اس لیے ہم اسکی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں،

(۱) حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے" حضرت ابن عباسؓ نے کہا "اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی (کے استعمال) سے بھی وضو کریں" حضرت ابوہریرہؓ نے کہا بھتیجے جب تم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔[1]

(۲) صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضرت علیؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کیے گئے، حضرت ابن عباسؓ اس کی نقل لیتے جاتے تھے، اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ

واللہ ماقضیٰ بھذا علی الا	خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہو تو گمراہ ہو گئے ہوں گے
ان یکون ضل	لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے اس لیے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس لوگ ایک

[1] ابن ماجہ و ترمذی حدیث الوضوء مما مست النار،

کتاب لائے جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلمبند تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹا دی[1]"۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کر لیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

(۳) صحیح بخاری (باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ) میں ہے کہ محمود بن ربیعؓ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "جو شخص خالصاً خدا کے لیے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہے گا، خدا اس پر آگ حرام کر دے گا"۔ اس جلسہ میں حضرت ابو ایوب انصاری بھی موجود تھے، جن کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، مہینہ تک قیام فرمایا تھا، حضرت ابو ایوبؓ نے یہ حدیث سن کر کہا:

واللہ ما اظن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما قلت قط	خدا کی قسم میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو گا"

محمود بن الربیعؓ صحابی تھے، اور حضرت ابو ایوبؓ کو ان کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا، تاہم چونکہ یہ حدیث اُن کے نزدیک قرآن کے خلاف تھی، حضرت ابو ایوبؓ اس پر یقین نہ لا سکے اور کہا کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا نہ فرمایا ہو گا"۔ اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آ کر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان) سے کر لی لیکن اس سے اصل مسئلہ پر

[1] نووی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب طومار کی شکل میں لکھی تھی، (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو ساتھ میں جوڑ کر جمع کرتے تھے، اور لپیٹ کر رکھتے تھے)

اثر نہیں پڑتا، حضرت ابوایوبؓ کو جن اسباب کی بنا پر محمود بن ربیعؓ کی روایت میں شبہہ پیدا ہوا،
عتبان پر بھی وہی شبہہ پیدا ہوسکتا تھا، حضرت ابوایوبؓ خدانخواستہ محمودؓ کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے،
بلکہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہٖ راویِ اول
کی نسبت بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بعض صحابہ سے کہا تھا کہ "تم لوگ سچے
لوگوں سے روایت کرتے ہو لیکن سامعہ غلطی کرجاتا ہے"۔[1]

(۴) حضرت عمار بن یاسرؓ نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت
عمرؓ کو یقین نہیں آیا، بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے، یہ الفاظ کہے اِتَّقِ اللّٰہَ یَا عَمَّارُ یعنی
اے عمار! خدا سے ڈرو، چنانچہ اسی بنا پر جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے حضرت
ابوموسیٰؓ نے اس روایت سے استدلال کیا تو حضرت عبداللہؓ نے کہا ہاں، لیکن عمرؓ کو عمار
کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی،[2]

(۵) حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے
سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے، تو انھوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت
کے خلاف ہے،

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل)   اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائیگا

(۶) اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز، [2] صحیح بخاری باب التیمم،

نے غلطی کی[1]، اس روایت کے راوی اگرچہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ تھے، جو مشہور صحابی ہیں لیکن حضرت عائشہؓ نے اس بنا پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی،

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے، اور حضرت عائشہؓ کا اجتہاد جس کی بنا پر انھوں نے روایت سے انکار کیا، صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہؓ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے،

(۷) ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دیدی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں، فاطمہؓ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں، جن کو ان کے شوہر نے طلاق دیدی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گئیں، تو آپ نے ان کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انھوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔ امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہؓ کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو، پھر حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا[2]۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں [2] صحیح مسلم کتاب الطلاق،

(۳) بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا، حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ویشکل علی ھذا ما یوجد الآن	اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم
من آثار الامم السالفة کدیار	قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً
ثمود، فان مساکنھم تدل	قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے
علی ان قاماتھم لم تکن مفرطة	کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ
الطول علی حسب ما یقتضیه الترتیب	ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے..... اور
السابق..... ولم یظھر الآن	اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا حل
ما یزیل ھذا الاشکال[1]	نہیں معلوم ہوا،

(۴) صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد استشکل الاسماعیلی ھذا	اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد
الحدیث من اصله وطعن فی صحته[2]	کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے،

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے، لیکن اسماعیلی کا درجہ فن حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے، اس لیے گو اسمٰعیلی کا اعتراض غلط ہو لیکن قابل لحاظ ہو سکتا ہے،

[1] فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۶ صفحہ ۲۶۰۔ تکملہ [2] فتح الباری مطبوعہ مصر صفحہ ۳۰۲ جلد ۸،

کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے،

(۵) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر اور بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، حافظ ابن عبد البر نے جو مشہور محدث ہیں اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لیے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جا سکتی ہے، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

وقد استنکر ابن عبد البر قصة عمرو بن میمون هذه و قال فیها اضافة الزنا الی غیر مکلف واقامة الحد علی البهائم[1]

ابن عبد البر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ کا انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے، اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے،

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، اگر یہ صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے"

(۶) صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک[2] دفعہ عبد اللہ بن اُبی کے طرفداروں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری،

وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا (حجرات-۱)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو،

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبد اللہ بن اُبی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی

---

[1] فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۷ صفحہ ۲۲ [2] صحیح بخاری کتاب الصلح، روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے، ہم نے مختصر خلاصہ کر دیا ہے۔

اسلام نہیں دیا تھا، اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں، اور یہاں عبد اللہ بن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا،

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا،

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرآن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں،

روایت بالمعنی

(۱) ایک بڑا امر خاص روایت بالمعنی کا ہے، یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یا صحابۂ نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے؟ محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں، اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ حقیقت میں فرق پیدا نہیں ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے، اسی بنا پر بعض محدثین، مثلاً عبد الملک بن عمر، ابو زرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے[1]، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے، اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے،

---

[1] صحیح ترمذی کتاب علل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے،

ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت	اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں
فلا تصدقونی، انما ھو المعنی	بعینہ وہی ادا کرتا ہوں تو تم میری بات
	نہ مانو، میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں،

ترمذی نے اسی مضمون کے، اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کیے ہیں،

جو صحابہ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت اُن کی حالت متغیر ہو جاتی تھی، سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا، میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا" ایک دن ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا، تو دفعۃً سر جھکا لیا، پھر میری نظر اُن پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں، قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہا، یا یوں، یا اس سے کچھ زیادہ، یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے، اور کہتے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا، یا یوں فرمایا تھا" امام شعبی کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر رہا لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں سعد بن مالک کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا لیکن اس تمام راہ میں انھوں نے ایک حدیث بھی بیان نہیں کی

(صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت نہیں کی۔" (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا، انھوں نے کہا میں جب سے اسلام لایا میں نے کبھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے۔[1]

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منبر پر یہ ارشاد فرمایا تھا،

ایاکم وکثرۃ الحدیث عنی[2]	خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کیا کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے، اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر انکار کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی،

[1] یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں، دیکھو صفحہ ۴ و ۵ مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

[2] ابن ماجہ صفحہ ۵،

ان المیت لیعذب ببکاء الحی | مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا | تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے

مکذبین ولکن السمع یخطئ[1] | ہیں لیکن کان غلطی کر جاتا ہے،

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہؓ بن عمر کے متعلق فرمایا،

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی | ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے

او اخطأ[2] | یا خطا کی،

(۱۱) ایک اور بحث روایتِ احاد کی ہے، روایتِ احاد وہ ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو، یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا موید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم وانکار اور یقینی وظنی ہونے کے متعلق اہلِ فن کا اختلاف ہے، معتزلہ روایات احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں لیکن درحقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعاتِ زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلاحجت واصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم سے ایک شخص آکر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے"۔ اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے، اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ معتزلہ کے مقابلہ میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کرام کا طرزِ عمل اس کے مخالف ہے، | روایت احاد

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز [2] مسلم کتاب الجنائز،

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہوکر ان کو بلوا بھیجا، اور واپسی کا سبب پوچھا انھوں نے کہا "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ" حضرت عمرؓ نے کہا "اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا حضرت عمرؓ نعوذ باللہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے، اور انھوں نے یہ حدیث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کی متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لیے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا دعویٰ کیا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں، اور نہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے۔" مغیرہ بن شعبہؓ نے شہادت دی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے انکی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی، اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی، تب حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی

اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں،

(اسی بناء پر روایتِ احاد کے متعلق فقہاے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایاتِ احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے"، تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلّم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے"، تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں، اور اس کے ثبوت کے لیے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی بیان کرتا ہے کہ "آپ ایک بار سپید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے"، تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ ایک بار آپ برہنہ تن باہر نکل آئے" (اس قسم کی ایک روایت ہی) توقطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لیے کافی نہیں سمجھیں گے،

نتائج مباحث مذکورۂ گذشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق صحابۂ کبار کا جو طرزِ عمل پیش کیا ہے، اور ہم سے نقد و حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم اُن کا اعادہ کرتے ہیں،

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیثِ صحیحہ میں، پھر عام احادیث

میں کرنی چاہیے، اگر منطے تو روایت سیرت کی طرف توجہ کی جائے،

(۲) کتبِ سیرت محتاجِ تنقیح ہیں، اور اُن کے روایات واسناد کی تنقید لازم ہے،

(۳) سیرت کی روایتیں باعتبارِ پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اسلیے بصورتِ اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی،

(۴) بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواۃِ اربابِ فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی،

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت ومعلول کی تلاش نہایت ضروری ہے،

(۶) نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے،

(۷) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے وفہم کا کس قدر جزو شامل ہے،

(۸) اسبابِ خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

(۹) جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصولِ مسلمہ اور قرائنِ حال کے خلاف ہوگی، لائقِ حجت نہ ہوگی،

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق وجمع سے اس کی تسلی کرلینی چاہیے کہ راوی سے اداے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے،

(۱۱) روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فن روایت عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علماے حدیث نے تصحیح روایت کے لیے کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی، کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام واعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ وروایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگارانِ پیغمبرِ اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد واصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟ [1]

[1] زیادت، از صفحہ ۸۸ تا ۹۰۔ "س"

یورپین تصنیفات

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف بلدی برٹ سے لیکر جو ۱۱۳۹ء میں موجود تھا، آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائلِ معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوءِ ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جابجا ان تصنیفات سے کام لینا یا ان سے تعرض کرنا پڑا ہے،

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجیب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

> عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجا لاتی تھی لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل

روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں، منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے۔"[1]

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا، اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے، ماہوم، یا ماہون یا ماخومیڈ (یعنی محامِڈ) اور اپلین اور تیسرا ٹرماگان، ان کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمد جو بت شکن اور دشمنِ اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انھوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا

[1] محمد اینڈ محمڈنزم۔ از باسورتھ اسمتھ ایم اے صفحہ ۶۳ (Bosworth Smith's Mohamed & Mohammedanism, 63)

ایک شاعر کہتا ہے "اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اس پر وہ چل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور گالیاں دیں، اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی، اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کرڈالے، اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڈھے میں ڈالدیا، اس کو سوٗر اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی، اور ازسرِنو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا"

ایک دوسرا شاعر پیر خدا سے دعا کرتا ہے کہ "وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے" اس کے بعد وہ امرا کو جنگ صلیبی کے لیے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے، "اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کردو، اور ان کو آگ میں ڈال دو، اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کردو"[1]

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے، (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی | سترہویں صدی کے سنین وسطیٰ یورپ کے عصر جدید کا مطلع

[1] ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بزبان عربی مطبوعہ مصر از صفحہ ۸ تا ۱۰۔

ہے، یورپ کی جد وجہد، سعی وکوشش در حریت رندی کا دور اس عہد سے شروع
ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی، وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے
جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس
علمی وسیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوئے، اور اس طرح وہ زمانہ قریب
آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا،

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر
تاریخ اسلام وسیرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو
موقع بہ موقع معلوماتِ سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا،

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی، اور اس کے مذہبی
اور سیاسی امور الگ الگ ہوگئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ
ہوگئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق وغیرہ متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں
جماعتوں نے جو کوششیں کیں، وہ نتیجہ ہمارے سامنے ہیں،

(اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے

پہلے اربی نیوس (Arp)، مارگولیوس (Margoliouth) ایڈورڈ پوکاک
(Pococke)، اور ہاٹنجر (Hattinger) ذکر کے قابل ہیں لیکن یہ عجیب بات
ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان
مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرونِ ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے، یعنی

سعید بن بطریق (وٹیکوس) المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا، اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا، اور ابو الفرج ابن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول

ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، اربی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ، لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے، یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں،

اخیر اٹھارہویں صدی | یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے اورنیٹلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے، اور نٹیل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا،

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۸۰ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی، اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دار العلوم قائم کیا، اور آخرکار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں

اور انجمنیں جاری ہوگئیں۔ عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتبخانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لیکر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں، اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا۔ سب سے پہلے ریسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی وحواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔ ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے متھوس (A. N. Matthews) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی۔ ۱۸۵۸ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی گوٹنگن (Göttingen) میں وسٹنفلڈ نے شائع کی۔ اسکے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G. Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۶۱ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر باربیر ڈی مینارڈ نے شائع کی۔ والہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان "محمد در مدینہ" برلن سے شائع کیا۔ ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہوتسما (Houtsma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی۔ ۱۸۷۹ء سے ۱۹۰۱ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود

تاریخ بارتھ (Barth) اور نولدکی (Nöldeke) وغیرہ نے شائع کی،
اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (Sachau) کی خاص
کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور
نادر الوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں،
تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے
شائع ہوتی رہی،

ان اصل تاریخی تصنیفات اور اُن کے تراجم کی اشاعت، ممالکِ اسلامیہ
اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی، اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش،
ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفینِ تاریخ اسلام اور سوانح نگارانِ پیغمبر عرب
(صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا،

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"محمد کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے
لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر چیز ہے[1]"

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں، یا اسلام کے اصولِ عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں
سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم اُن سے متمتع ہو چکے ہیں،

---

[1] مارگولیتھ، محمد، دیباچہ، صفحہ ۱،

نمبر	نام مصنف		وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی، بی، (۹)		انگلستان	سیرت محمدؐ خارج (نعوذ باللہ)	سنہ ۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وایٹ (White) مخاکمنونمو		״	بحیثیت سرمنبر اسلام اور پیغمبر اسلام پر	سنہ ۱۸۲۰ء اوائل
۳	گارڈ فری ہگنس ایم، آر، اے، ایس	Godfrey Higgins)	״	اپالوجی	سنہ ۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے، اے مولر	(Muller)	جرمن	اسلام ازم	سنہ ۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی	Garcin de Tassy)	فرانس	اسلام و قرآن	سنہ ۱۸۵۰ء از سنہ ۱۸۳۱ تا
۶	اڈورڈ لین	(Edward lane)	انگلستان	انتخابات القرآن	سنہ ۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل	(Weil)	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام و کتاب محمد پیغمبر	سنہ ۱۸۴۶ء / سنہ ۱۸۴۵ء
۸	کارلائل	(Carlyle)	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	سنہ ۱۸۴۶ء
۹	کوسن ڈی پرسیوال	(Caussin de perceval)	فرانس	تاریخ عرب	سنہ ۱۸۴۷ء
۱۰	واشنگٹن اروِنگ	(Irving)	انگلستان	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر	(Springer)	جرمن	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر	Von (Kremer)	״	ترجمہ و تحشیۂ واقدی	سنہ ۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو		انگلستان	مضمون "محمد"	سنہ ۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی	(Dozy)	ہولینڈ	تاریخ اسلام	سنہ ۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو		انگلستان	بزرگ ترین عرب	سنہ ۱۸۶۱ء
۱۶	ڈی لین	(Delane)		سیرت محمد	״

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۱۷	سیور (Muir)	انگلستان	سیرت محمد	۱۸۶۱ء
۱۸	برتھالمی سینٹ ہلیر (Hilaire)	فرانس	محمد و قرآن	۱۸۶۵ء
۱۹	نولدیکی (Noldeke)	جرمن	مضامین قرآن و اسلام	۱۸۶۹ء
۲۰	وو شیٹ مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	۱۸۶۹ء
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	〃	محمد	۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس (Julius Charles)	فرانس	تاریخ بانیٔ اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمد اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۴	بارسورتھ اسمتھ (Bosworth Smith)	〃	〃	〃
۲۵	سیدیو (Sedillot)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن (Wellhausen)	جرمنی	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	پل کرابل (Krehl)	جرمنی	سیرت محمد	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈزیہر (Goldziher)		مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان (Renan)	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۸۲ء
۳۰	ایچ گریم (Grimme)	ہولینڈ	سیرت محمد	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری (Henri de Castries)	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بول (Buhl)	ہولینڈ	سیرت محمد	۱۹۰۳ء

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۳۳	والسٹن (Wallaston)	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	سنہ ۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ (Margoliouth)	″	محمدؐ	″
۳۵	کوئل (Koelle)	″	محمدؐ اور اسلام	سنہ ۱۸۸۹ء
۳۶	پرنس کاتانی (Caetani)	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمدؐ و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ (Leonard)	انگلینڈ	اسلام کا زمانی و تمدنی پایہ	سنہ ۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ تین قسموں پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں،

۱۔ جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صاحب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں، لیکن قابل ماتم

۲۔ عربی زبان، ادب، تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً

جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن [illegible] شائع کی ہے، اس کی وسعت معلومات

اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولڈکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن "انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جابجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے،

۲- وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ تتبع کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب ہے پر سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعوی نہیں ہو سکتا لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب و افترا اور تاویل و تعصب کی مثال کے لیے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدنظر بنا دیا ہے

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی داں ہیں کئی سال مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے،
لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گذری ہے، حافظ ابن حجر
کی کتاب الاصابۃ فی احوال الصحابہ، اول اول ان ہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی،
لیکن جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانحعمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں
لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے[1]،

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے،
لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں،

۱۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں
ہیں، مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ،
اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح مرتب کرنا چاہے گا
تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفاتِ سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن
واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو،
چنانچہ اس کی بحث اوپر گذر چکی، مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن
لوگوں سے مروی ہیں، مثلاً سیف، سُدی، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں،
اس لیے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے لیکن وہ واقعات
جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، اُن کے لیے یہ سرمایہ بیکار ہے،

[1] یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا لیکن اسکے اقوال اکثر مصنفین نے نقل کئے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گذرے ہیں،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانحعمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بروایاتِ صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے، (مثلاً مارگولیس)، تو اوّلاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمنِ معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے،

۲- دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصولِ تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے، جو قرائنِ موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے، اور کہیں سے نہیں اکھڑتا، تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی،

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسماء رجال" کے دفترِ تحقیقات میں اُس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو اُن کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اسکی

روایت قبول کرلی جائے گی،

اس اختلافِ اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے مثلاً اہلِ یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، سب موجود ہوتی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصاے جزئیات ممکن نہیں؛ یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلوماتِ عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کردیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں، تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کیے ہیں، یورپین کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں ان کی نہایت سختی کیساتھ پابندی کی جائے

یورپین تصنیفات کے مضمون مشترکہ

یورپین مصنفین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں،

(۱) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ جا کر

جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعۃً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے، اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں،

(۲) کثرتِ ازدواج اور میل الی النسا،

(۳) مذہب کی اشاعت جبر اور زور سے،

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل،

(۵) دنیاداروں کی سی حکمتِ عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہیے کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار پر بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں؟

اصول تصنیف اور ترتیب ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کیے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آگیا ہے،

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، اُن کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن لوگوں نے آیاتِ قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لیے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے،

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیثِ صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، (۳) اب سے ایک بڑی غلطی پیدا ہوئی

وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں پر ڈھونڈھتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیے، اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی، روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں اس لیے اگر عام استقرا، اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی ہی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر مہیا کیے، جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے، اور تا امکان کدوکاوش کی ہے۔ اس خاص ضرورت کے لیے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لیے جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا تاکہ جس روایت کی تحقیق مقصود ہو، بہ آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگذاشتوں کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ جہاں تک ممکن تھا، ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

کی ولادت سے لیکر وفات تک عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں، اسی حصہ کے
دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و
اولاد اور ازواجِ مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں،

دوسرا حصہ منصبِ نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیمِ عقائد، اوامر و نواہی
اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصبِ نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ
میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا، و تدریجی تغیرات
کی مفصل تاریخ اور اُن کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے
اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد، اور اخلاق و عادات پہلے
کیا تھے، اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام
نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے اور ہر زمانہ کے لیے کافی ہو سکتا ہے،

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ
باب باندھتے ہیں لیکن آجکل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ
معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش
آگئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیرِ طعام وغیرہ
ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھدیا ہے،

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت

(صلی اللہ علیہ وسلم) اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائلِ اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق وعادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جوابات،

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا، وہ شائع کر دیا جائے گا،

استناد اور حوالے تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اسلیے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں،

(۱) صرف ان ہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گذری ہیں،

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں، ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے، لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کدوکاوش نہیں کی ہے،

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گذر چکی ہے، اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کونسا نسخہ تھا،

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرب

وجہ تسمیہ عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ اہلِ لغۃ کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں، اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا،

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا، قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے

وَرَجَّت، باحۃ العربات رجًّا ترقرق فی مناکبھا الدِّمَاءُ

وعربۃ ارضٌ جد فی الشر اھلھا کما جدّت فی شرب نقاخ ظمّاءُ

وعربۃُ ارضٌ مایحل حرامھا من الناسِ الا اللوذعی الحلاحل

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں، اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے، اس لیے تمام ملک کو عرب کہنے لگے،

جغرافیہ عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں،

مغرب۔ بحیرۂ قلزم

مشرق۔ خلیج فارس اور بحر عمان،

جنوب ۔ بحر ہند ۔

شمال ۔ کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں بعض مملکت حلب اور فرات تک اس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں ،

سینا کا جزیرہ نما، جس کا نام البتیہ ہے، اکثر مصنفین عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے ،

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے، طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل، اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے ،

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فیٹ بلند ہے، بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں ۔

چاندی، اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مورخین نے لکھا ہے زیادہ تر ان کا مال تجارت چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب لکھی ہے [1]،

---

[1] Gold mines of medion

قدیم تاریخ کے ماخذ اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں،

(۱) زمانۂ جاہلیۃ کی بعض تصنیفات، جو سلاطینِ حیرۃ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علامۂ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے،

(۲) زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا یہاں تک کہ آج اشعار جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا، اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں، مثلاً طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مورخین اسلام، عرب کی تاریخ قدیم پر متعدد تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطینِ عرب پر متعدد کتابیں لکھیں جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے،

(۳) اشعار جاہلیت، جن میں سے اکثر سلاطین اور اقوام اور عمارات عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، ان ہی قدیم ماخذوں سے علامۂ ہمدانی نے اپنی کتاب "اکلیل"[1] مرتب کی ہے، جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثار قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے،

(۴) یورپ کی قدیم تصنیفات، مثلاً مصنفینِ یونان نے ہیرو ڈوٹس (جو حضرت عیسیٰؑ سے چار سو برس قبل تھا) سے لیکر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں،

[1] اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعۂ بیروت) میں ہے،

اور ان کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے

(۵) عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات جو قدمائے اسلام نے دریافت کیے تھے اور جو آجکل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کیے ہیں،

عرب کے اقوام و قبائل

مورخین عرب نے اقوام و قبائل عرب کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہے:

عرب بائدہ یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے،

عرب عاربہ بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے، اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا،

عرب مستعربہ بنو اسمٰعیل یعنی حضرت اسمٰعیل کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی،

ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسمٰعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے، اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل و فروع سے تھا، جو یمن سے شام تک ہر قطعہ زمین میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر ان کے نام آئیں گے، اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے،

بنو قحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں،

(۱) قضاعہ (۲) کہلان (۳) ازد حمیر بھی اسی کی شاخ ہے، جو یمن کے فرمانروا تھے

لیکن واقعات کو ان سے کوئی تعلق نہیں،

(۱) قبائل قضاعۃ، عام علماے انساب قضاعۃ کو بنو قحطان میں داخل کرتے ہیں، اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں، ورنہ ازروے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں، بہرحال ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں،

بنو کلب، بنو تنوخ، بنو جرم، بنو جہینہ، بنو نہد، بنو عذرہ، بنو اسلم، بلی، سلیح، ضجعم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب،

(۲) کہلان،

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ،

(۳) ازد، انصار اسی کی شاخ تھے،

اوس، خزرج، خزاعۃ، غسان، دوس

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے حسب ذیل ہیں، قبائل مضر اولاً بنی خندف اور بنو قیس دو خاندانوں پر منقسم ہیں،

ا۔ خندف

ہذیل، کنانۃ، اسد، ضبہ، مزینہ، رباب، تمیم، ہون،

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں،

اصول	فروع
کنانہ	قریش، دوّل
ہون	قارہ
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور
تمیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلب

۲۔ قیس

عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن،

ان میں بعض کے فروع یہ ہیں،

اصول	فروع
غطفان	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ
اعصر	غنی، باہلہ
ہوازن	سعد، نصر، جشیم، ثقیف، سلول، بنو عامر (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ

بنو قحطان و آلِ اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں جن کے جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں)

عرب کی قدیم حکومتیں | کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گذریں،

(۱) معینی،	معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا،
(۲) سبائی،	یعنی قوم سبا،
(۳) حضرموتی	حضرموت یمن کا مشہور مقام ہے،
(۴) قتبانی	قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آجکل گمنام ہے
(۵) نابتی	حضرت اسمٰعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا، یہ سلسلہ ان ہی کی طرف منسوب ہے

معینی سلطنت جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زبان تھیں یا متقدم و متاخر، گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے، اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیحؑ سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہمعصر ہیں،

سبائی دور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے، اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں، حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے

بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایۂ تخت بنا لیا،

قریباً سنہ ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرماں روا گذرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ و سال بھی کندہ ہے، ان کے عہد حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا،[۱]

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنا شروع کی، اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آجکل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں:-

"رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت و فضل و رحمت سے، اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش ارحمیس ذبی ان کا نائب الحکومۃ ہے"

سبا اور حمیر کی عظمت، اور اقتدار اور وسعت فتوحات کی روایتیں عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں، عربوں کے خیال کے موافق سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر

۱؎ یہ تمام تفصیل انسائیکلو پیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے جو جی ڈبو تھیجر صاحب نے عرب پر لکھا ہے، نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج صفحہ ۴ سے ۱۰

تھے، ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرمانروا تھا، شاہنامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کر لیا تھا، علامہ شبلی نے تاریخ ایران میں (جواب یورپ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران حمیر کا بادشاہ تھا، اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے، علامۂ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی، اور فردوسی کے بیان کے موافق سیاوش پر عاشق ہو گئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی، اور اس کا اصلی نام سُعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:۔

"ولادت مسیحؑ سے ہزار سال قبل جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا، اور جو اپنی بارش گرما کے باعث زراعت کے لیے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے بھی ہمارے جذبات مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان و روم نے اس کو "دولتمند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بیجا نہ تھا .... توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں، چنانچہ ملکۂ سبا کا سلیمانؑ سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے (۱۔ سلاطین ۱۰۔ آیت ۱تا ۱۰) قوم ثمود جن کی عمارات سے ڈاوٹی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً ان ہی سے

حاصل کی ہے۔"

کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انھوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کردیا، یہانتک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینا تک اس کو پھیلا دیا۔"[1]

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی، اور جو قوم ثمود کی مرادف، یا اُن کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانۂ قدیم میں نابت کا نام اور اثر، صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا، بلکہ حجاز و نجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا، نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ، اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور پیچھے بنو اسمٰعیل کے خطرات جنگ کے لیے بالکل مستعد رہتے تھے، فلسطین و شام میں ان کی غارت گریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر اُن کی رہزنی نے بارہا تاجدارانِ مقدونیہ کو اُن کی دشمنی پر آمادہ کردیا، لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے نہیں روک سکی، اور روما کی اطاعت بھی انھوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی۔"[2]

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، ان کے

[1] مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸ یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، تمہیدی آرٹکل نوشتہ پروفیسر نولڈیکی صفحہ ۵۔

[2] تاریخی جغرافیۂ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اول از صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۸۔

بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل یا مقول کہتے تھے، عراق میں آلِ منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیرِ اثر تھا، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جو قیصرانِ روم کا ماتحت تھا، اور جس کا اخیر فرمانروا جبلہ بن الایہم غسانی تھا،

تہذیب و تمدن

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے، مانسیو لیبان[1] فرنساوی نے اصولِ عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوجِ کمال تک پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصولِ ارتقا کے رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعۃً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی"۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققینِ آثارِ قدیمہ جنھوں نے یمن کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی ہے، اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں،

صنعا اور قلیس کے ذکر میں، یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثارِ عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے، اور گو اس میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہے، تاہم اصلیت کا حصہ بھی کم نہیں،

اسی طرح سرحد کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آلِ نعمان کا پایۂ تخت تھا، اور حوران جو خاندانِ غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب و تمدن سے خالی نہ تھے،

مورخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقام کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا،

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار، جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت دیتے ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب میں لکھتے ہیں،

المشهور من محافد اليمن و	یمن کے مشہور قدیم قصر و ایوان جن کا
قصورها القديمة التي ذكرها	اہل عرب نے اشعار اور امثال میں ذکر کیا ہے
العرب في الشعر والمثل	[illegible]
كثيرة [illegible] فيها من الشعر باب	ان سے متعلق شعر کا ایک [illegible]
واسع [illegible] جميع ذلك كله الكتاب	اکلیل [illegible]
[illegible] الاكليل،	[illegible]

[illegible] نے لکھا ہے، میں اس موقع پر [illegible] ان کے [illegible] دیتا ہوں،

[illegible]

[illegible] ماعط [illegible] [illegible]

[illegible]

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے، اور اس کی عظمت ورفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکا ہوتا ہے سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا، شبام کے حال میں لکھا ہے:

لهم فيه حصون عجيبة هائلة | ان میں اُن کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں

قلعہ ناعط وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے، آجکل یورپ کے محققین نے ان مقامات پر جاکر جو تحقیقات کی ہے، اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے، تھیاچر صاحب اپنے آرٹکل میں لکھتے ہیں[1]:-

"جنوبی عربستان میں، جہاں حضرت عیسیٰؑ سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار ابتک موجود ہیں، اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے...... یمن اور حضرموت میں یہ آثار کثرت سے ہیں، اور اکثروں پر ابتک کتبے موجود ہیں...... صنعاء کے قریب ایک قلعہ تھا جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے، (دیگر قلعوں کے لیے دیکھو جرنل جرمن اورنٹیل سوسائٹی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰ سے آگے) مارب جو قدیم سبائی دارالسلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلازر نے دیکھا ہے۔

مارب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھکر عدن کے

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا مضمون "عرب"

دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کیے جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فیٹ ہے۔"

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لیے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے، بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکّہ کے لیے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں، درہم یونانی لفظ درخم ہے، اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا ہے، چراغ معمولی چیز ہے تاہم اس کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا، مصباح یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنائی جاتی ہے، کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے، لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ فارسی لفظ ہے، کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پائجامہ کو سراول کہتے ہیں، جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے،

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی، آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لیے

جو مقامات ان ممالک سے دور تھے، اُسی اصلی حالت پر رہ گئے،

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک آسائش و نعمت کے سامان بہت کم تھے مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، ابوداؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض[1] کا حرام ہونا نہیں سنا[2]، گرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی لیکن اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب میں بہ تصریح موجود ہے کہ عرب کنکھجورا، گوہ، گرگٹ، سہی، اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے، زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے،

۱؎ حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں ۲؎ ابوداؤد جلد دوم صفحہ (۱۷۶) باب فی اکل حشرات الارض

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی ہماری دنیا
نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا	کی زندگی ہے، ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور
إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ - ۳)	ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے،

بعض خدا کے قائل تھے لیکن قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا	کہہ دو کہ ہڈیوں کو وہی دوبارہ زندہ
أَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسین - ۵)	کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا،

بعض خدا اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے لیکن نبوت کے منکر تھے، ان کا ذکر اس

آیت میں ہے،

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ	اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ
يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي	کھانا کھاتا ہے، اور بازاروں میں چلتا پھرتا
الْأَسْوَاقِ (فرقان - ۱)	ہے،
قَالُوا أَبَعَثَ اللهُ بَشَرًا رَسُولًا	اور کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا؟

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیے جو حاجات انسانی سے منزہ ہو

لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں۔[۱]

---

[۱] یہ تمام تفصیل ملل و نحل شہرستانی مذاہب عرب کے ذکر میں ہے،

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (زمر-۱)

ہم ان بتوں کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کردیں،

قبیلۂ حمیر جو یمن میں رہتا تھا، آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلۂ بنی تمیم دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس شعریٰ کی، قبیلۂ اسد، عطارد کی، اور لخم و جذام مشتری کی پرستش کرتے تھے[1]،

مشہور بتوں اور اُن کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں[2]،

نام بت	مقام	قبیلہ جو اس بت کو پوجتا تھا
لات	طائف	ثقیف
عزّیٰ	مکۂ معظمہ	قریش وکنانہ
منات	مدینۂ منورہ	اوس، خزرج، اور غسان
ودّ	دومۃ الجندل	کلب
سواع		ہذیل
یغوث		مذحج اور بعض قبائلِ یمن
یعوق		ہمدان

سب سے بڑا بت، ہبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اسکی جے پکارتے تھے،

[1] طبقات الامم، لابن صاعد الاندلسی مطبوعۂ بیروت ۱۹۱۲ء [2] بتوں کی تفصیل "ملل ونحل" میں ہے،

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لُحَیّ تھا، اس کا اصلی نام ربیعۃ بن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلہ، خزاعۃ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑکر جرہم کو مکہ سے نکال دیا، اور خود حرم کا متولی ہوگیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو، انھوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بت ان سے لے لیے، اور لاکر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لیے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہوگیا، ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا، یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس وخزرج یعنی مدینہ کے لوگ، اسی پر قربانی چڑھاتے تھے، اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے، تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعۃ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔[1]

★ یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائل عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے، واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھالیتے تھے، اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے،

اللہ کا اعتقاد | عرب گو قریباً سب کے سب بت پرست تھے لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا کہ اصلی خدا سب سے برتر اور جدا ہے، اور وہی تمام عالم کا خالق ہے،

---

[1] یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر مناۃ میں ہے،

ن عالی اکبر تو وہ اللہ کہتے تھے قرآن مجید میں ہے،

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اور اگر ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان
وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ	اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کو
لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ	کس نے (تمہارے) کام میں لگا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ "اللہ"
(عنکبوت - ۶)	تو پھر یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں،
۶ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ	پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ	خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب وہ ان کو نجات
إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ (عنکبوت)	دیکر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں"

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا[ل] میں مشہور مستشرق نولدکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں، ج ۶ ص ۲۲۳

"اللہ" جو صفا کے کتبوں میں "ہلہ" لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگانِ عرب شمالی کے نام کا ایک جز تھا، مثلاً "زید اللٰہی"...... نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا، لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبودِ اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف

یہودیوں کے بیت [illegible] ایک مختصر تاریخ موجود ہے

[illegible] مخصوص ہو گیا۔

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت اگرچہ عرب میں بت پرستی عام تھی لیکن یہ تینوں مذہب بھی [illegible] سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان نصرانی تھے، قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت نے اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً ورقہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل پڑھ سکتے تھے [illegible] والے لوگ تھے جنھوں نے نصرانیت چھوڑ کر تعلیم پائی تھی،

حمیر، بنو کنانہ، بنو حارث بن کعب، کندہ یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہودیوں نے پورا غلبہ پالیا تھا، اور توراۃ کی تعلیم کے لیے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدراس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعۂ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امراء القیس کا ہمعصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیا، جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا،

۸ اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے، تو کفار بدگمانی کرتے تھے، کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ	اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں
اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (نحل-١٤)	کہ کوئی آدمی سکھاتا ہے،

قرآن مجید مین اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی،

قبیلۂ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تیمی نے جو اس قبیلہ کا مشہور رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا،[1]

مذہب حنیفی

دین ابراہیمی کا اُمّ الاصول توحید خالص تھی، زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلود ہو گیا تھا، یہانتک کہ خود خانۂ خدا مین بتون کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہین ہو سکتا تھا، عرب مین کہین کہین اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحبِ بصیرت تھے، ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسانِ عاقل، جمادِ لا یعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بنا پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتون کے دل مین آیا لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے، ابن اسحاق[2] نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ مین ورقہ ابن نوفل، عبد اللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے، ان لوگون کے دل مین دفعۃً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے آگے سر جھکاتے ہین، جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چارون قریش کے خاندان سے تھے، ورقہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے، عبد اللہ بن جحش حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے، عثمان عبد العزیٰ کے پوتے تھے،

زید، دین ابراہیمی کی تلاش مین شام گئے، وہان یہودی اور عیسائی پادریون سے[1]

---

[1] معارف ابن قتیبہ [2] سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶

لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لیے اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ "میں ابراہیمؑ کا مذہب قبول کرتا ہوں" صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ "میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، اے اہل قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے، ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے"

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی ممانعت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے،

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا، اور ان سے صحبت رہی تھی، ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے

اسی زمانہ کے قریب اُمیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانۂ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں، اور بت پرستی چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا،

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے، وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہؓ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل ہونے کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا، اور نہایت پر درد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا،

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ردیف تھے،

انھوں نے امیہ کا ایک شعر پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور" انھوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپ فرماتے جاتے تھے کہ "اور" اخیر میں آپ نے فرمایا کہ امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں ان ہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص عرب کا نامور خطیب قُس بن ساعدہ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو حنیفی کیوں کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دین میں بت پرستی سے انحراف تھا، اس لیے اس کو حنیفی کہتے ہیں، کیونکہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی زبان میں حنف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو۔

[illegible]

[illegible] مدینہ میں متعدد اشخاص [illegible] سے منکر ہو گئے تھے، اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں [illegible] لیے کہ مجدد ملت ابراہیمی

[illegible] مذکور ہے۔

کے ظہور کا وقت قریب آگیا تھا،

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا؟

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے، یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی، اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحاد بھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت، جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کر سکی. اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، یا توحید تھی، لیکن خدا اس قسم کا تھا، جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا[1]،

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی. قمار بازی، شراب خوری، زناکاری، کا رواج عام تھا، بےحیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے بڑا نامور شاعر امرؤالقیس، جو شہزادہ بھی تھا قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے، اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزان کیا جاتا ہے،

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں

---

[1] توراۃ تکوین آیت ۲۲ تا ۲۹ میں حضرت یعقوبؑ کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے

کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا، عیسائیون کے بیان کے مطابق عرب قبلِ اسلام تمام مذاہب مین سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا، تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مورخین کی زبان سے سننا چاہیے، ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے:-

"عیسائیون نے عرب کو پانسو برس تعلیم و تلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے، یعنی بنو حارث نجران مین، بنو حنیف یمامہ مین اور کچھ بنی طے مین عیسائی تھے، باقی خیریت ...
.... بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھیے تو اس کی سطح پر عیسائیون کی ضعیف کوششون کی کچھ خفیف سی موجین لہراتی نظر آتی تھین، اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی لیکن بت پرستی اور بنو اسمٰعیل کے بیہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا"[1]

یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ مین آئے گی) کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی مین ایک آفتابِ عالمتاب کی حاجت نہ تھی؟

---

[1] میور صاحب کی لائف آف محمد جلد ۱) دیباچہ،

سلسلۂ اسمٰعیلی

اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ مورخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں،
عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہوگئیں، مثلاً طسم وجدیس وغیرہ،
خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں، مثلاً اہل یمن اور انصار، اور تیسرا سلسلہ اسمٰعیلی
حضرت اسمٰعیل جب مکہ میں آباد ہوئے تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسمٰعیل
نے اس خاندان میں شادی کی، اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے، اب
عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے،

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت
(صلی اللہ علیہ وسلم) [illegible]
کو عنایت ہوئی [illegible]

[illegible]

لیکن یورپ کے متعصب مورخ [illegible]
اور اسمٰعیل عرب میں آئے [illegible] حضرت
کی اولاد ہیں

۱؎ اس کا مرجع بعض مصریین نے [illegible]

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے، اس لیے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے،

جو واقعات مختلف فیہ ہیں، ان میں [illegible] اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں، اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں، اصول مذکور حسب ذیل ہیں،

۱۔ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ عرب میں آکر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا یا حضرت اسمٰعیلؑ کو؟

حضرت اسماعیلؑ کہاں آباد ہوئے، یہود مدعی ہیں کہ حضرت [illegible] ذبیح ہیں اس بنا پر وہ قربانی کا موقع شام بتاتے ہیں، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت [illegible] نہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے، تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی [illegible] تسلیم کرنی [illegible] گی، اور اس حالت میں [illegible] بحث کی تمام کڑیاں متصل ہو جاتی ہیں،

توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت [illegible] حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے ہوئی، جس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا، حضرت [illegible] کے بطن سے حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے، حضرت اسمٰعیلؑ جب [illegible] دیکھا کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں [illegible] ان کے بیٹے کو گھر سے [illegible]

[illegible] دونوں [illegible] جات ہے جو توراۃ [illegible]

"تب ابراہیم نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی، اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا۔ وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی، کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی۔ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا، اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر، اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی۔" (توریت، سفر پیدائش، ۲۱)

حضرت ہاجرہ نے مشک کو ...

واضح ہو کہ ...

اسمٰعیلؑ کی عمر ۱۳ برس کی اور حضرت ابراہیمؑ کی ننانوے برس کی تھی۔[۱]
یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لیے اس وقت قطعاً ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی، اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے کسی دور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

توراۃ کی عبارت مذکورہ مین تصریح ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ فاران مین رہے اور تیراندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب مین واقع ہے، اس لیے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب مین آنا خلاف واقعہ ہے۔

جغرافیہ دانان عرب عموماً متفق ہین کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے چنانچہ معجم البلدان مین صاف تصریح ہے، لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہین کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی مفصل طویل بحث پر مبنی ہے جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لیے اس کو ہم نظر انداز کرتے ہین، البتہ اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ عرب کی حد شمالی کسی زمانہ مین کس حد تک وسیع تھی۔

موسیو لیبان تمدن عرب مین لکھتے ہیں:-

"اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہین ہے یعنی یہ حد اس طرح پر

---

[۱] پیدائش باب ۱۷، ۲۴، ۲۵

قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک، اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیج فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں۔"

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلاف قیاس نہیں، توراۃ[1] میں جہاں حضرت اسمٰعیلؑ کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ لفظ ہیں:-

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں، بستے تھے۔"

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے، وہ عرب ہی ہو سکتا ہے۔ نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے بنو اسرائیل کے ساتھ ہے، بنی اسمٰعیل کا ذکر محض ضمنی طور پر آ جاتا ہے، اور اس وجہ سے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا، لیکن مختلف تلمیحات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کا عرب میں آباد ہونا، ایک مسلمہ امر تھا، عہد جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں، پولس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے[2]، اسمیں یہ عبارت ہے:-

"ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا، اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اسلئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا دہ غلام جنتی ہے۔ یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے، اور اب یروشلم کا جواب ہے۔"

---

[1] سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ [2] باب ۴ آیت ۲۴

[illegible] دونوں ترجمے صاف ہیں تاہم [illegible] حضرت ہاجرہ کو عرب [illegible] ہاجرہ عرب [illegible] تو ان کو عرب کا کوہ سینا [illegible] جاسکتی،

ذبیح کون ہے؟ توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سراپا مسخ ہو گئی ہے، اور خصوصاً پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں، یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے، تاہم حقائق کے خط وخال اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، توراۃ میں گو تصریحاً حضرت اسحاق کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاوی کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے، اور نہ ہو سکتے تھے، امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے،

ا۔ شریعت سابقہ کی رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلونٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے بھی مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ پہلونٹے بچے تھے،

خدا نے حضرت موسیٰ سے جہاں قربانیوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے، وہاں فرمایا ہے،

قدس لی کل بکر في بني اسرائیل	کیونکہ بنو اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر
من الناس والبهائم	پہلونٹا بچہ میرے لیے ہے (عدد ۸-۱۶)

۲۔ پہلونٹے بچے کی فضیلت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، توراۃ میں ہے کہ اگر کسی شخص کے دو بیویاں ہوں، ایک محبوب ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اسی اولاد

کو ہوگی جو پہلوٹھی ہو، گو وہ غیرہ و بقرہ سے ہو،

فانه اول [illegible] بنيه	کیونکہ وہ اُس کی پہلی قدرت ہے، اور اسی کو
(سفر تثنیه [illegible])	اولاد اولین ہونے کا حق ہے،

۳- جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا، توراۃ میں ہے:

فی ذلك الوقت افرز الرب سبط	تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لیے مخصوص
لاوی لیحملوا تابوت عهد الرب	کیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے، اور
ولکی یقفوا امام الرب لخدمته	اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو تاکہ وہ خدا کی
ویبارکوا باسمه فی هذا الیوم	خدمت کریں، اور اس کے نام سے آج تک
لاجل ذلك لم یکن للاوی قسم	برکت دیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں
ولا نصیب مع اخوته الرب هو نصیبه	کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیونکہ ان کا
(توراة اصحاح ۱۰ آیت ۸، ۹)	حصہ خدا ہے،

۴- جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا، اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں حرم کعبہ دیکھنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، توراۃ میں ہے

فها انك تحبلین وتلدین ابناً	اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی، اور اس کے
ولا یعلو موسی راسه لان الصبی	سر پر استرا نہ پھیرا جائے، کیونکہ یہ بچہ خدا
یکون نذیراً لله من البطن	کے لیے نذر کیا جائے گا،

۵- جو شخص خدا کا نذر کیا جاتا تھا اس کے لیے "خدا کے سامنے" کا لفظ استعمال

کرتے تھے" (توراۃ سفر عدد ۶-۱۲ و ۲۰ و سفر تکوین ۱۷ و تثنیہ ۱۰-۸)

۲- حضرت ابراہیم کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں یہ تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو (توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲ آیت ۲)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو لیکن پہلے یہ بتانا ضرور ہے کہ حضرت ابراہیم کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر نذر چڑھانا ایک بات تھی یعنی دونوں کیلیے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو خدا کے معبد میں قربانی چڑھایا تو اس کے معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور عبادت کے لیے گویا الگ کر دیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ جب جانوروں کیلیے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے توراۃ[1] میں خدا کی زبان سے مذکور ہے:

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل	کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا
من الناس والبہائم	ہر پہلوٹھا جو ہے میرے لیے ہے

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ "خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو اور ان کو خدا کے سامنے پیش کر کے خدا کے لیے خاص کر دیے جائیں اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو قربانی کی جائیں" (اختصاراً)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں، حضرت ابراہیم نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لیے بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی، لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی

---

[1] عدد اصحاح ۸-۶:

خواب تھا، اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانۂ خدا کی خدمت کے لیے خاص کر دیا، وہ جو شرطین قربانی کی تھین، قائم رکھین،

بیانِ مذکورۂ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہیئین،

(۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسمعیلؑ کے بعد ہے، اس بنا پر حضرت اسحاق اکلوتے بیٹے نہین، اور چونکہ قربانی کے لیے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے، اس لیے حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا حکم نہین ہو سکتا تھا،

(۲) حضرت اسحاقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا، بخلاف اس کے حضرت اسمعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دیکر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہین کیا تھا،

(۳) حضرت اسماعیلؑ کے خاندان مین مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہین منڈاتے تھے، حج مین احرام کے زمانہ تک جو بال نہین منڈاتے یہ اسی رسم اسماعیلی کی یادگار ہے،

(۴) جو لفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لیے ملت ابراہیمی مین استعمال کیے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے لیے استعمال کیے، نہ کہ حضرت اسحاقؑ کے لیے، توراۃ مین ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا،

لیت اسمٰعیل یعیش امامک — کاش اسمعیل تیرے سامنے زندہ رہتا،

توریت میں بھی (جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، سامنے زندہ رہنا) ان ہی معنوں میں ہوا ہے۔

(۵) حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے، توراۃ جو تمام تر حضرت اسحاقؑ کی ایک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کیے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحاقؑ خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں،[1] اور حضرت اسمٰعیلؑ دعوتِ ابراہیمؑ ہیں، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے،[2] اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسمٰعیل رکھا کیونکہ اسماعیلؑ دو لفظوں سے مرکب ہے، سمیع اور ایل "سمع" کے معنی "سننے" کے اور "ایل" کے معنی خدا کے ہیں،[3] یعنی خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن لی۔ توراۃ میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ "اسمٰعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی" حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر بھی حضرت اسماعیلؑ کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس لیے حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ

(۶) حضرت اسحٰقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا، توراۃ میں ہے:۔

"پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لیے ایک بیٹا جنے گی، اور اس کا نام اسحٰق رکھے گا اور میں اپنا عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا" (توراۃ تکوین، اصحاح ۱۷، آیت ۱۹)

---

۱ توراۃ تکوین ۱۰-۱۸ ۲ تکوین، اصحاح ۱۵ ۳ تکوین، اصحاح ۱۶ و ۱۷

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا اور فرشتے نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو۔ تو فرشتے نے یہ الفاظ کہے:

"خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی نہیں رکھ چھوڑا میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور سمندر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا" (توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲، آیت ۱۵)

اب غور کرو کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی، ان کی قربانی کا حکم ہوتا۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ اکلوتے تھے، محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرت نسل کی بشارت نہیں دی گئی، توراۃ میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا اس لیے[1] اس بیٹے کی کثرت نسل کا وعدہ کیا گیا یعنی یہ کثرت نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی اس لیے ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحاقؑ کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی خدمت کے صلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

مقام قربانی ۷۔ توراۃ میں قربانی کی جگہ کا جو نام بتایا ہے وہ موریا ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے۔ جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا عیسائی کہتے ہیں یہ اس جگہ کا نام ہے۔ جہاں

[1] یہ مسلم ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت ابراہیمؑ کی ولادت سے سو برس بعد ہوئی، صحاح ۲۱- آیت ۵)

حضرت عیسیٰ کو سولی دی گئی،

لیکن یورپ کے محققون نے ان دونون دعوون کی تغلیط کی ہے، سر اسٹانلی لکھتے ہین:

"حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے، جہان اُن کو خدا نے حکم دیا تھا، لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہین ہے، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیون کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیون کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے، اور اس سے بھی بعید مسلمانون کا دعویٰ ہے کہ وہ جبلِ عرفات[1] ہے۔ غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے، اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے"

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعین مین یہودیون اور عیسائیون کے دعوی غلط ہین. باقی یہ امر کہ مسلمانون کا دعویٰ بھی غلط ہے، اس کی تحقیق آگے آتی ہے،

موریا کی تعیین مین جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے، یا وصفی معنی رکھتا ہے، بہت سے مترجمون نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا، اس لیے اس کا ترجمہ توراۃ کے بعض نسخون مین ملبوطاتِ عالیہ اور بعض مین "زمینِ بلند" اور بعض مین مقام الرویا کیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگون نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لیے لفظ کا ترجمہ نہین کیا، بلکہ بحالِ خود رہنے دیا لیکن مرورِ زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی، یعنی مریا کو مورہ ہوگیا خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان مین دونون لفظون کا املا قریب ہے،

---

[1] یہ غلط ہے مسلمان عرفات کو نہین، بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہین،

مورہ کی نسبت توراۃ میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، توراۃ میں ہے:

وکان جیش المدیانیین شمالیھم	اور مدیانیون کی فوج شمال کیجانب مورہ
عند تل مورۃ فی الوادی	کی پہاڑی پر وادی میں تھی (مدیان عرب
قضاۃ - اصحاح ۷ - آیت ۱	میں واقع ہے)

تمام واقعات اور قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے، جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے، اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے، عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین، تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے،

حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام راہیں اور گلیاں قربانی گاہ ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیم نے یہیں حضرت اسمٰعیل کی قربانی کرنی چاہی تھی،

قرآن مجید میں ہے،

ملہ مدین عرب کی زمین میں ہے اور عرب کو کثر مدیانیوں کہتے ہیں، اور [illegible] تمام [illegible] ہے، اور یہ لوگ حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں جو قطورہ سے تھے انسائیکلوپیڈیا [illegible]

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (حج) — پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔

هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ۔۱۳) — قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل، اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصل جگہ کعبہ ہے، منی نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منی تک وسعت دیدی گئی

قربانی کی یادگار یہودی حضرت اسحٰق کی اولاد ہیں، اس لیے اگر حضرت اسحٰق ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے یہاں موجود ہوتی، بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان بلکہ تمام مسلمانوں میں، جو حضرت اسمٰعیل کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں

اولادِ اسمٰعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں، اور حج جو کہ ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیم [illegible] نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا اے ابراہیم!
حضرت ابراہیم [illegible]

[illegible] چلتے ہیں، یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں جن کا
لفظی ترجمہ [illegible]

۲۔ [illegible] قربان گاہ پر چڑھاتے تھے یا خدا کے لیے

[illegible] آیت ۲۰

نذر دیتے تھے، وہ بار بار معبد یا قربانی گاہ کے پھیرے کرتا تھا

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے

۳۔ نذر کے فرائض میں یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں منڈواتے تھے، حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام اتارتے ہیں تب بال کترواتے [illegible] منڈواتے ہیں، خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے،

مُحَلِّقِينَ رُؤُسَكُمْ (فتح-۳) سروں کو منڈائے ہوئے،

۴۔ حج کا ایک ضروری رکن قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسمٰعیل کی قربانی کی یادگار ہے

اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے،

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ [illegible]

(صافات-۳) قربانی دی،

یہ دلائل توراۃ کی تصریحات و کنایات کی بنا پر تھے، قرآن مجید [illegible] صریحاً حضرت اسمٰعیل کا ذبیح ہونا ثابت ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے [illegible] روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے،

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ [illegible]

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ [illegible]

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ [illegible]

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ [illegible]

إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ	اسکے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیمؑ نے کہا بیٹے میں نے خواب
فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ الخ (صافات-۳)	میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تیری کیا رائے ہے

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لیے دعا مانگی، اور خدا نے قبول کی، اور وہی لڑکا قربانی کے لیے پیش کیا گیا،

توراۃ سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں، اور اسی لیے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارہ میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سنی، اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں، اسحاقؑ نہیں،

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحاقؑ کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہے وہ حضرت اسحٰقؑ نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں،

مسلمانوں کا نام مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا، قرآن مجید میں ہے،

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ	تمھارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب اسی نے[1]
الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ (حج-۱۰)	پہلے تمھارا نام مسلمان رکھا تھا،

اس تسمیہ کی ابتدا قربانی سے شروع ہوتی ہے، یعنی حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا، اور ان سے کہا کہ مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے، تمھاری کیا رائے ہے؟ تو حضرت اسمٰعیلؑ نے نہایت [illegible] گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے "اَسْلَمَا"

---

[1] [illegible] بعض مفسرین نے قریب لفظ کی وجہ سے سمّٰی کا فاعل حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا ہے، تابعین میں [illegible] حسن بصری کا یہی مسلک [illegible] حضرت ابن عباس [illegible] قتادہ اور سعید [illegible] کی طرف ضمیر پھیری [illegible] امام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے [illegible] اس قرآن [illegible] نام رکھا [illegible]

کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی تسلیم اور حوالہ کر دینے کے ہیں،

فَلَمَّآ اَسْلَمَا (صافات-۳) پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا،

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے، یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا، اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہی شعار مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروانِ ملت کا نام مسلم رکھا،

قربانی، ایثار اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحٰقؑ قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی اُمت کو ملتا،

قربانی کی حقیقت اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا؟ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفینِ اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا لیکن یہ سخت غلطی ہے،

اکابر صوفیہ نے لکھا ہے[1] کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے

---

[1] اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے، مصنف نے یہ لکھا ہے کہ رؤیا دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک عینی جس میں صورت واقعہ بعینہٖ دکھائی جاتی ہے، اور دوسری مثالی جس میں صورت واقعہ کسی مثالی صورت (باقی صفحہ پر)

ہوتے ہیں، عینی اور تمثیلی، عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے، جو خواب میں نظر آتی ہے، تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا گیا تھا، اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیے جائیں،

توراۃ میں جابجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵) میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو بہت سے علماء نے تسلیم کیا ہے، اور بیان کیا ہے، خواب کی اس دوسری قسم میں اصلی مقصود رویا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا، یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا، اور اُحد میں مسلمان شہداء کو ذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھنا،

محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں:

وبعض الرؤیا مثل یضرب لیتأول	بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جس کو اس مثالی صورت
علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ	میں اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ پر اس کی
معنی التعبیر فی مثلہ وبعضہ لا یحتاج	تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی
الی ذلک بل یاتی کالمشاھدۃ	ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے
(فتح الباری جلد ۱۲ ص ۳۶۴)	بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں،

امام ابوبکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس رویا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ بعض رویا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی، یعنی جو بالکل لفظاً لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور بعض مثل کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا، (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۰۹ مصر)

مصنف سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علماء کی تقلید کی ہے، انہوں نے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے، اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا اپنی خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے، اور اس کی بعینہ تعمیل پر آمادہ ہو گئے لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے بتا دیا،

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا، اور بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی (جو انبیا سے ہو سکتی ہے، اگر یہ غلطی قائم نہیں رہتی، بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیے گئے لیکن خدا نے اُن کی حسنِ نیت کی قدر کی اور فرمایا:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (صافات ۳)

اور تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵) اُن کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا، اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی،

بیچمدان جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محبتِ الٰہی سے سرشار تھے خطاے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوقِ اطاعت و محبت میں اس حکمِ الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تاکہ اس ابتلا میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں، اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لیے وقف کر دینے کی، دل کا سہارا بیگر حسن کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں، تاآنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو خود اپنے لفظوں میں واضح فرما دے چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اُن کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی:

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (صافات ۳)
وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (صافات)

ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو یہی صلہ دیا کرتے ہیں، اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا،

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جانی اطاعت و قربانی کی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں،

یہ تشریح ان بعض علما کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں،

بہرحال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمتِ کعبہ کے لیے نذر چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لیے شریعتِ سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا، وہ "خدا کے سامنے" تھا۔ توراۃ میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی،

لیت اسمٰعیل یعیش امامک — کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندگی کرتا،

(توراۃ تکوین اصحاح ۱۷ - آیت ۱۸)

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا نہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) اور نہ جمہور علماء اس رویا کو عینی ہی سمجھتے ہیں، لیکن عین اُس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے اپنے کام کو پورا کر چکے تھے، اور تعمیلِ حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحیِ الٰہی نے آواز دی "اے ابراہیم! تم نے اپنا کام پورا کر دیا، اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملتِ ابراہیمی کی یہ سنتِ عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہو گئی"۔

"ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ہمارے محققین نے لکھا ہے، نفس کی قربانی کی تمثیل ہے، اور اس قربانی کا گوشت اس روزِ عید میں قربانی کرنے والے کے لیے برکت، احباب کے لیے تحفہ اور فقراء کے لیے سامانِ دعوت بنا۔

مزید تفصیل کیلیے معارف ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مضمون ذبح عظیم اور معارف سنہ ۳۶ء کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ "س"

مکۂ معظمہ

حضرت اسمٰعیلؑ کی بحث مسکن میں گذرچکا کہ وہ عرب تھا، مقام ذبح کی تعیین میں ثابت ہو چکا کہ وادی مکہ تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے،

متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خانہ[1] دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا، اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں،

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے قرآن مجید میں یہی نام ہے،

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا (آل عمران)	وہ "بکہ" میں تھا،

کتاب زبور ۸۴-۶ میں ہے،

بکہ کی وادی میں گذرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے، برکتوں سے مورہ کو ڈھانک

---

[1] مرگیولیس اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ گو مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے لیکن صحیح روایت سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی، مرگیولیس نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے، اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے،

لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں "

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکۂ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم عَلَم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے، اور یہ وہی عربی لفظ بکاء ہے، چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لیے بہت سے مترجمین نے عبارتِ مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے. لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادیِ بکا رکے کیا معنی ہوں گے، زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور مروہ، اور قربانگاہِ اسمٰعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے، اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) "اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے..... اے خدا! تیرے قربان گاہ، میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارکی ہو، ان لوگوں کی جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں، اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں" اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں، اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے جس میں حسبِ ذیل باتیں پائی جائیں،

(۱) قربانی گاہ ہو،

(۲) حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کر وہاں تک سفر کرکے جائیں،

(۳) وادیِ بکہ کہلاتا ہو،

(۴) وہاں مقام مورہ بھی ہو، ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ

بکہ وہی ہے مکہ معظمہ اور مورد ہی وہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہو گا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں، یُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔

ڈاکٹر ہسٹنگس نے "ڈکشنری آف دی بائبل" وادی بکا پر جو آرٹیکل لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"اس لفظ سے اگر کوئی واقعی وادی مراد ہے، تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے:"

(۱) ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں،

(۲) وادی اخور ہے، جو یشوعا باب ۷۔ آیات ۲۴-۲۶ وغیرہ میں مذکور ہے،

(۳) وادی رفائیم ہے، جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸-۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے،

(۴) کوہ سینا کی ایک وادی ہے،

(۵) بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے،

(دیکھو رینان کی کتاب "حیات عیسیٰ" باب ۴)

لیکن کیا عجب بات ہے، ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا، مصرع

ہمان ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں، فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے،

جدید انسائیکلوپیڈیا[1] میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مرگولیوث کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے۔

"قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴-۶) میں وادی بکہ کا لفظ ہے۔"

لیکن مرگولیوث صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی دان عالم ہے وہ لکھتا ہے[2]۔

"مکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان مکربہ لکھتے ہیں۔"

لیکن مارگیولوس کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھا ہے کہ

"رومن مورخ ڈیوڈورس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور مقدس ہے، اور یہ ولادت مسیح سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔"

اگر کعبہ حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا، کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بلد بطلیموس[3] کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے،

---

[1] انسائیکلوپیڈیا طبع اخیر جلد، صفحہ ۷۰۹ [2] [illegible] ڈوزی [3] ایضاً [4] بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ ہی میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیے ہیں۔

طول ۵، درجہ عرض ۳ درجہ

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اگر اس نے اپنے جغرافیہ مین مکہ کا ذکر کیا ہے، تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے،

مارگیولوس نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اصابہ مین تصریح ہے کہ مکہ مین سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید بن یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی" لیکن مارگیولیوس کو یہ معلوم نہین کہ مورخین نے جا بجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے اسلیے عمارتین نہین بنوائین، بلکہ خیمون اور شامیانون مین رہتے تھے، اور اس طرح مکہ ہمیشہ خیمون کا ایک وسیع شہر تھا،

خانۂ کعبہ کی تعمیر دنیا مین ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ مین عالمگیر اندھیرا تھا، قبولِ حق ایک طرف، اس وسیع خطۂ خاک مین گز بھر زمین نہین ملتی تھی، جہان کوئی شخص خالص خدا ے واحد کا نام لے سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان مین یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلون سے کام پڑا، مصر آئے ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے کسی نے بات تک نہین پوچھی، خدا کا نام جہان لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ مین آواز دب دبکر رہ جاتی تھی، معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے، اب ایک سادہ، بے رنگ ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا جس پر صرف اسمِ حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحراے ویران تھا،

جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا،

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو عرب میں لائے اور ان کو نہیں آباد کیا، حضرت سارہؓ نے (جیسا کہ توراۃ میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا، حضرت ابراہیم مکہ میں چلے آئے، حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہو چکے تھے، اعلان حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا، دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی،[1]

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ	اور جبکہ ابراہیم اور اسمٰعیل خانۂ خدا کی
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (بقرۃ-۱۵)	دیواریں اٹھا رہے تھے،

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی،

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ	ہمارا گھر طواف کرنے والوں، نمازمیں
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ	قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور
بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ	سجدہ کرنے والوں کیلیے پاک کر اور تمام لوگوں
ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ	کو پکار دے کہ حج کو آئیں پیدل بھی اور دبلی
(سورۂ حج-۴)	اونٹنیوں پر بھی، ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے،

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی، اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، ابراہیمؑ کی آواز حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی لیکن وہی معمولی آواز

(۱؎ محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھاکر بلند کی (مزید توضیح کے لیے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھیے) "س"

ان کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک،

علامہ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو تعمیر کی اس کا عرض و طول
ب ذیل تھا،

بلندی	زمین سے چھت تک ۹ گز
طول	حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز
عرض	رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز

مارت بن چکی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لا دو تاکہ ایسے
ر لگا دوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخ مکہ موسوم بہ اعلام
بیت الحرام میں ہے،

قال ابراھیم لاسمٰعیل علیھما	پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے
الصلوٰۃ والسلام یا اسمٰعیل ابتغی	کہا کہ ایک پتھر لا دو تاکہ میں ایسی جگہ نصب
اضعہ حتی یکون علما	کردوں جہاں سے لوگ طواف شروع
اس یبتدون منہ الطواف	کریں،

کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی، نہ کواڑ، اور نہ چوکھٹ یا زو تھے،
ابن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انھوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے
سر کی، اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی[۱]،

---

[۱] حوالہ کتاب النسب از ابن بکار و ابن الماوردی،

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے، چنانچہ سب سے پہلے قبیلۂ جرہم آکر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسمٰعیلؑ نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی جن کے نام توراۃ میں مذکور ہیں، ان میں سے اکثر اہل عرب قیدار کی اولاد ہیں، حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا، اور کعبہ کی تولیت خاندان اسمٰعیل سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آگئی لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا، اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا، حضرت اسمٰعیلؑ کا خاندان موجود تھا، لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے،

حرم کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا، یمن میں خاص قسم کی چادریں بنی جاتی ہیں، جن کو بُرود یمانی کہتے ہیں، یہ پردہ ان ہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا، قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا، علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے،[1]

---

[1] حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا جو مصر میں بنا جاتا تھا، [illegible] کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہد خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنو امیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا، مامون الرشید ہر سال تین پردہ چڑھاتا تھا، حج کے زمانہ میں دیبا احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح بن سلطان قلاوون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لیے وقف کر دیے، جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان

خدا کا گھر سیم و زر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں، اس لیے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے، عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لیے بھیجیں، امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوادی جائے، اعلام (تاریخ مکہ) میں تمام کعبہ کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں، جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں، اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضرور بھی نہیں،

حضرت اسمٰعیل کی قربانی

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لیے کوئی نفس قدسی تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے، اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے، توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت آتا ہے،

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے، اس کے مختلف انواع ہیں، جن میں سے ایک خواب بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی ابتدا اچھے خواب سے ہوئی، یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے، جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا، بہر حال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۵) نے چند گانوں اور اضافہ کر دیے، (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بتفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی و ترجمہ البلدان میں ہے، عمدہ تصنیف یعنی اعلام کو دیکھو کہ وہ تاریخ کعبہ کی تصنیف اور جامع ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں، انھوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے،

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جان نثاری پر اعتماد تھا، لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ	بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں
اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى	تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا، تیری
(صٰفٰت)	کیا رائے ہے،

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا،

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ	ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گذریے
اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صٰفٰت)	خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا،

اب ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعائے سحر کے بعد خاندانِ نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لیے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں، اور ہاتھ میں چھری ہے،

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اور اب باپ ہی کا مہربر ور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکۂ قدسی، فضائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں، اور نہ

انگشت بدندان ہیں کہ دفعتہ عالم قدس سے آواز آتی ہے،

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ	ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا،
الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي	ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا
الْمُحْسِنِينَ (صٰفّٰت۔ ۳)	بدلہ دیا کرتے ہیں،
طغیانِ ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل	در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے محمدؐ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ ابن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان،

صحیح بخاری (باب مبعث النبیؐ) مین یہین تک ہے، لیکن امام بخاری نے اپنی تاریخ مین عدنان سے حضرت ابراہیمؑ تک نام گنائے ہین یعنی عدنان بن اد بن المقوم بن تارح ابن یشجب بن یعرب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیمؑ،

سلسلۂ نسب

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن کا ذکر توراۃ مین بھی ہے، ان مین سے قیدار کی اولاد حجاز مین آباد ہوئی اور بہت پھیلی، ان ہی کی اولاد مین عدنان ہین، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کے خاندان سے ہین، عرب کے نسب دان تمام پشتون کو محفوظ نہین رکھتے تھے، چنانچہ اکثر نسب نامون مین عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک صرف آٹھ نو پشتین بیان کی ہین، لیکن یہ صحیح نہین، عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیلؑ تک اگر صرف نو دس پشتین ہون تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتون کے خلاف ہے،

علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) مین لکھتے ہین:

ویستحیل فی العادة ان یکون	اور یہ عادۃً محال ہے کہ دونوں میں ۴
بینهما اربعة اٰباء او سبعة کما	یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو جیسا کہ ابن اسحٰق
ذکر ابن اسحاق او عشرة او عشرون	نے ذکر کیا، یا ۱۰، ۲۰ پشتیں ہوں کیونکہ
فان المدة اطول من ذلک کله	زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے،

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے، اس غلطی نے بعض عیسائی مورخوں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاندان ابراہیم سے ہیں[1]

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے، اور بیچ کی پیڑھیوں کو چھوڑ دیتے تھے، اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا، اس لیے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلہ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے، اوپر کے اشخاص کا

---

[1] سر ولیم میور صاحب نے صرف یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں: "یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیلؑ کی اولاد سے خیال کیا جائے، اور غالبًا یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے ثابت کیے جائیں، ان کی عین حیات میں پیدا ہوئی تھی، اور اسی طرح پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی حصے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بہت سے قصے یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے:" لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین ہیں جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں، (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخی عرب)

نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لیے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے، تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے جو اس فروگذاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ "مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ میں نے عرب میں ایسے علما دیکھے جو معد سے لیکر حضرت اسمٰعیل تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے، اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے۔ اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی، البتہ ناموں میں فرق تھا"[1]، اسی مورخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ "شہر تدمر میں ایک یہودی تھا جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہوگیا تھا، اس کا بیان تھا کہ "ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا وہ میرے پاس موجود ہے[2]، اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل تک چالیس نام ہیں"، بہرحال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کے خاندان سے ہیں۔

خاندان قریش

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ ابا عن جد معزز و ممتاز چلا آتا تھا لیکن جس

---

[1] تاریخ طبری [illegible] صفحہ ۱۱۰۵ [2] تاریخ طبری [illegible] [3] [illegible] ایک عیسائی [illegible] نے [illegible] حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو غیر ذی اثر ثابت کیا، ان کے الفاظ میں [illegible] کہ محمد ایک غریب اور ذلیل و ادنیٰ خاندان سے تھے، اس کے بعد [illegible] نے حسب ذیل استدلال پیش کیے ہیں:- (۱) قرآن مجید میں [illegible] کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا (۲) پیغمبر کے عروج کے [illegible] نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ذریت سے تشبیہ دی جو کھوہ سے پیدا ہو (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپ نے اس لقب سے انکار کیا (۴) [illegible] دن آپ نے فرمایا کہ

شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور ان ہی کی اولاد قریش ہے۔ حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں؛

اما قریش فالاصح فہر[۱] جماعها والاکثرون النضر

قصی

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا اس زمانہ میں حرم کے متولی حلیل خزاعی تھے، قصی نے حلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبی تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے حلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہوگیا، قصی نے ایک دارالمشورہ قائم کیا جس کا نام دارالندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲) "آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہوگیا؛ قرآن شریف کے الفاظ ہیں وقالوا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں مکہ و طائف کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ اترا، عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور قوت [illegible] عظیم کہتے [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا۔ دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن [illegible] سے توجہ [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کونسی بات صحیح ہے؟ بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا [illegible] مولیٰ اور سید خدا ہے قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ خیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ [illegible] مارگولیس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کیے ہیں جو مشہور جرمن مستشرق ہے۔ این خانہ ہمہ آفتاب است۔

[۱] زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰۔

میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔)

قصی[2] نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ[1] و رفادہ جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، ان ہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حج کے کام آئے مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول ان ہی کو ملا، چنانچہ علامہ ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لیے ان کو

---

[1] سقایہ یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا اور رفادہ یعنی حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

[2] قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزء اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۳۶ سے لیکر ۴۲ تک ہے، قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ قرش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا، اس لیے قریش کہلائے، بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے، چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی، عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے لیکن [illegible] یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر رکھے جاتے تھے، مثلاً اسد، نمر وغیرہ، مورخین یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے، اور ان ہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے، لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

قریش کہتے ہیں، کیونکہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر اُن کو مجمع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے،

قصی ابوکم من یسمی مجمعا　　　بہ جمع اللہ القبائل من فہر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبدالدار، عبد مناف، عبدالعزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ، قصی نے مرتے وقت حرم محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبدالدار[1] کو دیئے، اگرچہ وہ سب بھائیوں میں نا قابل تھے، لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی، اور ان ہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے، عبد مناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور باثر تھے، انھوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیئے گئے، واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں، عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا، اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہو گئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا،

ہاشم

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیرچشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ "قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں، تو ان سے کوئی ٹکس نہ لیا جائے" حبش کے بادشا

[1] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۴۱

نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا، چنانچہ اہلِ عرب جاڑون مین یمن اور گرمیون مین شام، اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لیے جایا کرتے تھے، اس زمانہ مین انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایۂ تخت تھا، تجارِ قریش انگوریہ مین جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا،

عرب مین راستے محفوظ نہ تھے ہاشم نے مختلف قبائل مین دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچائین گے جس کے صلہ مین کاروانِ قریش ان قبائل مین ان کی ضرورت کی چیزین خود لیکر جائے گا، اور ان سے خرید و فروخت کریگا" یہ سبب تھا کہ عرب مین باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا،[1]

ایک دفعہ مکہ مین قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط مین شوربہ مین روٹیان چورا کر کے لوگون کو کھلائین، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا، عربی زبان مین چورا کرنے کو ہشم کہتے ہین جس کا اسم فاعل ہاشم ہے،

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ مین مدینہ مین ٹھہرے، وہان سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار مین گئے تو ایک عورت کو دیکھا جس کے حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندانِ بنی نجار سے ہے، اور سلمیٰ نام ہے، ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی، اور اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہو گیا، شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے، اور غزہ

[1] امالی ابو علی قالی [2] طبری صفحہ ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ (ج ۳) "س"

مین جاکر انتقال کیا، سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ مین پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہان پہنچکر بھتیجے کی جستجو کی، سلمیٰ نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلوا بھیجا، تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لیکر مکہ معظمہ روانہ ہوئے، ان کی عمر ۸ برس کی تھی، یہان آکر ان کا نام عبد المطلب پڑ گیا،

عبد المطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہین، اس لیے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ مین بہت سے اقوال نقل کیے ہین، جن مین صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے اُن کی پرورش کی تھی اور یہ یتیم تھے، اس لیے عرب کے محاورہ کے مطابق "غلام مطلب" مشہور ہو گئے[1]،

عبد المطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اٹ کر گم ہو گیا تھا، انھون نے اس کا پتہ لگایا، اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کرا دیا،

عبداللہ

انھون نے منت مانی تھی کہ دس بیٹون کو اپنے سامنے جوان دیکھ لین گے تو ایک کو خدا کی راہ مین قربان کر دین گے، خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسون بیٹون کو لے کر کعبہ مین آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسون پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبد اللہ کا نام نکلا، یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبد اللہ کی بہنین جو ساتھ تھین، رونے لگین، اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجیے، ان کو چھوڑ دیجیے، عبد المطلب نے پجاری سے کہا کہ عبد اللہ پر اور دس اونٹون پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبد اللہ ہی کے نام

---

[1] دیکھو زرقانی جلد اول ص ۸۵

قرعہ نکلا، عبد المطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیئے، یہانتک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی، تو اونٹون پر قرعہ آیا، عبد المطلب نے سو اونٹ قربانی کیے، اور عبد اللہ بچ گئے، یہ واقدی کی روایت ہے، ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹون کے معاوضہ کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی

عبد المطلب کے دس یا بارہ بیٹون مین سے پانچ شخصون نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی یعنی ابو لہب، ابو طالب، عبد اللہ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، عام طور پر مشہور ہے کہ ابو لہب کا اصلی نام اور ہے، خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے دیا لیکن یہ غلطی ہے، ابن سعد نے طبقات مین تصریح کی کہ یہ لقب خود عبد المطلب نے دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ابو لہب نہایت حسین اور جمیل تھا، اور عرب مین گورے چہرے کو شعلۂ آتش کہتے ہین، فارسی مین بھی آتشین رخسار ہے،

عبد اللہ قربانی سے بچ گئے، تو عبد المطلب کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلہ زہرہ مین وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانون مین ممتاز تھین[1]، وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھین، عبد المطلب وہیب کے پاس گئے، اور عبد اللہ کی شادی کا پیغام دیا، انھون نے منظور کیا، اور عقد ہوگیا، اسی موقع پر خود عبد المطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا، شادی کی، حضرت حمزہؓ ان ہی ہالہ کے بطن سے ہین، ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیرۃ ابن ہشام (برحاشیۂ زاد المعاد مصر ج ا صفحہ ۸۰) "س"

کی خالہ ہوئیں، اور اس بنا پر حضرت حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی ہیں،

دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبد اللہ تین دن رہے، اور پھر گھر چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ برس[1] سے کچھ زیادہ تھی،

عبد اللہ تجارت کے لیے شام کو گئے. واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے. عبد المطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لیے بھیجا، وہ مدینہ میں پہنچے تو عبد اللہ کا انتقال ہو چکا تھا، چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے. تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا،

عبد اللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی جس کا نام ام ایمن تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ترکہ میں[2]، ام ایمن کا اصلی نام برکہ تھا،

[1] زرقانی جلد اول صفحہ ۱۲۲ سطر ۲، [2] طبقات ابن سعد (جزء اول قسم اول صفحہ ۶۲) "س"

ظہورِ قدسی

ولادت

چمنستانِ دہر مین بارہا روح پرور بہارین آچکی ہین، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہین خیرہ ہو کر رہ گئی ہین،

(لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار مین پیرِ کہن سالِ دہر نے کرورون برس صرف کردیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق مین ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدتہاے دراز سے اسی صبحِ جان نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹین بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیان، عناصر کی جدت طرازیان، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیان، ابر و باد کی تردستیان، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، جان نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاعہاے گران ارز شاہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مین کام آئین گے،)

آج کی صبح وہی صبحِ جان نواز، وہی ساعتِ ہمایون، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سِیَر اپنے محدود پیرایۂ بیان مین لکھتے ہین کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریاے ساوہ خشک ہوگیا" لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہین، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہاے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہین بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانون مین خاک اڑنے لگی،

بتکدے خاک مین مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزان دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت مین بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعین ہر طرف پھیل گئین، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا)

یعنی یتیم عبد اللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہ حرم، حکمران عرب، فرمان روائے عالم، شہنشاہ کونین

شمسۂ نُہ مسند ہفت اختران — ختم رسل خاتم پیغمبران

احمد مرسل کہ خرد خاک دست — ہر دو جہان بستۂ فتراک اوست

امی و گویا بزبان فصیح — از الف آدم و میم مسیح

رسم ترنج است کہ در روزگار — پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالم قدس سے عالم امکان مین تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا، اللّٰھم صلّ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس مین انھون نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ، مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء مین ہوئی تھی۔[1]

---

[1] محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحون مین آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) صحیح بخاری مین ہے کہ ابراہیمؑ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب مین گہن لگا تھا، اور ۱۰ھ تھا، (اور اس وقت آپؐ کی عمر کا ترسٹھوان سال تھا)

(۲) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ھ کا گہن، ۷ جنوری ۶۳۲ء کو ۸ بجکے ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔

(۳) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹین تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے جس مین ازروے قواعد ہیئت، ربیع الاول کی پہلی تاریخ، ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

آپ کا نام "محمد" رکھا گیا، اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبد المطلب نے یہ نام رکھا تھا،

رضاعت سب سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا (جو ابولہب کی لونڈی تھی)[1]

ثویبہ

حلیمہ سعدیہ

ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے آپ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفاء شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے، اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں،

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنو امیہ نے دمشق میں پایۂ تخت قائم کیا، اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی، تاہم انکے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے، ولید بن عبد الملک خاص اسباب سے نہ جاسکا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱) (۴) تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا، اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے،

(۵) ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت ٹھیک ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

[1] بخاری باب تحریم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب، ص ۲-۷، امام سہیلی نے بتفصیل یہ واقعات لکھے ہیں، اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں اعرب ہوں کیونکہ قریشی ہوں، قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں (الروض الانف ج اول ص ۱۰۹) سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ "محمد کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر بدوناے عرب کے خاص مذاق کے موافق تھی"

اور حرم شاہی میں پلا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنو امیہ میں حضرت ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا،[۱]

غرض، دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں، اور شرفائے شہر اپنے شیرخوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت کے چند روز بعد قبیلۂ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، اُن میں حضرت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں[۲]، اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ نے اُن کو مقرر کرنا چاہا تو اُن کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں، اس لیے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام شیما تھا، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت انس تھا، وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں، دو برس کے بعد حلیمہ آپ کو مکہ میں لائیں، اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ، چنانچہ وہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کے برس تک رہے، ابن اسحٰق نے وثوق کیساتھ ۶ برس لکھا ہے،

۱؎ (ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۵ طبع لیڈن) ۲؎ سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا، اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے الحرۃ لاتاکل بثدییھا، اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لیے مجبوراً حضرت حلیمہؓ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی، لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لیے آیا کرتی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور امرا کے ساتھ مخصوص ہوگا،

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے"[1] بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں،

حضرت حلیمہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، عہد نبوت میں جب وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ میری ماں! میری ماں کہکر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے،

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے وفات کر گئیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ابی خیثمہ نے "تاریخ" میں، ابن جوزی نے "حدائق" میں، منذری نے "مختصر سنن ابی داؤد" میں، ابن حجر نے "اصابہ" میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے ان کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "التحفة الجسيمة فی اثبات اسلام حلیمہ"[2] ہے،

حضرت حلیمہؓ کے شوہر یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رضاعی باپ کا نام حارثؓ بن عبد العزی ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے، حارث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو، آپؐ نے فرمایا ہاں، وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا، حارث مسلمان ہو گئے، حارث

[1] طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۷۰، [2] زرقانی جلد ۱ ص ۱۴۶، [3] اصابہ فی احوال الصحابہ مطبوعہ مصر مطبع سعادت جلد ۴ ص ۲۷۳

رضاعی بھائی بہن

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار رضاعی بھائی بہن تھے، جن کے نام یہ ہیں، عبد اللہ، انیسہ، حذیفہ، اور حذافہ جو شیما کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبد اللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں،

مدینہ کا سفر

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں، چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دادا کی ننھال خاندان نجار میں تھی، وہیں ٹھہریں اس سفر میں ام ایمن بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دایہ تھیں، مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ اس ننھالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا. قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے، میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے گئی تھیں، جو مدینہ میں مدفون تھے، بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء[۱] میں پہنچیں تو ان کا انتقال ہو گیا، اور یہیں مدفون ہوئیں. ام ایمن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر مکہ میں آئیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب ہجرت کی تو قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنو عدی کے منازل پر گزرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا،[۲]

۱؎ ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے ۲؎ طبقات ابن سعد جلد صفحہ ۷۳،

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، [1]

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی، اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے، اور فرطِ محبت سے روتے جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کی، ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنوہاشم کے رتبۂ امتیاز کو دفعۃً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنوامیہ کا خاندان بنوہاشم پر غالب آگیا، عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصبِ ریاست میں صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب

---

[1] عبدالمطلب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنا ایک مسلم واقعہ ہے لیکن مارگولیس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں فرماتے ہیں کہ یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی، اور آخر زندگی میں آپ کے چچا حمزہؓ نے نشہ کی حالت میں محمد کو طعنہ دیا کہ تو میرے باپ کا غلام ہے (مارگولیس صفحہ ۴۶ تا ۴۹) حضرت حمزہؓ کے جس قول سے استدلال کیا ہے مارگولیس خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری غزوۂ بدر وخمس میں ہے یہ ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علیؓ کو دو اونٹ ملے تھے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گذرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے، اس حالت میں یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے، کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے،

ابوطالب کی کفالت

ابوطالب کی کفالت | عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ اور ابوطالب ماں جائے بھائی تھے، اس لیے عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب ہی کے آغوشِ تربیت میں دیا، ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے،

غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں، فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ "ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے اس لیے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے" لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفا اور امراء کے بچے بکریاں چراتے تھے، خود قرآن مجید میں ہے وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانۂ رسالت میں آپ اس سادہ اور پر لطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے، جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا،[1]

شام کا سفر | ابوطالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۸۰ جلد اول بخاری نے کتاب الاجارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے، کہ میں

تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابو طالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے، ابو طالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابو طالب بصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھکر کہا کہ "یہ سید المرسلین ہیں" لوگوں نے پوچھا تم نے کیونکر جانا، اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لیے جھک گئے،

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے، اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے، لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے، اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے، (عینی جلد ۲ صفحہ ۴۳۱) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے، اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے،

عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سرولیم میور، ڈریپر، مارگولیوث وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے ان ہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔[1]

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام

---

[1] ڈریپر معرکۂ علم و مذہب میں لکھتے ہیں "بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی.... آپ کے غیر تربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا.... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کتنا تسلط قابو پا لیا تھا۔" سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی کی جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ پیش نظر کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب و مشاہدات کے نتائج تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف قیاسات ہیں، غرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش ان کے سینہ میں پیدا ہو سکتا، جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے)

نہین بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا،

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی مین مذکور ہے، اس کے متعلق تین باتین قابلِ لحاظ ہین،

(۱) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ "حسن اور غریب ہے، اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہین جانتے" حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے، اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے،

(۲) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگون نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہلِ فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال مین لکھتے ہین کہ عبدالرحمٰن منکر حدیثین بیان کرتا ہے، جن مین سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس مین بحیرا کا واقعہ مذکور ہے"

(۳) حاکم نے مستدرک مین اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے" علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک مین حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ مین اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہون"[1]

(۴) اس روایت مین مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابوبکرؓ بھی اس سفر مین شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے،

---

[1] نیز اس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ (تذکرۂ عبدالرحمٰن ابن غزوان) مستدرک حاکم مع تلخیص جلد ۲ صفحہ ۶۱۵) "س"

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابو موسیٰ اشعری ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے، اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے، ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد[1] میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے، وہ مرسل یا معضل ہے، یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے، اور جو روایت معضل ہے، اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے)

(۶) حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہۃً غلط ہے، اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابلِ سند ہیں، عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود ان ہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ خطا کرتا تھا" اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے"، ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں،[2]

حرب فجار کی شرکت عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، اُن میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلہ میں ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ

(1) جزء اول قسم اول صفحہ ۷۵۔ "س" [2] اجا ہے کہ بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرۃ النبی جلد سوم باب مشہور عام و دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" میں کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے)" "س"

میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبد المطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس پھر قریش غالب آئے، اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوگیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا، جو ابو سفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسرِ حق تھے، اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے، آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنگ نہیں کی، اُن کے الفاظ یہ ہیں،

وانما لم یقاتل رسول اللہ صلی اللہ	اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالانکہ
علیہ وسلم مع اعمامه فی الفجار وقد	آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ
بلغ سن القتال لانها کانت	یہ تھی کہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی
حرب فجار، وکانوا ایضا کلھم کفارا	نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے، مسلمانوں
ولم یاذن اللہ لمومن ان یقاتل	کو لڑائی کا حکم صرف اس لیے خدا نے دیا
الا لتکون کلمة اللہ ھی العلیا	ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اس لڑائی کو فجار اس لیے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی اُن مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول لڑائیوں کے متواتر سلسلے نے سیکڑوں گھرانے برباد کردیے تھے، اور

قتل وسفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتون مین اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگِ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبد المطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندانِ ہاشم، زہرہ اور تیم، عبد اللہ بن جدعان کے گھر مین جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم مین سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ مین نہ رہنے پائے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ مین شریک تھے، اور عہد نبوت مین فرمایا کرتے تھے کہ "معاہدہ کے مقابلہ مین اگر مجھکو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیے جاتے تو مین نہ بدلتا، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے کوئی بلائے تو مین حاضر ہون"

اس معاہدہ کو "حلف الفضول" اس لیے کہتے ہین کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگون کو آیا ان کے نام مین لفظ "فضیلت" کا مادہ داخل تھا یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے، اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا، اور کسی کو یاد بھی نہ رہا، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی، تاہم بانی اول کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے،

تعمیر کعبہ کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی، اور دیوارون پر چھت نہ تھی جس طرح ہمارے ملک مین عید گاہین ہوتی ہین، چونکہ عمارت نشیب مین تھی، بارش کے زمانہ مین شہر کا پانی

۱ طبقات جلد ۱ صفحہ ۸۲۔ ۲ (مستدرک جلد ۲ صفحہ ۲۲۰) ۳ لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لیے پڑا کہ اس معاہدہ مین یہ الفاظ تھے۔ ترد الفضول علی اھلہا

حرم میں آتا تھا، اس کی روک کے لیے بالائی حصہ پر بند بنوا دیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے، حسن اتفاق یہ کہ جدہ کے بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچکر جہاز کے تختے مول لے لیے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا، اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی، مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لیے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے، لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں،

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا، تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا، اس موقع پر بھی بعض دعوے داروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا، رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی، دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمہ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں وہ جمال جہاں تاب چہرہ محمدی تھا، لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہوں، آپ نے فرمایا جو قبائل دعویدار ہیں سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھا کر حجر اسود کو

اس میں رکھدیا، اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں، اور اوپر کو اٹھائیں جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرمادیا۱؎ گویا اشارہ تھا کہ دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی ان ہی ہاتھوں سے نصب ہوگا۲؎

اس طرح ایک سخت لڑائی آپ کے حسنِ تدبیر سے رُک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقّف کردی گئی، لیکن، چونکہ سامانِ تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چاردیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں، اور جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سر سے عمارت بنائی جائے، لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوار کعبہ کے ڈھانے سے، بدگمان ہو جائیں گے۳؎

شغلِ تجارت۴؎ (عرب اور خصوصاً قریش یعنی بنی اسمٰعیل، ظہورِ اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے۵؎، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ اعلیٰ "ہاشم" نے قبائلِ عرب سے تجارتی معاہدے کرکے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کردیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سنِ رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

۱؎ (مسند طیالسی جلد اول صفحہ ۱۸ و مستدرک حاکم جلد اول صفحہ ۴۵۸) "س" ۲؎ یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں" یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں، "س" ۳؎ یہ واقعات ابن ہشام و طبری میں منفرداً اور زرقانی جلد اول صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۴ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، اور دوش مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے، یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے ۴؎ اضافہ و زیادۃ ۵؎ توراۃ تکوین قصہ یوسف ۴،

کو جب فکرِ معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا، ابو طالب کے ساتھ آپ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اور آپ کے حسنِ معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی، لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کس دیانت اور راستبازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے،

تاجر کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمامِ وعدہ کی ہو سکتی ہے، لیکن منصب نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امینؐ اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبد اللہؓ بن ابی الحمسا ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ منتظر پایا، لیکن اس خلاف وعدہ سے آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ "تم نے مجھے زحمت دی میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں"[1]

[1] سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۲۶ (مطبع مجتبائی) کتاب الادب باب فی الوعد)

کاروبار تجارت میں ہمیشہ آپ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے، نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں آپ کا سابقہ تھا، وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے، سائبؓ نام ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپ نے فرمایا "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"، سائبؓ نے کہا، آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ میرے شریک تجارت تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا، فکنت لا تداری و لا تماری[1] قیس بن سائب مخزومیؓ ایک اور صحابی بھی آپ کے شریک تجارت تھے، وہ بھی ان ہی الفاظ کے ساتھ آپ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں[2]۔

تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپ نے کیے تھے،

تزویج خدیجہؓ

حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں، ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپ کی چچیری بہن تھیں، ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولتمند تھیں، طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا،

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قوموں میں آپ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آئے تھے

۱؎ ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۹۳، ۲؎ اصابہ (ج ۵ ص ۲۵۵) ترجمہ حضرت قیس بن سائب۔

اس بنا پر آپ کے حسن معاملہ، راستبازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک کہ زبانِ خلق نے آپ کو امین کا لقب دے دیا تھا، حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ میرا مالِ تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں، آپ کو اس کا مضاعف دوں گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا، اور مالِ تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں، اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے خود براہِ راست تمام مراتب طے کیے، تاریخ معین پر ابو طالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے، ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا، اور پانسو درہم طلائی مہر قرار پایا،

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد زندہ تھے، اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے، جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں،

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بتصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد جنگ فجار کے قبل انتقال کر چکے تھے،

حضرت خدیجہؓ جس مکان میں رہتی تھیں، وہ آج بھی (حسب بیان مورخ طبری) ان ہی کے نام سے مشہور ہے، امیر معاویہؓ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا،

شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی، اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے،[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیمؑ کے حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے ہوئی، ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے،

جستہ جستہ واقعات یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لیے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لیے ان کو عام سلسلہ سے الگ یکجا لکھنا زیادہ موزون ہوگا،

حدود سفر اہل مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کیے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے، عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے، ان میں سے حباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے،

---

[1] حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلاف اجمال و تفصیل و اثبات و نفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول صفحہ ۲۴۲ سے ۲۳۰ تک دیکھنا چاہیے، حضرت خدیجہؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری نے کیا ہے، مسند ابن حنبل (مسند ابن عباسؓ) میں بھی واقعات مذکور ہیں

جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے، اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے، اور ہر دفعہ حضرت خدیجہ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔[1]

نبوت کے بعد جس سال آپ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا "میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے"[2] مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے[3]، مورخ مذکور کو یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے، اور ڈیڈسی (بحر میت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے[4]،

---

[1] نور النبراس فی شرح ابن سید الناس۔ [2] مسند امام احمد بن حنبل، جلد ۴، صفحہ ۲۰۶ "س"۔ [3] مارگولیس صفحہ ۵۰۔

[4] یورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس آرائی پر ہوتی ہے، اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مصر جانا درحقیقت یہ ایک عہد عظیم کی مضحکہ انگیز روایت ہے، بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا، لیکن اگر بحرین تشریف لے گئے ہوں (روایت صحیح ہے) تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحر میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان ہے، جہاں سے آپ کی تجارت کے قافلے گزرتے رہے ہوں گے، "س"

مراسم شرک سے اجتناب | یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپ بچپن اور شباب میں بھی جب منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے،

ایک دفعہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپ نے کھانے سے انکار کیا،[1] نصاری نے دعوی کیا ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہد نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپ کا طرز عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ رکھا تھا، اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے، لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے،

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انھوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لیے آپ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا، اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ صحیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق

---

[1] صحیح بخاری باب مناقب زید بن عمرو بن نفیل، یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے، اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے جو اس روایت میں صاف ہو گیا ہے، مسند ابن امام حنبل (جلد دوم صفحہ ۱۸۹) میں ایک روایت ہے جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا، لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں معلوم اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے، عزیٰ ایک بت کا نام تھا

کی ہے لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے،

معاویہ بن صالح	اسمٰعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں،
یحییٰ بن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے،
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے،
نضر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے،
دارقطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لیے پسند نہیں کرتا،
سیف بن محمد	وہ جھوٹ حدیثیں بناتا ہے،
سلمہ بن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا،

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کر دی تھی، اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے۔[1] (مستدرک حاکم جلد سوم ذکر زید بن حارثہ۔ "س")

---

[1] مسٹر مارگولیس نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعوی سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کر لیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا" مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں،

حدثنی جار لخدیجہ بنت خویلد انہ سمع	"مجھ سے خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہمسایہ نے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یقول لخدیجۃ ای	بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب کو حضرت خدیجہؓ سے
خدیجۃ واللہ لا اعبد اللات والعزی واللہ	یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ بخدا کبھی لات اور عزیٰ کی

موحدین کی ملاقات

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے توحید کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث، زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی سے انکار کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے ملاقات کی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری میں ہے، ورقہ عیسائی ہوگئے تھے، اور چونکہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، اور مکہ ہی میں رہتے تھے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ آپ ان سے بھی ملے ہوں گے، لیکن روایتوں سے ان کی [illegible]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۲) لا عبداللات قال تقول محمد خل اللات خل العزی قال کانت صنمهم التی کانوا یعبدون ثم یضطجعون

[illegible] (یعنی اسکا ذکر بھی نہ کیجئے) اس نے کہا لات و عزیٰ وہ بت تھے جس کی پرستش اہل عرب کرتے تھے پھر [illegible]

ایک معمولی عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کانوا کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا، [illegible] اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات و عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت انکار مذکور ہے، مارگولیس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بکری ذبح کی تھی لیکن صاحب موصوف نے اسکی سند میں کوئی عربی ماخذ نہیں پیش کیا بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولیس کی کتاب صفحہ [illegible])، معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے، جو مشہور دروغ گو ہے۔

۱؎ ابن ہشام صفحہ [illegible] میں قس بن ساعدہ کے سوا باقی سب لوگوں کے نام اور حالات مذکور ہیں، زید کا ذکر بخاری میں بھی ہے، قس کا ذکر نہایت کثرت سے تمام تاریخوں اور ادب کی کتابوں میں پایا جاتا ہے

آپ کی دوستی تھی،

ادب و محدثین حضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے، اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفیٰ ہیں، اس لیے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی سے لیا ہے، چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں:-

ایھا الناس اسمعوا وعوا، واذا وعیتم فانتفعوا، انہ من عاش مات، ومن مات فات وکل ما ھو آت آت، مطر ونبات، وارزاق واقوات، وآباء وامھات، واحیاء واموات، وجمیع واشتات، ان فی السماء لخبرا وان فی الارض لعبرا، لیل داج، وسماء ذات ابراج، وبحار ذات امواج، مالی اری الناس یذھبون فلا یرجعون، ارضوا بالمقام فاقاموا، ام ترکوا ھناک فناموا، ... منتد، وزخرف ونجد، وعد المال والولد،

تن من بغی وطغی

قس بن ساعدہ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر و مطول بہ عبارات مختلفہ بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے، لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے رواۃ عموماً ناقابل سند بلکہ کذاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو جمع کرکے ان کے رواۃ سے بحث کی ہے، اور علامہ ذہبی اور ... ابن حجر وغیرہ کے

اقوال تفصیل سے نقل کیے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک طریق کے راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ "کذاب اور خبیث ہے" ابن عدی نے لکھا ہے کہ "ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے" ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرۃ ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ "ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا یا اور لوگ اس کے لیے بنا دیا کرتے" ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبد اللہ اور احمد بن سعید ہیں اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے جس میں حضرت ابو بکرؓ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری مصنوعی ہے[2] حافظ ابن حجر نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کیے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے[3]

---

[1] یہ پوری تفصیل اللآلی المصنوعہ مطبوعہ مصر صفحہ [illegible] میں ہے [illegible] دیکھنے کے قابل ہے [illegible] بنوامیہ و بنو عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ [illegible] اور خطبے مصنف کر [illegible] بن اسحاق اس [illegible]

[2] علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر صفحہ [illegible]) میں خطبہ [illegible] [3] [illegible] شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دیدیتے تھے کہ ان [illegible] اشعار [illegible] کتاب میں شامل کر دیتے تھے ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ ابو بکرؓ [illegible] اشعار نقل کیے ہیں جن کی زبان اور طرز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر خود ان پر نقد و جرح کرتے ہیں [illegible] اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں، مثلاً سریۂ عبیدہ بن الحرث میں (ابن ہشام جلد [illegible] صفحہ [illegible] مطبوعہ مصر) حضرت ابو بکر [illegible]

احباب خاص نبوت سے پہلے جو لوگ آپ کے احباب خاص تھے، سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے، ان میں سب سے مقدم حضرت ابوبکرؓ تھے جو ہر سون آپ کے شریک

(طبقات ص ۱۹۵) کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے۔

واکثر اهل العلم والشعر ینکرہ هذہ القصیدة لابی بکر	اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکرؓ کا ہے،

یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان جلسوں یا شعروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی پیشینگوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً یہی قس بن ساعدة کا خطبہ، اس میں یہ فقرے بھی ہیں،

نبیا قد حان حینه واظلکم اوانه فطوبی لمن آمن به فهداہ وویل لمن خالفه وعصاہ (اللآلی المصنوعہ ص ۳۸)	ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آگیا ہے، سو اس کو مبارک ہے جو اس پر ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا، اور تباہی ہے اس کے لیے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کریگا،

ابو طالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام صفحہ ۱۹۰ و ۴۹) سرتاپا موضوع ہے، اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

نا صبح فینا احمد فی ارومه — تقصر عنه سورة المتطاول

فایدہ رب العباد بنصرہ — واظهر دینا حقه غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنفؒ نے کہا ہے، اکثر کہنا صحیح ہے، کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں، مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاستسقاء، خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے وبعض اهل العلم بالشعر ینکر اکثرها یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے تھے، س)، اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں، ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں، ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں مثلاً

فقلت له اذهب بهرون فادعوا — الی الله فرعون الذی کان طاغیا

وقولا له انت رفعت هذہ — بلا عمد ارفق اذا بك بانیا

وقولا له انت سویت وسطها — منیراً اذا ما جنه اللیل هادیا

صحبت رہے۔[1] حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی احباب خاص میں تھے، حرم کا منصب رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا، دار الندوہ کے بھی یہی مالک تھے، چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا، لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں ۵ برس بڑے تھے،[2]

اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے، ایک دفعہ کعبہ میں ذویزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلہ تھا، انھوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کریں، آپ نے فرمایا کہ میں مشرکوں کا ہدیہ نہیں قبول کرتا، البتہ قیمت ہو تو لے سکتا ہوں، مجبور ہو کر انھوں نے قیمت لینی گوارا کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لے لیا،[3] ۱۷۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۵) ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزون کیا گیا ہے" (صفحہ ۲۰ تا صفحہ ۴۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر نہ تھے، بلکہ جاہلیت کے خطب، اور شعراء کے معتقدات اور خیالات کو طرز تک اخذ کرتے تھے لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لیے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو بھی بد مذاقی پر خود شرم آئے گی،

[1] اصابہ ذکر حضرت ابوبکرؓ، حضرت ابوبکرؓ کا نام عبد اللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکرؓ کا حال لکھا ہے جلد ۲ صفحہ ۳۴۱ (۳) ص۔ [2] اصابہ ذکر حکیم بن حزام (ج ۱ ص ۳۴۹)۔ [3] مسند امام حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۰۲

حضرت ضماد بن ثعلبہ، جو ازد کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جراحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ آنحضرت کے احباب خاص میں سے تھے. نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھکر ضماد نے یہی قیاس کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا محمدؐ! میں جنون کا علاج کرسکتا ہوں، آپ نے حمد و ثنا کے بعد چند فقرے کہے، وہ سنتے ہی ضماد مسلمان ہوگئے، اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی نے بھی لکھا ہے، لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد حنبل (جلد ۱ صفحہ ۳۰۲) میں ہے،

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے، ان میں سے ایک صاحب قیس بن سائب مخزومی تھے، مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر گذرے ہیں، ان ہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکا کے ساتھ آپ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا،[1]

---

[1] استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۳۱، اسد الغابہ (و اصابہ)

آفتابِ رسالت کا طلوع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں پیدا ہوئے مذہب پرستی کا مرکزِ اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ[۱] بت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا منصبِ امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے، باایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا، دیگر رسوم جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایام حج میں قریش کے لیے عرفات جانا ضرور نہیں، اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں، وہ قریش کا لباس اختیار کریں ورنہ اُن کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا، چنانچہ اسی بنا پر طوافِ عریاں کا عام رواج ہو گیا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہیں دیا[۲]

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان سرائی کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آگئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی[۳]

۱؎ ابن ہشام مطبوعہ مصر ۱۲۹۵ھ جلد اول ص ۰۰ ۲؎ ابن ہشام ص ۱۰۱ ۳؎ بزار و طبرانی بحوالہ خصائص کبریٰ سیوطی ج ۱ ص [illegible]
ص ۸۰ و خصائص کبری سیوطی ج ۱ ص ۸۰

ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اُس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا، لیکن دونوں دفعہ توفیقِ الٰہی نے بچا لیا کہ تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے۔[۱]

یہ فطرتِ سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا لیکن ایک شریعتِ کبریٰ کی تاسیس، ایک مذہبِ کامل کی تشئید اور رہنمائی کونین کے منصبِ عظیم کے لیے کچھ اور درکار تھا، اسی زمانہ میں قریش میں اور حق پرستوں ورقہ، زید، عثمان بن حویرث، کے دل میں خیال آیا کہ جمادِ لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے، چنانچہ سب مذہبِ حق کی تلاش کے لیے نکلے، لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا کر رہ گئے، ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے، اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے "اے خدا! اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقہ سے پوجنا چاہیے تو میں اُسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے دنیاوی تعلقات تھے، تجارت کا کاروبار تھا، متعدد بیبیاں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دستِ قدرت کو جو کام لینا تھا وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا، دنیا اور دنیا کے تمام کام آپ کو ہیچ نظر آتے تھے تاہم مطلوبِ حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں، آپ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف

---

[۱] مارگولیس صاحب مصنف لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھتے ہیں "ہماری تمام تصنیفات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مورخ اور سوانح نگار آپ کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہلِ مکہ میں کمیاب تھی متفق ہیں۔"

ماتے، اور پھر واپس جاکر مراقبہ مین مصروف ہوتے،

صحیح بخاری مین ہے کہ غار حرا مین آپ تحنّث یعنی عبادت کیا کرتے تھے، یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بخاری مین ہے،

تین ما کان صفۃ تعبّدہ اجیب	یہ سوال کیا گیا ہو کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟
بان ذلک کان بالتفکر والاعتبار	جواب یہ ہو کہ غور و فکر اور عبرت پذیری،

یہ وہی عبادت تھی جو آپ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی، ستارون کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظرون سے غائب ہو گئے تو بیساختہ پکار اٹھے،

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ......	مین فانی چیزون کو نہین چاہتا......
اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ	مین اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہون جسنے
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام-۹)	زمین و آسمان پیدا کیا،

ایک مغربی مورخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے،

"سفر و حضر مین ہر جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل مین ہزارون سوال پیدا ہوتے تھے: مین کیا ہون؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ مین کن چیزون کا اعتقاد کرون؟ کیا کوہ حرا کی چٹانین، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیان، کھنڈر اور میدان کسی نے ان سوالون کا جواب دیا، نہین ہرگز نہین، بلکہ گنبد گردان، گردش لیل و نہار،

چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپؐ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے تھے، بعینہٖ وہی پیش آتا تھا، ایک دن جب کہ آپؐ حسب معمول غار حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے،

اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ	پڑھ اُس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا،
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَءْ	جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ	تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے
بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ	ذریعہ سے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ
يَعْلَمْ، (اقرء)	باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں،

آپؐ گھر واپس تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے،

آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عبری زبان جانتے تھے، اور توریت و انجیل کے ماہر تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا،

لے کار ڈاول ہیرو زتذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ وحی کے انواع میں کہ یک خواب بھی ہے، صحیح بخاری کی شروع میں ہے اول ما بدء بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحۃ فی النوم، بخاری کتاب التعبیر میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے، صحیح بخاری باب بدء الوحی وکتاب التعبیر، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے لیکن حضرت عائشہؓ اس وقت پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں لیکن صحابہ کی مرسل محدثین کے نزدیک قابلِ حجت ہے کیونکہ متروک راوی بھی صحابیؓ ہی ہوں گے،

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر پیدا ہوا حضرت خدیجہ نے کہا کہ آپ متردد نہ ہوں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔" پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلاشبہ یہ الفاظ نکلے: "مجھ کو ڈر ہے" لیکن یہ تردد وہیبت، یہ اضطراب، جلالِ الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بارِ گراں کی عظمت کا تخیل تھا) آپ نے کیا دیکھا؟ ناموسِ اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری باب التعبیر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں، دفعۃً حضرت جبرئیل نظر آتے تھے اور کہتے تھے "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو" اس سے آپ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی، لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لیے رک جاتی تھی تو پھر آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے، اور پھر حضرت جبرئیل نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصہ اوّل کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے، اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے"، پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ "نبوت ایک امرِ عظیم ہے، اس کا تحمل دفعۃً نہیں ہو سکتا، اس لیے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب

کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعۃً فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے، حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپ کو پورا یقین ہو گیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں،

فلما سمع کلامہ ایقن بالحق	جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا
واعترف بہ	یقین آگیا، اور آپ نے اس کا اعتراف کیا،

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "وحی بار بار اس لیے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۱؎"

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ "نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے، اس کی تمام شاخیں آپ پر جھک آئیں جیسے بحیرا نے آپ کے نبی ہونے کا یقین کیا" جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا" جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ "نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلایش نکال کر پھینک دی" تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اس قدر خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا، اور آپ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے، اور بار بار حضرت جبریلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر

۱؎ فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۲، مطبوعہ مصر،

کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا، حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سنی کہ "میں خدا ہوں" تو کیا انکو کوئی شبہ پیدا ہوا؟

حافظ ابن حجرؒ وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں، یہ روایت امام زہریؒ کے بلاغات میں سے ہے، یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں، اگر آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں، تو مشکل نہ تھی لیکن خاتم انبیا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کیلئے صرف وہ لوگ انتخاب کیے جا سکتے تھے، جو فیضیاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپ کی حرم محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے، جو آپ کی آغوش تربیت میں پلے تھے

زیدؓ تھے، جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے، حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسون سے فیضیاب خدمت تھے، سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا، وہ سننے سے پہلے مومن تھین، پھر اور بزرگون کی باری آئی، اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے،

حضرت ابوبکرؓ دولتمند، ماہر انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ مین ان کا عام اثر تھا، اور معززین شہر ان سے ہر بات مین مشورہ لیتے تھے، ارباب روایت کا بیان ہے کہ اکابر صحابہؓ مین سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران، حضرت طلحہؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے، ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگون مین بھی پھیلا، اور مسلمانون کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان سابقین اولین مین عمارؓ، خبابؓ بن الارت، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہؓ، ارقمؓ، سعید بن زید، عبداللہ ابن مسعودؓ، عثمان بن مظعونؓ، عبیدہؓ، صہیبؓ، رضی زیادہ ممتاز ہین،

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، نماز کا جب وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑ کی گھاٹی

۱؎ اصابہ فی احوال الصحابہ مین بزرگان موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہیے ۲؎ دیکھو ریاض النضرۃ المحب الطبری مطبوعہ مصر صفحہ ۵۰

مین چلے جاتے اور وہان نماز ادا کرتے، ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ حرم ہی مین ادا کرتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب مین بھی جائز تھی[1]، ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کیساتھ کسی درہ مین نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپ کے چچا ابو طالب آنکلے، اُن کو اس جدید طرز عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہوگئے اور بغور دیکھتے رہے، نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون دین ہے؟ آپ نے فرمایا ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا، ابو طالب نے کہا مین اس کو اختیار تو نہین کرسکتا لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہوسکے گا،

یہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے، اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصون مین آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہین نگاہ ڈال لینی چاہیے، یعنی یہ کہ اوائل اسلام مین جب کہ اسلام لانا جان ومال کا ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟

اس زمانہ مین جو لوگ اسلام لائے، ان مین چند خصائص مشترک تھے، اسی قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص اُن لوگون مین بھی پائے جاتے تھے جنھون نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے،

(۱) اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاش حق مین سرگردان اور فطرۃً نیک طبع اور پاکیزہ اخلاق تھے، مثلاً حضرت ابو بکرؓ جاہلیت مین بھی عفیف، پارسا اور صدق ودیانت مین مشہور تھے، عثمان بن مظعونؓ صوفی مزاج تھے، اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے،

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۲ ذکر الاختلاف فی اول من اسلم " " ق

اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بنجائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا صہیبؓ عبد اللہ ابن جدعان کے تربیت یافتہ تھے، جو اسلام سے پہلے تارک شراب ہو کر وفات پاچکے تھے، حضرت ابو ذرؓ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا، ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے، اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح سے ان کے ذہن میں آتا تھا، خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال سنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سنیں، واپس جاکر ابو ذرؓ سے کہا کہ "میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں، وہ مکارم اخلاق سکھاتا ہے، اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔" ابو ذرؓ کو تسکین نہیں ہوئی، خود مکہ میں آئے، زبان مبارک سے آپ کا ارشاد سنا اور اسلام قبول کر لیا، وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ (مسلمان کیلئے زر و مال جمع کرنا جائز نہیں) چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں انکو مدینہ سے دور بھیجدیا تھا۔[1]

(۲) بعض صحابہؓ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے، اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے، اور اس لیے تلاش حق میں سرگردان تھے، ان ہی میں زیدؓ بھی تھے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، انھوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] حضرت ابو ذرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے، لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں سے کچھ کچھ لیا ہے، لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔

کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے، وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ان کو وہ رہنما ہاتھ آگیا جس کی جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے، اور وہ اب تک سرگشتہ تھے،

(۳) یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابو فکیہہ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت وجاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنس کر کہتے۔

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا	یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے،
(انعام - ۱)	

کفار کے نزدیک ان کا افلاس ان کی تحقیر کا سبب تھا، لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آسکتی تھی، دولت ومال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کرچکا تھا، فخر وغرور ان کو انقیاد حق سے روک نہیں سکتا تھا، ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصب عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض ان کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے، اور حق کی شعاعیں ان پر دفعتہً پرتو افگن ہوسکتی تھیں یہی سبب ہے کہ انبیاءؑ کے ابتدائی پیرو ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے ہیں، عیسائیت کے ارکان دین ماہی گیر تھے، حضرت نوحؑ کے مقربین خاص کی نسبت کفار کو علانیہ کہنا پڑا۔

وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ	اور ہم تو جہاں تک دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی

هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا	ان ہی لوگوں نے کی جو، ذلیل ہیں اور ہم تو
نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ	تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو
نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ (ہود - ۳)	یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو،

سابقین اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں، جور و ظلم کے شدائد اور دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز اُن کو متزلزل نہ کرسکی، اور آخر ان ہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ دیا،

تین برس تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہوچکا تھا، صاف حکم آیا،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر - ۶)	اور تجھکو جو حکم دیا گیا ہے وہ شگاف کہدے،

اور نیز حکم آیا،

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء - ۱۱)	اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش! لوگ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین کرو گے؟" سب نے کہا ہاں، کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے۔" آپ نے فرمایا "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا۔" یہ سن کر سب لوگ

جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا، سخت برہم ہو کر چلے گئے (صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۰۲)

چند روز کے بعد آپ نے حضرت علیؓ سے کہا کر دعوت کا سامان کرو، یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندان عبد المطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابو طالب، عباس سب شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے، اس بار گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا" تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعۃً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں، اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا"

قریش کے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں، حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا،

اب مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت تیار ہوگئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا، کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لیے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہوگئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی،

(۱) طبری نے تاریخ ج ۳ صفحہ ۱۱۷۱، اور تفسیر ج ۱۹ صفحہ ۷۰ میں عبد الغفار بن قاسم [illegible] سے اس کو روایت کیا ہے، یہ پکا شیعی، اور متروک ہے، اور وہ مزید بہ سبب اس روایت میں [illegible]

(۲) اصابہ فی احوال الصحابہ تذکرہ حارث بن ابی ہالہ،

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب	مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی، قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا، اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایگانِ خدا یا آل اللہ

یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے، اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے، اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا، یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کیے گئے، جن کی تفصیل یہ ہے:

منصب[1]	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون منصب حاصل تھا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر ممتاز تھے،
حجابۃ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبرگیری	خاندانِ نوفل	حرث بن عامر
سقایۃ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندانِ ہاشم	حضرت عباسؓ
مشورہ		خاندانِ اسد	یزید بن ربیعۃ الاسود
دیات ومغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندانِ تیم	حضرت ابوبکرؓ
عُقاب	علم برداری	خاندانِ امیہ	ابوسفیان
قبۃ	خیمۂ خرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندانِ مخزوم	ولید بن مغیرہ
سفارت	سفیر ہوکر جانا اور جن قبیلوں میں یہ نزاع	خاندانِ عدی	حضرت عمرؓ
منافرت	پیش آئے کہ شریف تر کون ہے اس کا فیصلہ کرنا		
ازلام وایسار	محکمۂ فال کا انتظام	خاندانِ جمح	صفوان بن امیہ

[1] یہ تمام تفصیل عقد الفرید ج ۲ ص ۳۰۰ مصر میں ہے،

حارث بن قیس	خاندانِ سہم	مہتمم خزانہ	اموال

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت و اقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا، ان کے نام یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہؓ کے باپ)	حربِ فجار میں ان ہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا،
ابولہب (آنحضرت ﷺ کا چچا)	
ابوجہل	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار،
ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ)	قریش کا رئیس اعظم تھا،
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمروؓ بن العاص کا باپ)	نہایت دولتمند، کثیر الاولاد اور صاحبِ اثر تھا،
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہؓ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحبِ ریاست تھا،

ان کے سوا، اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدۃ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط صاحبِ اثر تسلیم کیے جاتے تھے،

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خاندانِ ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے، اور دونوں میں مدت سے رشک و رقابت چلی آتی تھی،

پہلا سبب

ناتربیت یافتہ اور تندخو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی رسم و عقائد کے خلاف ہو، ان کو سخت برہم کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی، اور ان کی تشنگی انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی، آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے، لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے، اور حکومت موجودہ اگر منتظم اور صاحبِ

جہ ضرورت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی مین مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودون سے مزین تھی، جن مین ہبل خداے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادین دیتے تھے، معرکہ ہاے جنگ مین فتحین دلاتے تھے، خدا، یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجود معطل تھا،

دوسرا سبب

اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت و اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لیے قریش نے شدت سے مخالفت کی، اور ان مین جن لوگون کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر مخالفت مین زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حرب فجار مین وہی سپہ سالار اعظم تھا، لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصب عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہین رکھتا تھا، اس لیے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا، اور وہ بھی قریش مین امتیاز رکھتا تھا،

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا، خاندان ہاشم مین سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا،

قبیلہ سہم مین سب سے زیادہ با اثر عاص بن وائل تھا، جو نہایت دولتمند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنانِ حکومت ان ہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی، اور یہی لوگ تھے جنھوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی، قریش کے اور اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط ان ہی لوگوں کے زیر اثر تھے، اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں اُن کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں،

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا،

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا
عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ	تو ان دو شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیس اعظم
(زخرف - ۳۰)	پر اترنا تھا (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لیے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی)، یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہ ہو، وہ عالم آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے،

ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی،

قریش میں اوصاف مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے، وہ ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپ کا دامن پاک تھا، اور اولاد ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب
قریش کو عیسائیون سے بالطبع نفرت تھی، جس کی وجہ یہ تھی ابرہۃ الاشرم (بادشاہ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیون کے مقابلہ مین پارسیون کو زیادہ پسند کرتے تھے، اور ایران و روم کی جنگ مین ایرانیون کو فتح ہوئی، تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیت اتری،

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ	قریب کے ملک مین رومی مغلوب ہو گئے لیکن
وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ	یہ مغلوب ہونے کے بعد چند سال مین پھر
فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ	غالب آجائین گے، خدا ہی کو اختیار ہے
قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ	پہلے بھی اور پیچھے بھی، اور تب مسلمان اللہ
يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ (روم ۱)	کی مدد سے خوشی منائین گے،

اسلام اور نصرانیت مین بہت سی باتین مشترک تھین، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ مین اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا، اور مدینہ منورہ مین بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہین،

چوتھا سبب
ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی، قریش مین دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے، بنو ہاشم و بنو امیہ، عبد المطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد اس خاندان مین کوئی صاحب اثر نہین پیدا ہوا، ابو طالب دولتمند نہ تھے، عباس دولت مند تھے، لیکن فیاض نہ تھے، ابو لہب بد چلن تھا، اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جا تا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو

خاندانِ بنوامیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کین، اور وہی ان لڑائیون مین رئیسِ لشکر رہا،

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا، اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت مین آپؐ کے دوشِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی، اُموی تھا،

بنوامیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا، وہ بنی مخزوم تھے، ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لیے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی، ابوجہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے، ایک دفعہ اخنس بن شریق ابوجہل کے پاس گیا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ ابوجہل نے کہا ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آل ہاشم) ہمیشہ حریفِ مقابل رہے انھون نے مہمانداریان کین تو ہم نے بھی کین، انھون نے خون بہا دیے تو ہم نے بھی دیے، انھون نے فیاضیان کین تو ہم نے ان سے بڑھ کر کین، یہان تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعویدار ہین، خدا کی قسم ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہین لا سکتے[۱]۔

پانچوان سبب

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش مین سخت بداخلاقیان پھیلی ہوئی تھین، بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیون کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندانِ ہاشم مین

---

[۱] ابن ہشام صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ مصر۔

سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزالِ زرین چرا کر بیچ ڈالا تھا،[1] اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر اربابِ جاہ مختلف قسم کے اعمالِ شنیعہ میں گرفتار تھے، آنحضرت ﷺ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دار و گیر کرتے تھے، جس سے اُن کی عظمت واقتدار کی شاہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں، اور گو طریقۂ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ	اور اُس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات میں قسم
هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ	کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے، چغلیاں لگاتا
مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ	ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ
زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ	گیا ہے، بدکار ہے، تندخو ہے، اور ان سب باتوں کے ساتھ
(سورهٔ قلم ۱)	جھوٹا نسب بتاتا ہے، ایسے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے،
كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ	وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسکی پیشانی کے
نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (سورهٔ علق)	بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو کہ جھوٹی اور خطاکار ہے،

[1] حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کردیا، یہ واقعہ عموماً تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (صفحہ ۵۵، مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے،

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن، ت کی عربی نخوت، دولت و قبضہ کا فخر، ریاست کا زعم ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوتی وہ باخبر نہ ہوتے، اس لیے بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کیے جاتے تھے،

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا	مجھ کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو، مین نے اسکو
وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا	پیدا کیا، پھر بہت سا مال دیا، بیٹے دیئے
وَبَنِينَ شُهُودًا وَمَهَّدْتُ	سامان دیا، پھر چاہتا ہے کہ ہم اس کو
لَهُ تَمْهِيدًا، ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ	اور دیں، ہرگز نہین، وہ ہماری آیتون
أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۝	کا دشمن ہے،

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے جو قریش کا سرتاج تھا، اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ و اقتدار حاصل نہ تھا۔

لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی، اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکسان تھا، یہ تھا کہ جو معبود سیکڑون برس سے عرب کے حاجت روا عام تھے، اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام و نشان مٹاتا تھا، اور ان کی شان مین کہتا تھا۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ	بلاشبہ تم اور جن چیزون کو تم خدا کو چھوڑ کر
اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاء)	پوجتے ہو سب دوزخ کے ایندھن ہونگے،

ان اسباب کے ساتھ جن مین سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لیے قریش کے تحمل کے اسباب

کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلانِ دعوت کے ساتھ سخت خونریزیاں شروع ہو جائیں لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا، اور اس کے ناگزیر اسباب تھے، قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے، اور حربِ فجار کے بعد اس قدر عاجز آگئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ بندی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا، اور جب تک بدلا نہ لے لیا جائے، یہ آگ بجھ نہیں سکتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لیے نہایت آسان تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے، اور سلسلہ بسلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا، بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے، اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں اس لیے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا، بلکہ سیکڑوں تھے، اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا،

رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی[1] سے طے ہو جائے۔

غرض جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززین نے ابوطالب سے آکر شکایت کی، ابوطالب نے

---

[1] یہ آیت خاص انہی لوگوں کی شان میں ہے، یَنْهَوْنَ عَنْهُ وَیَنْئَوْنَ عَنْهُ، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کو تو لوگوں کو منع کرتے ہیں، لیکن آپ کی دعوت سے خود دور بیٹھے تھے: (اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق) " س"

نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اداے فرض سے باز نہ آسکتے تھے، اس لیے یہ سفارت دوبارہ ابو طالب کے پاس آئی، اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابو سفیان، عاص بن ہشام، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آبا و اجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لیے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ، یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابو طالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے، قریش اب تحمل نہیں کر سکتے، اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر لفظوں میں کہا کہ "جان عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے، ابو طالب تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا:
"خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند لا دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔" آپ کی پر اثر آواز نے ابو طالب کو سخت متاثر کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور دعوت اسلام میں مصروف رہے، قریش گرچہ

---

[1] ابن ہشام صفحہ ۸۹۔ امام بخاری نے بھی تاریخ میں [illegible]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں، انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کر سکتا ہے، قریش نے بھی یہی خیال کیا، اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا "محمد کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں، اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے لیکن ان باتوں سے باز آؤ" عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ	اے محمد کہہ دے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں،
اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا	مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے،
اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حم ۔ سجدہ)	بس سیدھے اسی کی طرف جاؤ، اور اسی سے معافی مانگو
قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ	کہہ دے کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے
الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ	دو دن میں یہ زمین پیدا کی، اور تم خدا کے نظیر
اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (حم ۔ السجدہ)	قرار دیتے ہو، وہی سارے جہان کا پروردگار ہے،

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جاکر کہدیا کہ "محمد جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو اُن کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آجائیں گے تو یہ تمھاری عزت ہے، ورنہ عرب اُن کو خود فنا کردے گا" لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی،

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام سنہ ہجری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپ سے خاص محبت تھی، وہ آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے، اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثوبیہ کا دودھ پیا تھا، اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، اُن کا مذاق طبیعت سپہگری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لیکر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جماکر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جاسکتا تھا، ایک دن ابوجہل نے، نہایت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا، حضرت حمزہؓ غصہ سے بیتاب ہوگئے، تیر و کمان ہاتھ میں لیے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا "میں مسلمان ہوگیا ہوں"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوش حمایت میں انھوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا، لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے[1]، وہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

[2] حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے، حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیمؓ بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے، ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے، لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے، اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لے لوں تو پھر ماروں گا" لبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا، اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے، آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا، سیدھے

---

[1] حضرت حمزہؓ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف روض الانف میں دیکھا ہے۔

[2] حضرت عمرؓ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا تھا، اسی کو بعینہ یہاں نقل کر دیا ہے کہیں کہیں بعض الفاظ بدل دیے ہیں۔ (جامع نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبی جلد سوم باب استجابت دعا میں مفصل درج کر دی ہیں، وہاں دیکھی جائیں۔ "س")

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے، کارکنان قضا نے کہا ع آمد آں یار کہ ما می خواستیم۔
راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبد اللہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انھوں نے کہا "پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود
تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں"، فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی
تھیں، ان کی آہٹ پاکر چپ ہو گئیں، اور قرآن کے اجزا چھپا لیے، لیکن آواز ان کے
کانوں میں پڑ چکی تھی بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں، انھوں نے کہا میں
سن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہکر بہنوئی سے دست و گریباں ہوئے،
اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا،
لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی، بولیں کہ عمر جو بن آئے کرو، لیکن اسلام اب دل
سے نکل نہیں سکتا؛ ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت
کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھکر اور بھی رقت ہوئی، فرمایا تم لوگ جو پڑھ
رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہؓ نے قرآن کے اجزا سامنے لاکر رکھ دیے، اٹھا کر دیکھا تو سورہ تھی،

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (حدید۔ ۱) — پڑھتا ہے، اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے،

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (حدید) — خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ	میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا
اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ	نہیں اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں،

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے، حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے صحابہؓ کو تردد ہوا، لیکن حضرت امیر حمزہؓ نے کہا "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا" حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے، اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا، "کیوں عمر کس ارادہ سے آیا ہے" نبوت کی پرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ "ایمان لانے کے لیے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے، اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔[1]

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا، اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ سید الشہداءؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائض مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے، اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے ساتھ دفعۃً یہ حالت بدل گئی، انھوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے دل اول بڑی شدت کی

[1] انساب الاشراف بلاذری وطبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و کامل ابن الاثیر

لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہان تک کہ مسلمانون کی جماعت کے ساتھ کعبہ مین جاکر نماز ادا کی، ابن ہشام نے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی ان الفاظ مین روایت کیا ہے،

فلما اسلم عمر قاتل قریشا حتی	جب عمرؓ اسلام لائے تو قریش سے لڑے،
صلی عند الکعبة وصلّینا معه	یہان تک کہ کعبہ مین نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگون نے بھی پڑھی،

صحیح بخاری مین ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اتفاق سے عاص بن وائل آنکلا، اس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے، لوگون نے کہا عمر مرتد ہوگئے، عاص ابن وائل نے کہا، اچھا تو کیا ہوا، مین نے عمر کو پناہ دی،

تعذیب مسلمین رسوخ عزم، قوت ارادہ، شدت عمل، انسان کے اصلی جوہر ہین، اور داد کے قابل ہین، لیکن ان ہی اوصاف کا رخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کرلیتے ہین،

اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا، [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ کو ان کے قبیلون نے اپنے حصار حفاظت [illegible] جوش وغضب ہر طرف سے سمٹ کر ان غریبون پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان مین کچھ غلام اور کنیزین تھین، کچھ غریب الوطن تھے جو دو ایک [illegible] تھے، اور کچھ کمزور قبیلون کے آدمی تھے جو کسی قسم کی [illegible] قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور وستم کی تاریخ [illegible] قریش کی یکتائی کی تحریری

یہ ممکن تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعۃً پاک کر دی جاتی،
لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اتر نہیں سکتا تھا، مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم
رہ کر پیوند خاک کر دیے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ
ان بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا، قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی،
جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے ہٹ کر پھر قریش کے مذہب میں آجاتے، یا شاید ان کو
مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اس کی داد دینا منظور تھا،

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل وقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں
کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آباؤ اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابل
احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے
تھے، اور کہتے تھے کہ چند خام طبیعتوں کے دماغ میں خلل آگیا ہے، عتبہ، عاص بن وائل
وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے، لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا،

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہرحال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے، جب ٹھیک دوپہر
ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے
وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر
رکھ دیتے کہ کروٹ نہ لینے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے
اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے،

لہ یہ واقعات طبقات ابن سعد، سیرۃ ابن ہشام وغیرہ میں بہ تفصیل لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور جلد ثالث تذکرۂ صحابۂ بدر

مصیبتیں اگرچہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے ان کے نام یہ ہیں،

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے گھر میں مقیم رہے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی[۱] حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کی بقایا تھی، مانگتے تو جواب دیتا جب تک محمدؐ کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ دے گا، یہ کہتے کہ نہیں، جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں[۲])

حضرت بلالؓ، یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ، ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے "احد احد" کا لفظ نکلتا، جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا،

---

[۱] طبقات ابن سعد جلد سوم تذکرۂ خبابؓ [۲] صحیح بخاری صفحہ ۲۰۰۲ (ج ۲ ص)

وہ ان کو دہکتی ہوئی ریت پر لٹا کر اس طرح دیر تک گھسیٹتے پھرتے تھے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی احد احد۔

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے، ان کے والد "یاسر" مکہ میں آئے، ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سمیہ نامی سے ان کی شادی کر دی، عمار اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے، اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا،

حضرت سمیہؓ، حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، ان کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور ہلاک ہوگئیں،

حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہوگئے،

حضرت صہیبؓ رومی مشہور ہیں لیکن درحقیقت رومی نہ تھے، ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے، اور ان کا خاندان موصل میں آباد تھا، ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے، ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے، یہ روم میں پلے، اس لیے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے، ایک عرب نے ان کو خریدا، اور مکہ میں لایا یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر کے آزاد کر دیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمارؓ بن یاسر ایک ساتھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہوگئے[1]،
قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے جب انھوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، انھوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا،

حضرت ابو فکیہہؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے، اور حضرت بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے، امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پاؤں میں رسی باندھی، اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لیجائیں، اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں، ایک "گبریلا" راہ میں جا رہا تھا، امیہ نے ان سے کہا "تیرا خدا یہی تو نہیں ہے" انھوں نے کہا "میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے" اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ اُن کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھدیا کہ ان کی زبان نکل پڑی،

حضرت لبینہؓ، یہ بیچاری ایک کنیز تھیں، حضرت عمرؓ[2] اس بیکس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ "میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں، بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں"، وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ "اگر تم اسلام نہ لاؤ گے، تو خدا اس کا انتقام لے گا"

حضرت زنیرہؓ، حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں، اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام

[1] ابن الاثیر، ذکر تعذیب المستضعفین، ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمارؓ اس وقت ایمان لائے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقمؓ کے مکان میں چھپے ہوئے تھے، اور جب کہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے،

[2] حضرت عمرؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔

سے پہلے، ان کو جی کھول کر ستاتے تھے. ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں،

حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ، یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں، اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلی تھیں،

حضرت ابوبکرؓ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انھوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی حضرت بلالؓ، عامر بن فہیرہؓ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں پر خرید ا، اور آزاد کر دیا.

یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے،

حضرت عثمانؓ جو نہایت معزز اور صاحب جاہ و اعزاز تھے جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا[1] حضرت ابوذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا[2]، حضرت زبیر بن العوامؓ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کے ناک میں دھواں دیتے تھے[3]، حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی سعید بن زیدؓ جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا[4]، لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بیرحمیاں، یہ عبرت خیز ستمگاریاں ایک مسلمان کو بھی راہ حق

۱؎ طبقات ترجمہ عثمانؓ بن عفان ۲؎ بخاری ج ۱ ص ۵۴۴-۵۴۵ باب اسلام ابی ذرؓ ۳؎ ریاض النضرۃ لمحب الطبری ۴؎ بخاری ص ۵۴۵، (اس وقت تک حضرت عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے) "سہا"

سے تنزل و کرتے ہیں، ایک نصرانی مورخ نے نہایت سچ کہا،

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسائل نے وہ جوش دینی کا آپ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے.. جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا، اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے .. برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے، اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا"[۱]

ہجرت حبش سنہ نبوی قریش کے ظلم و ستم کا بازار جب بہت گرم ہوا تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاں نثاران اسلام کو اجازت دی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں۔ حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہل عرب حبش کے بادشاہ کو نجاشی[۲] کہتے تھے، اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی،

جاں نثاران اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے، اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجا لانا ممکن نہ تھا، اس وقت تک حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ادا کروں گا، لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ رحمٰن پڑھنا شروع کی،

۱؎ [illegible] ۲؎ نجاشی حبشی لفظ نجوس کی تعریب [illegible]

کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کیے، گرچہ انھون نے جہان تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے، (حضرت ابوبکرؓ جاہ و اقتدار مین دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے، لیکن آواز سے قرآن نہین پڑھ سکتے تھے، اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لیے آمادہ ہوگئے)

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہان جاتا وہان اسلام کی شعاعین خود بخود پھیلتی تھین،

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتون نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہین،

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفان،	مع اپنی زوجۂ محترمہ (حضرت) رقیہؓ کے، جو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی تھین،
۲۔ (حضرت) ابوحذیفہؓ بن عتبہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) سہلہؓ بنت سہیل تھا،	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، چونکہ سخت کافر تھا اس لیے ان کو گھر چھوڑنا پڑا،
۳۔ (حضرت) زبیرؓ بن العوام	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے
۴۔ (حضرت) مصعبؓ بن عمیر	ہاشم کے پوتے تھے،
۵۔ (حضرت) عبدالرحمٰنؓ بن عوف	مشہور صحابی اور عشرہ مبشرہ مین شمار کیے جاتے ہین قبیلہ زہرہ سے تھے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہالی رشتہ دار تھے،

۱ طبری ص ۱۱۸۳ [illegible] ۲ بخاری باب ہجرت حبشہ

٦- (حضرت) ابوسلمہؓ ابن عبدالاسد مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ (بنت ابی امیہ) کے	یہ ام سلمہؓ وہی ہیں جو ابوسلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں،
٧- (حضرت) عثمانؓ بن مظعون جمحی	مشہور صحابی ہیں، سابقین میں ہیں، بدر میں بھی شریک تھے، حضرت عثمانؓ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا (اصابہ)
٨- (حضرت) عامرؓ بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) لیلیٰؓ (بنت ابی حشمہ) تھا	ان کی ماں برہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی تھیں،
٩- (حضرت) ابوسبرۃؓ بن ابی رہم، (باقی)	یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے تھے،

(۱) حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے، ابن اسحٰق نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صحابہ کی ہجرت کا ذکر کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابوسبرہؓ اور حضرت ابوحاطبؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحٰق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلہ میں واقدی کی ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوئی کہ انھوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبشہ بتایا، لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی اضافہ کیا ہے (زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۴)، ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے (ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۶)، ابن سید الناس نے بھی بروایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے، مگر انھوں نے حضرت زبیرؓ کے بجائے حضرت سلیطؓ بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول ص ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار بھی بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں، وہ حضرت حاطبؓ بن عمرو اور حضرت سہیلؓ بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطبؓ بن حارث اور حضرت ابن عمروؓ کا نام لیتے ہیں (زرقانی اول ص ۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابوسبرہؓ کی بیوی حضرت ام کلثومؓ بنت سہیل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حضرت ام ایمنؓ کا اضافہ کرتے ہیں" س

۱۰۔ (حضرت ابو) حاطبؓ بن عمرو،	بدر میں شریک تھے، امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی (اصابہ)
۱۱۔ (حضرت) سہیلؓ بن بیضا،	
۱۲۔ (حضرت) عبداللہؓ بن مسعود	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں،

ان لوگوں نے ۵؁ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا، حسن اتفاق یہ کہ جب بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے، جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھا لیا ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے، قریش کو خبر ہوئی، تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے، لیکن موقع نکل چکا تھا[1]

عام مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت ان ہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، حضرت عثمانؓ بنو امیہ سے تھے، جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا، متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان سے ہیں، عبدالرحمنؓ بن عوف اور ابو سبرہؓ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بیکسوں پر محدود نہ تھا، بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے،

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے، اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑتا تھا یعنی حضرت بلالؓ، عمارؓ، یاسرؓ وغیرہ ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش

[1] یہ تمام تفصیل [illegible] میں ہے،

کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس لیے یا تو ان کی بے سر و سامانی اس حد تک پہنچ گئی کہ سفر کرنا بھی ممکن نہ تھا، یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم ز جور تو آسودہ است می نالم | کہ غیر پے نبرد لذت خدنگ ترا

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے لیکن قریش یہ خبریں سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبد اللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لیے منتخب ہوئے، نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے ایک ایک کے لیے گران بہا تحفے مہیا کیے گئے[۱]، اور نہایت سر و سامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی، یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے، اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں، اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں، دوسرے دن سفراء دربار میں گئے، اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے"۔

---

[۱] مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲، ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا، اور کتابوں میں ثابت ہے کہ بھیجا جاتا، ابن سعد نے بھی لکھا ہے کہ جو سامان نجاشی کو بھیجے گئے تھے وہ بھی چمڑا ہوتا تھا (مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت جعفر کی تقریر ہی میں حضرت ام سلمہ سے روایت)

مسلمانون نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا۔ انھون نے اس طرح تقریر شروع کی:

"اَيُّهَا الْمَلِكُ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بُت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریان کرتے تھے، ہمسایون کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزورون کو کھا جاتے تھے، اس اثنا مین ہم مین ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی، اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھرون کو پوجنا چھوڑ دین، سچ بولین، خونریزی سے باز آئین، یتیمون کا مال نہ کھائین ہمسایون کو آرام دین، عفیف عورتون پر بدنامی کا داغ نہ لگائین، نماز پڑھین، روزے رکھین، زکوٰۃ دین۔ ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی، اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی مین واپس آجائین"۔

نجاشی نے کہا "جو کلام الٰہی تمھارے پیغمبر پر اترا ہے کہین سے پڑھو"۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتین پڑھین، نجاشی پر رقت طاری ہوئی، اور آنکھون سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونون ایک ہی چراغ کے پرتو ہین"۔ یہ کہکر سفراے قریش سے کہا "تم واپس جاؤ مین ان مظلومون کو ہرگز واپس نہ دونگا"۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار مین رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہین، نجاشی نے

مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کا انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیئے،

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا "ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے" نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا لیا اور کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں" بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے ان کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی، اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے،

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلہ کے لیے خود

(۱ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰ کتاب التفسیر) اس سے مارگولیس صاحب نے ہجرت حبش کی بڑی نازک اور دور از فہم وجہ تلاش کرکے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے" اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لیے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا، اس لیے انھوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کرکے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے، اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کرکے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا، اس بنا پر اس ارادہ سے باز رہے" یہ بالکل بے ثبوت بات ہے،

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمات میں یہ بناء شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں (اور اب تک) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے کیونکہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں، تاہم درباروں میں ترجمان موجود تھے، چنانچہ ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے، بخاری باب بدء الوحی

گیا، صحابہؓ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لیے اُٹھیں، حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے لیکن انھوں نے اس خدمت کے لیے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے ادھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لیے خدا سے دعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔[1]

حبش میں کم و بیش ۸۰ مسلمان ہجرت کر گئے تھے، چند روز آرام سے گذرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے، یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے، اس لیے بعض لوگ واپس چلے گئے، اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے،

یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے، اور ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے، جب آپ نے یہ آیت پڑھی ومنٰوۃ الثالثۃ الاخریٰ تو شیطان نے

---

[1] یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا، امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلۂ روایت یہ ہے محمد بن اسحٰق، زہری، ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام مخزومی، ام سلمہؓ، یہ سب روات ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہؓ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ام سلمہؓ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ عبد الاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بتفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔

آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے،

تلک الغرانیق العلیٰ وان	یعنی (یہ بت) معظم و محترم ہیں اور انکی
شفاعتھن لترتجی	شفاعت مقبول ہے،

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضورؐ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری باب[1] (قولہ فاسجدوا للہ واعبدوا) مذکور ہے، مگر باقی) قصہ بیہودہ اور ناقابل ذکر ہے، اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نوویؒ[2] نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن المردویہ، ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر[3] شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں[4]:-

وقد ذکرنا ان ثلاثۃ اسانید	ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی
منھا علی شرط الصحیح وھی مراسیل	تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ (تینوں) مرسل ہیں

(۱ کتاب التفسیر سورۂ النجم ص ") [2] دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ و شفاء قاضی عیاض و عینی شرح بخاری تفسیر سورۂ نجم و نور النبراس علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں، لا یصح فیہ شیء لا من جھۃ النقل ولا من جھۃ العقل اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا یصح لہ نقل ولا عقل [3] دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ [4] زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۳۳۰

یحتج بمثلہا من یحتج بالمراسیل — مرسل مین ایدان سے وہ لوگ استدلال کرسکتے
ہین جو مرسل روایتون کے قائل ہین،

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے، اور اپنی طرف سے فقرے ملادیتے، قرآن مجید کی آیت ذیل اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا — اس قرآن کو نہ سنو اور اس مین گڑبڑ کرو
فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم سجدہ) — شاید تم غالب آؤ،

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرہ کہتے جاتے،[1]

واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ — لات اور عزّی اور تیسرے بت مناۃ کی
الاخری فانھن الغرانیق العلی — قسم یہ بلند و بزرگ ہین، اور انکی شفاعت
وان شفاعتھن لترتجی — کی امید ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ والنجم کی وہ آیتین پڑھین تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپ کی آواز مین ملاکر پڑھ دیے ہون گے، دور کے لوگون کو (کفار مین سے) شبہہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے وہ الفاظ ادا کیے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانون مین ہوا ہوگا، تو لوگون نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیے ہون گے، اس واقعہ نے روایتون مین صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کرلی کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ

[1] معجم البلدان لفظ عزّی

نکلوا دیے، اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے، اس لیے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا،

یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے، مواہب لدنیہ میں ہے،

قیل انه لما وصل الی قوله	بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرت صلی اللہ
ومنوۃ الثالثة الاخری خشی	علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے ومناۃ الثالثۃ
المشرکون ان یاتی بعدها	الاخری تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب آگے
بشی یذم الهتهم فبادروا	ہمارے بتوں کی کچھ برائی کو بیان ہوگا، اس بنا پر
الی ذلك الكلام فخلطوه فی	انھوں نے جھٹ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
تلاوة النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کی تلاوت میں یہ فقرے خلط کر کے پڑھ دیے
علی عادتهم فی قولهم لا تسمعوا	جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے ہیں کہ قرآن
لهذا القرآن والغوا فیه	پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچا دو،
او المراد بالشیطان شیطان الانس	یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے،

جو لوگ حبش سے واپس آ گئے تھے، اہل مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا، اور اس قدر اذیت دی کہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی، کفار نے سخت مزاحمت کی، تاہم جس طرح ہو سکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد قریباً سو تک پہنچتی ہے، مکہ سے نکل گئے، اور حبش میں اقامت اختیار کی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے، اور کچھ لوگ

رہ گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ مین ان کو بلالیا۔[1]

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزورون اور بیکسون پر محدود نہ تھی، حضرت ابوبکرؓ کا قبیلہ معزز اور طاقتور قبیلہ تھا، ان کے یار و مددگار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آگئے، اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا، برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے[2]، وہان تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا کہ کہان؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میری قوم مجھکو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہون کہ کہین الگ جاکر خدا کی عبادت کرون"، ابن الدغنہ نے کہا "یہ نہین ہوسکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے، مین تم کو اپنی پناہ مین لیتا ہون" تو حضرت ابوبکرؓ اس کیساتھ واپس آئے۔ ابن الدغنہ مکہ پہنچکر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ "ایسے شخص کو نکالتے ہو، جو مہمان نواز ہے، مفلسون کا مددگار ہے، رشتہ دارون کو پالتا ہے، مصیبتون مین کام آتا ہے" قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکر نمازون مین چپکے جو چاہین پڑھین، آواز سے قرآن پڑھتے ہین تو ہماری عورتون اور بچون پر اثر پڑتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی لیکن آخر گھر کے پاس ایک مسجد بنالی، اور اس مین خضوع و خشوع کے ساتھ بآواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتین اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد مین ہے، بعض مورخون نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا، اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ [2] زرقانی برمواہب جلد اول صفحہ ۳۰۴ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔

کی، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اب مین تمھاری حفاظت کا ذمہ دار نہین ہوسکتا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا "مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، مین تمھارے جوار سے استعفا دیتا ہون[1]"۔

محرم ۷ نبوی
شعب ابوطالب مین محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانون کو پناہ دی، سفراے نیل مرام واپس آئے، مسلمانون کی تعداد مین اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لیے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا، کہ کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قرابت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے حوالہ نہ کر دین[2]، یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا، اور در کعبہ پر آویزان کیا گیا،

ابوطالب مجبور ہو کر تمام خاندانِ ہاشم کے ساتھ شعب ابوطالب[3] مین پناہ گزین ہوئے، تین سال تک بنوہاشم نے اس حصار مین بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گذرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثون مین جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیان کھا کھا کر بسر کرتے تھے، یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف مین تصریح کی ہے، حضرت سعد وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آگیا، مین نے اسکو

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرت مدینہ مین ہے۔ [2] اس معاہدہ کا ذکر طبری نے اور ابن سعد وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے حوالہ کر دین صرف مواہب لدنیہ مین مذکور ہین، [3] یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا، جو خاندان بنوہاشم کا موروثی تھا،

پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔[1]

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے، تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آگیا، وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے،

متصل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آلِ ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی، ہشام عامری خاندان بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو ہر قسم کا لطف اٹھاؤ، اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟ زہیر نے کہا کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں، ہشام نے کہا میں موجود ہوں، دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا، دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے، زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا"،

[1] روض الانف

ابوجہل برابر سے بولا "ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا" زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کردی، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنوہاشم کے پاس گئے، اور ان کو درہ سے نکال لائے، بقول ابن سعد یہ سنہ نبوی کا واقعہ ہے، اسی زمانہ مین معراج واقع ہوئی، جس کی تفصیل تیسرے حصہ مین آئیگی،

اسی زمانہ مین نماز پنجگانہ فرض ہوئی،

سنہ نبوی، حضرت خدیجہؓ و ابوطالب کی وفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب شعب ابوطالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہ کا انتقال ہوگیا،

ابوطالب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے، آپ نے فرمایا مرتے مرتے لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہہ لیجئے کہ مین خدا کے یہان آپکے ایمان کی شہادت دون ابوجہل اور ابن ابی امیہ نے کہا "ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے" بالآخر ابوطالب نے کہا "مین عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہون" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کرکے کہا "مین وہ کلمہ کہہ دیتا، لیکن قریش کہین گے کہ موت سے ڈر گیا" آپ نے فرمایا "مین آپ کے لیے دعاے مغفرت کرون گا، جب تک کہ خدا مجھ کو

لہ یہ تفصیل ابن ہشام، طبری وغیرہ مین مذکور ہے، اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے،

اس سے منع نہ کر دے[۱]"

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے، ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباس نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "تم نے جس کلمہ کے لیے کہا تھا، ابو طالب وہی کہہ رہے ہیں[۲]"

اس بنا پر ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح تر مانی جاتی ہے، اس لیے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابلِ حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں، جو فتح مکہ میں اسلام لائے، اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے، اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "روایت مرسل ہے[۳]" ابن اسحاق کے سلسلۂ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد، اور حضرت عبداللہ بن عباس ہیں، یہ دونوں ثقہ ہیں لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے، اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجۂ استناد میں چنداں فرق نہیں[۴]۔

---

[۱] صحیح بخاری باب بخاری، ومسلم، ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے بخاری میں نہیں [۲] ابن ہشام مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۶

[۳] عینی کتاب الجنائز ج ۴ صفحہ ۲۰۰ (س) [۴] مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے، اس لیے کہ بخاری کی روایت کے آخر راوی حضرت مسیبؓ ہیں جو صحابی ہیں، ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی، اسی لیے مراسیل صحابہ حجت ہیں، اور ابن اسحٰق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحٰق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے، اس لیے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علاوہ بریں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو انہی مسیب والی روایت کے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے، اور آپ کے لیے آپ کے دشمنوں سے برسرِ پیکار

ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو جان نثاریان کین، اس سے کون انکار کر سکتا ہے، وہ اپنے جگر گوشون تک کو آپ پر نثار کرتے تھے، آپ کی محبت مین تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا، آپ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جان نثاریان سب ضائع جائین گی؟

ابو طالب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۳۵ برس عمر مین بڑے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے نہایت محبت تھی، ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے گئے تو انھون نے کہا "بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کر دے" آپ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا خدا تیرا کہنا مانتا ہے، آپ نے فرمایا کہ ...... آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانین تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے۔

ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات کی، بعض روایتون مین ہے کہ انھون نے ابو طالب سے پہلے انتقال کیا، اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونون اٹھ گئے، صحابہ خود اپنی حالت مین مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (سال غم) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے رمضان سنہ ۱۰ نبوی مین وفات کی، ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۸) رہتے تھے، فرمایا وہ دوزخ کی آگ مین صرف ٹخنے تک ہیں، مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے، اگر مین نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ مین ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم مین تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہین ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری باب قصہ ابی طالب مین اسی موقع پر موجود ہے" ص [illegible]

۱ اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ابو طالب ۲ مواہب لدنیہ

مقام حجون دفن کی گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے، اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی[1]

ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کسی کا پاس تھا، اب وہ نہایت بے رحمی و بے باکی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے تھے، ایک دفعہ آپؐ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آکر فرقِ مبارک پر خاک ڈال دی، اسی حالت میں آپؐ گھر میں تشریف لائے، آپ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں، آپؐ کا سر دھوتی تھیں اور جوش محبت سے روتی جاتی تھیں، آپؐ نے فرمایا جان پدر! رو نہیں، خدا تیرے باپ کو بچا لے گا۔"

اہل مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی، اس لیے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لیجائیں، اور وہاں دعوتِ اسلام فرمائیں، طائف میں بڑے بڑے امراء اور اربابِ اثر رہتے تھے، ان میں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا، یہ تین بھائی تھے، عبدیالیل مسعود، حبیب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی، ان تینوں نے جو جواب دیے وہ نہایت عبرت انگیز تھے، ایک نے کہا "اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے"۔ دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا"۔ تیسرے نے کہا "میں بہر حال تجھ سے بات نہیں کر سکتا، تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے، اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں"۔

---

[1] یہ تفصیل ابن سعد میں ہے۔ طبری اور ابن ہشام ذکر وفات حضرت خدیجہؓ

ان بدبختون نے اسی پر اکتفا نہین کیا، طائف کے بازاریون کو ابھار دیا کہ آپ کی ہنسی اڑائین، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہ مجمع دورویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا جب آپ اُدھر سے گذرے تو آپ کے پانون پر پتھر مارنے شروع کیے، یہانتک کہ آپ کی جوتیان خون سے بھر گئیں، جب آپ زخمون سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے، جب آپ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیان دیتے اور تالیان بجاتے جاتے، آخر آپ نے ایک باغ مین انگور کی ٹٹیون مین پناہ لی، یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا، جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا، اس نے آپ کو اس حالت مین دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا ایک خوشہ کشتی مین رکھ کر بھیجا،

اس سفر مین حضرت زید بن حارثہ بھی ساتھ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ مین قیام کیا، پھر حرا مین تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھکو اپنی حمایت مین لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے،

لہ یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ اور طبری و ابن ہشام مین ہی کہ لکھ کیا عجیب بات ہی کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہون کو کس طرح مختلف نظر آتا ہی، مارگیولیس نے (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سوء تدبیر مین داخل کیا ہی، وہ کہتے ہین کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اس لیے جب مکہ کے تمام رؤساء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے، تو طائف کے لوگون سے کیا امید ہو سکتی تھی، لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہین کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا روز اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیون کے وہ تنہا ایک مخالف شہر مین گئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا، ع والفضل ما شهدت به الاعداء،

مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹون کو بلا کر کہا کہ "ہتھیار لگا کر حرم مین جاؤ"، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مین تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا، حرم کے پاس آیا، تو پکار کر کہا کہ مین نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم مین آئے، نماز ادا کی، اور دولت خانہ کو واپس گئے، مطعم اور اس کے بیٹے آپ کو تلوارون کے سایہ مین لائے،[1]

مطعم نے کفر کی حالت مین غزوہ بدر سے پہلے وفات کی، حضرت حسان جو دربار رسالت کے شاعر تھے، انھون نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر مین نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس مین کچھ مضائقہ نہین، مطعم کا یہ کام بے شبہہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آجکل کے مسلمان حضرت حسان اور زرقانی سے زیادہ شیفتہ اسلام ہین، اس لیے معلوم نہین حضرت حسان کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہین؟

قبائل کا دورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آکر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب مین مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن مین دور دور کے قبائل آتے تھے، آپ ان میلون مین جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے،

ان میلون مین سے **عکاظ** جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا، اور مجنہ اور ذوالمجاز کا نام مورخین نے خاص طور پر لیا ہے، قبائل عرب مین سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان،

---

[1] ابن سعد صفحہ ۱۴۲ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے جو ابن اسحاق کی روایت ہے، تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کیے ہین [2] زرقانی جلد اول صفحہ ۳۱۶

مرۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نضر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ مشہور قبائل ہیں[1]، ان سب قبائل کے پاس آپ تشریف لے گئے لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا، اور جب آپ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ "دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے"

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی سے جواب دیا، مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا،

قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپ گئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے حضرت ابوبکرؓ نے مفروق سے کہا "تم نے کسی پیغمبر کا ذکر سنا ہے؟ وہ یہی ہیں"، مفروق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کر کے کہا "برادر قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو؟" آپ نے فرمایا "خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں" اور یہ آیتیں پڑھیں:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ	کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے
عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا	کیا چیزیں حرام کی ہیں، یہ کہ خدا کے ساتھ
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا، وَلَا	کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان
تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ	کیا کرو، اور اپنے بچوں کو فقر کے
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا	خیال سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو
تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا	دونوں کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی
وَمَا بَطَنَ، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ	کے پاس نہ جاؤ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ

[1] ابن سعد نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے، مستدرک حاکم جلد دوم ص ۶۱۵ [illegible] ابن ہشام

اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے ناحق ہلاک نہ کرو۔	الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (انعام ۱۹)

اس قبیلہ کے رؤسا، مفروق، مثنیٰ اور ہانی بن قبیصہ تھے، اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے، ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی لیکن کہا کہ مدتوں کا خاندانی دین دفعۃً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے"۔ اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں، اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے"۔ آپ نے ان کی راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ خدا اپنے دین کی آپ مدد کریں گا۔[1]

قبیلہ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا، آپ کی تقریر سن کر کہا "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آجائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں"۔ پھر آپ سے پوچھا کہ اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آجاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی"۔ آپ نے فرمایا "یہ خدا کے ہاتھ ہے"۔ اس نے کہا "ہم اپنا سینہ عرب کا آماج گاہ بنائیں اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں ہے"۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی

(اسباب مذکورہ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی، اور چاہا کہ آپ کو اسقدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دست بردار ہو جائیں، سو اتفاق یہ کہ جو کفار آپ کے ہمسایہ تھے یعنی ابو جہل ابو لہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن

---

[1] روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔ ([2] طبری ج ۳ ص ۱۲۰۵) "س"

حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سربرآوردہ رؤسا تھے، اور یہی سب سے بڑھکر آپ کے دشمن تھے۔[1] یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لاکر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردنِ مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں، آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھکر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنون کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے، نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول ﷺ) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔[2]

ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے۔ ابوجہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد (ﷺ) سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا" عقبہ نے کہا "یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں" چنانچہ اوجھ لاکر آپ کی گردن پر ڈال دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جاکر حضرت فاطمہؓ کو خبر کی تو وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ برس کی تھیں، لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں، اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا، اور بددعائیں دیں۔[3]

آنحضرت ﷺ جب کہیں کسی مجمع عام میں دعوت اسلام کا وعظ فرماتے

---

[1] ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۳۴، [2] مسند امام حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۰۳، [3] صحیح بخاری ۱۰۸۲، [4] صحیح بخاری باب الطہارۃ والجزیہ والجہاد، وصحیح مسلم وزرقانی جلد اول صفحہ ۲۹۴

تو ابولہب جو آپ کے ساتھ ساتھ برابر یہ کہتا جاتا کہ "یہ جھوٹ کہتا ہے"[1] ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لاچکا تھا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بازار ذوالمجاز میں گئے اور مجمع میں گھس کر لوگوں سے کہا کہ "لا الٰہ الا اللہ کہو" ابوجہل آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑ دو"۔ طائف میں کفار نے آپ کو جو اذیتیں پہنچائیں ان کا بیان پیچھے گذر چکا،

ایک دفعہ آپ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے اور آپ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا، اور کہا کہ "اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے"[2]

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے، ان کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں،

"ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید ابن المغیرہ، امیہ، ابی بن خلف، ابوقیس بن فاکہہ بن المغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن الحجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن صیفی، اسود بن عبدالاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی، ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمراء"

یہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ اور ان میں سے اکثر صاحب جاہ و اقتدار تھے،

---

[1] مسند امام حنبل جلد ۴ ص ۶۳ [2] صحیح بخاری باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ بمکۃ الخ

یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت دردانگیز اور حسرت خیز تھا لیکن تعجب خیز نہ تھا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں حضرت نوح علیہ السلام کو سیکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار و رسن کا منظر پیش آیا، اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلہ ادوار کی غیر معمولی کڑی نہ تھی، لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا سقراط زہر کا پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصب بالاتر تھا حضرت خباب بن الارت نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے، تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے وہ لوگ گذرے ہیں جن کے سر پر آرے چلا دیے گئے ہیں، [illegible] تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے خدا اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک شتر سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔[1]

کیا یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری نہیں ہوئی؟

---

[1] صحیح بخاری، باب ما لقی النبی واصحابہ من المشرکین ذکر باب ھلیمۃ، ۱۲

مدینہ منوّرہ اور انصارؓ

آفتاب کی روشنی دوپہر کو تیز ہوتی ہے، شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشان ہوتی ہے، آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہوا، لیکن کرنین مدینہ کے افق پر چمکین،

مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہان آکر قیام کیا تو اسکا نام مدینۃ النبی یعنی "پیغمبر کا شہر" پڑ گیا، اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا،

یہ شہر مدتون سے آباد ہے، بہت قدیم زمانہ مین یہودی یہان آکر آباد ہوئے، ان کی نسلین کثرت سے پھیلین، اور مدینہ کے اطراف ان کے قبضہ مین آگئے، انھون نے مدینہ اور اس کے حوالی مین چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے، اور اُن مین سکونت رکھتے تھے، (یہود کے متعلق زیادہ تحقیق آگے آئے گی)

انصار اصل مین یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن مین جب مشہور سیلاب آیا جس کو سیل عرم کہتے ہین، یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ مین آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے، اوس اور خزرج، تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہین، یہ خاندان جب یثرب مین آیا تو یہود نہایت اقتدار و اثر رکھتے تھے، آس پاس کے مقامات اُن کے قبضہ مین تھے، اور دولت وہان سے مالامال تھے، چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے متعدد قبیلے بن گئے تھے، اس لیے دور دور تک بستیان بسا لی تھین، انصار کچھ زمانہ تک

؎ انصار کے نسب اور مدینہ مین آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفا جلد اول صفحہ ۱۱۲ تا ۱۵۲ مین مذکور ہے،

ان سے الگ رہے. لیکن ان کا زور اور اثر دیکھ کر بالآخر ان کے حلیف[1] بن گئے، ایک مدت تک یہ حالت رہی لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا، اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا، یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا،

یہودیوں میں ایک رئیس قطیون پیدا ہوا، جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے، پہلے اس کے شبستانِ عیش میں آئے، یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انھوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی، اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گذری، مالک کو غیرت آئی، وہ اٹھ کر گھر میں آیا، اور بہن کو سخت ملامت کی اس نے کہا ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا، اس سے بھی بڑھ کر ہے" دوسرے دن حسب دستور جب مالک کی بہن دلہن بن کر قطیون کی خلوت گاہ میں گئی، تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا، اور قطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا، یہاں غسانیوں کی حکومت تھی، اور ابو جبلہ حکمران تھا، اس نے یہ حالات سنے تو ایک فوج گران لے کر آیا، اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیے، پھر یہود کے سرداروں کی دعوت کی، اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور اب ٹوٹ گیا، اور انصار نے نئے سر سے قوت حاصل کی،[2]

---

[1] جو قبیلے باہم ایک دوسرے کی حمایت و نصرت کا حلف اٹھاتے تھے وہ باہم حلیف کہلاتے تھے،

[2] وفاء الوفا، [illegible] مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، اور وفاء الوفاء میں بہ تفصیل مذکور ہے،

انصار نے مدینہ اور حوالیٔ مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے، اوس و خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں، اس زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑ کر مر گئے، انصار اب اس قدر ضعیف ہوگئے کہ انھوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجیے لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا،

انصار گو بت پرست تھے، تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا، اس لیے نبوت اور کتب آسمانی سے گوش آشنا تھے، یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے، لیکن ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے، یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کیے تھے، اور جن کو بیت المدارس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے[1]) ان میں توراۃ کی تعلیم ہوتی تھی، انصار جاہل تھے اس لیے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا، یہاں تک کہ انصار میں سے جس کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا[2]، یہودی عموماً یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے، اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبر موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص، سوید بن صامت جو شاعر بھی اور جنگ آور بھی میں ممتاز تھا اس کو اتفاق سے لقمان کا نسخہ ہاتھ آگیا تھا جس کو وہ کتاب آسمانی سمجھتا تھا، وہ ایک دفعہ حج کو آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات سنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے،

(۱) بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۳ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ (۲) ابوداؤد ج ۲ کتاب تفسیر میں لا اکراہ فی الدین کی تفسیر دیکھو)

اس نے امثال لقمان پڑھ کر سنایا، آپ نے فرمایا "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے" یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی۔[1] گرچہ وہ مدینہ واپس آکر جنگ بعاث میں مارا گیا، لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا، ایسے شخص کو اہل عرب "کامل" کہتے تھے، اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا[2] سوید کے بعد اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں ان کو حلیف بنائیں، اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے، اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ "خدا کی قسم تم جس غرض کے لیے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے" لیکن "قافلہ سالار یعنی ابوالحیس نے کنکریاں اٹھا کر ان کے منہ پر ماریں اور کہا کہ "ہم اس کام کے لیے نہیں آئے" اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آگیا، اور ایاس آنحضرت [illegible] کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے، لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ان کی زبان پر [illegible] تکبیر جاری تھی۔[3]

---

(1) البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۰، اس قصہ میں سوید کا ذکر [illegible] تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے لیکن سب میں اختلاف ہے، اور امثال لقمان کا ذکر [illegible] سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے، دیکھو ص ۱۴۰۔ (3) طبری، [illegible] اصابہ میں [illegible] واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا تو [illegible]

انصار کے اسلام کی ابتدا سنہ نبوی

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ مین روسائے قبائل کے پاس جاکر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال (رجب سنہ نبوی) مین بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہان اب مسجد العقبہ ہے خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے، آپ نے ان سے نام ونسب پوچھا، انھون نے کہا "خزرج" آپ نے دعوت اسلام دی، اور قرآن مجید کی آیتین سنائین، ان لوگون نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور کہا "دیکھو، یہود ہم سے اس دولت مین بازی نہ لے جائین، یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا، یہ چھ شخص[1] تھے، جن کے نام حسب ذیل ہین[2]،

---

[1] مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبۂ اولی کے عنوان سے کیا ہے، یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لیے اس وقت پریشانی کا موجب ہو جاتا ہے جب وہ دوسری کتابون (مثلاً مستدرک حاکم ج ۲ ص ۶۲۴، ابن کثیر علی حاشیۃ فتح الباری ج ۷ ص ۴۴۳) مین دیکھتے ہین کہ بیعت عقبۂ اولی مین بارہ آدمی تھے،

اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعت عقبہ ثانیہ مین ۱۲ آدمی، اور بعض ۷۰ آدمی بتلاتے ہین، حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع مین اسلام لائے، ان کے واقعۂ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبۂ اولی نہیں [illegible] انصار ہونا چاہیے، اور دوسرے سال جب گیارہ بارہ آدمی [illegible] مین، یہ بیعت عقبۂ اولی ہے۔ حضرت عبادۃ بن الصامت نے بصراحت فرمایا ہے کنا احد عشر فی العقبۃ الاولی من العام المقبل[3]، اس روایت مین حضرت عبادۃ "العام المقبل" مین بیعت عقبۂ اولی [illegible] اور اس مین گیارہ آدمیون کے ہونے کی صراحت فرماتے ہین، اس کے معنی یہ ہوے کہ اس سے پہلے جو لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبۂ اولی سے نہیں ہے،

جن لوگون نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبۂ اولی رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان [illegible] یعنی ایک یہ بیعت عقبۂ اولی، دوسری وہ بیعت عقبہ جس مین گیارہ بارہ آدمی اسلام لائے، اور تیسری وہ [illegible] مشرف باسلام ہوے، اور یہ تینون واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم مین پیش آئے، اور جن لوگون نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان

[2] سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۲ مستدرک ج ۲ ص ۶۲۴ حیدرآباد دکن

۱۔ ابو الہیثم بن تیہان	
۲۔ ابو امامہ اسعد بن زرارہ	(صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے ۱ھ میں وفات پائی،
۳۔ عوف بن حارث	(بدر میں شہادت پائی)
۴۔ رافع بن مالک بن عجلان	اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو عنایت فرمایا، جنگ احد میں شریک ہوئے)
۵۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ	(تینوں عقبات میں شریک رہے)
۶۔ جابر بن عبد اللہ ابن رباب	(یہ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ ابن عمرو کے علاوہ تھے، بدر وغیرہ میں شریک تھے)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۲) سے ذکر کیا ہے، انھوں نے بارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبۂ اولی اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبۂ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اول ص ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۵ و زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۲ و ص ۳۱۹) "س"

۳؎ یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں، ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے، اسعد بن زرارہ اور ابو الہیثم کا پہلے ہی سے موجود ہونا، ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے، دیکھو کتاب مذکور جزء ثالث، انصار بدریین ص ۱۲۲ واقعہ کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہؓ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے (بعضوں نے ابو الہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن رباب کے بجائے عبادہ بن صامتؓ کو جگہ دی ہے) "س"

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکام اسلام کے سکھانے کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا، مصعبؓ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقین اسلام میں سے تھے، غزوۂ بدر میں لشکر اسلام کی علم برداری کا منصب انہی کو ملا تھا، وہ مدینہ میں آکر اسعدؓ بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے، روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے، رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا، صرف خطمہ، وائل واقف کے چند گھر اسلام سے باقی رہ گئے، ابن سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے مصعبؓ نے جب ان کے پاس جاکر اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پہلے ناخوشی ظاہر کی لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو [illegible] معلوم ہوا [illegible] ان کا اسعد [illegible] تک کا اسلام قبول کر لیا تھا،

اگلے سال مصعبؓ [illegible] حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے (جو بہت [illegible] قبیلے [illegible] تہتر شخصوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، انہوں نے انصار سے خطاب کرکے کہا گروہ خزرج! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان

بیعت عقبۂ اولیٰ سنہ ۱۱ نبوی

بیعت [illegible] سنہ ۱۲ نبوی

میں معزز اور محترم ہیں، دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے، اب وہ بھاگ کے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک اُن کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دیدو،

حضرت براءؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں" وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثمؓ نے بات کاٹ کر کہا "یا رسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے، تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں" آپ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں"۔

آپ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کیے جن کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے، ان میں ۹ خزرج کے اور تین اوس کے تھے، ان کے نام حسب روایت ابن سعد حسب ذیل ہیں،

۱- اسید بن حضیر	جنگ بعاث میں ان ہی کے باپ اوس کے سردار تھے
۲- ابوالہیثم بن تیہان	
۳- سعد بن خثیمہ	جنگ بدر میں شہید ہوئے،
۴- اسعد بن زرارہ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا، یہ امام نماز تھے،
۵- سعد بن الربیع	جنگ احد میں شہید ہوئے،
۶- عبداللہ بن رواحہ	مشہور شاعر ہیں جنگ موتہ میں شہید ہوئے
۷- سعد بن عبادہ	معزز اور مشہور صحابی ہیں، سقیفۂ بنی ساعدہ میں

		ان ہی نے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا،
۸-	منذر بن عمروؓ	بیر معونہ میں شہید ہوئے،
۹-	براء بن معرورؓ	بیعت عقبہ میں ان ہی نے انصار کی طرف سے تقریر کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے،
۱۰-	عبداللہ بن عمروؓ	جنگ احد میں شہید ہوئے،
۱۱-	عبادہ بن الصامتؓ	مشہور صحابی ہیں، ان سے اکثر حدیثیں مروی ہیں،
۱۲-	رافع بن مالکؓ	جنگ احد میں شہید ہوئے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں "شرک، چوری، زنا، قتل اولاد، اور افترا کے مرتکب نہ ہوں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے جو اچھی بات کہیں گے، اس سے سرتابی نہ کریں گے"[1]

جب انصار بیعت کر رہے تھے، تو سعد بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا "بھائیو! یہ بھی خبر ہے؟ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن و انس سے اعلان جنگ ہے" سب نے کہا ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں،

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے، اُن کا اسلام قبول

---

[1] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبۂ اولیٰ کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ انصار آپ کی جان کی حفاظت کریں گے،

کرتا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا، صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے، اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بت پرست تھے، ان کو اس بیعت کی خبر نہ تھی، انھون نے تکذیب کی کہ "ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا"

مدینہ مین اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائین، قریش کو معلوم ہوا تو انھون نے روک ٹوک شروع کی، لیکن چوری چھپے لوگون نے ہجرت شروع کر دی، رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے، یا وہ لوگ جو مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے، یہ آیت ان ہی کی شان مین ہے،

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ	کمزور مرد، عورتین اور بچے جو یہ کہتے
وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ	ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ	نکال کہ یہان کے لوگ ظالم ہین،
هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ	. . . .
اَهْلُهَا ۚ (نساء - ۱۰)	. . . .

سنہ ١

ہجرت

اس وقت جبکہ دعوتِ حق کے جواب مین ہر طرف سے تلوار کی جھنکارین سنائی دے رہی تھین حافظِ عالم نے مسلمانون کو دارالامان مدینہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا لیکن خود وجودِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) جوان ستمگارون کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لئے حکم خدا کا منتظر تھا، مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہوچکے تھے، وہ جان نثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے قبیلہ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمرو نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپؐ یہان ہجرت کرآئین، لیکن آپؐ نے انکار فرمایا[1] اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی، بعد کو اس نے کہا کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو مطلع کرکے آیندہ سال آئیگا[2]، لیکن کارسازِ قضا و قدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا، چنانچہ قبلِ ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ دارالہجرت ایک باغ و بہار مقام ہے[3] خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا)

(۱) صحیح مسلم جلد ۱ ص ۵۰ باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لا یکفر (۲) مستدرک ج ۳ ص ۲۰۳ و زرقانی علی المواہب ج اول ص ۲۵۹ (۳) صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ

نبوت کا تیرھوان سال شروع ہوا، اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے، تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا، یہ داستان نہایت پر اثر ہے، اور اسی وجہ سے امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہؓ گو اس وقت ساٹھ برس کی تھین لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے، کہ ان ہی سے سن کر کہا ہوگا، اور ابتدائے واقعہ مین وہ خود بھی موجود تھین،

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ مین جاکر طاقت پکڑتے جاتے ہین، اور وہان اسلام پھیلتا جاتا ہے، اس پر انھون نے دار الندوہ مین، جو دار الشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا، ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابو البختری ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ و منبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے، لوگون نے مختلف رائین پیش کین، ایک نے کہا "محمد کے ہاتھ پانون مین زنجیرین ڈال کر مکان مین بند کر دیا جائے"، دوسرے نے کہا "جلا وطن کر دینا کافی ہے"، ابوجہل نے کہا "ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو، اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلوارون سے اُن کا خاتمہ کر دے، اس صورت مین اُن کا خون تمام قبائل مین بٹ جائے گا، اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکین گے"، اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا، اور جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا، اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لیے باہر ٹھہرے

رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخلین تو یہ فرض ادا کیا جائے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپ ہی کے پاس لاکر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں، آپ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس بنا پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، مین آج مدینہ روانہ ہو جاؤن گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا" یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہین، اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرش گل تھا،

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہ گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر مین تشریف لے گئے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا "کچھ مشورہ کرنا ہے، سب کو ہٹا دو" بولے کہ "یہان آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہین ہے" (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی) آپ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے" حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بیتابی سے کہا "میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا؟" ارشاد ہوا "ہان" حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینہ سے دو اونٹنیان ببول کی پتیان کھلا کھلا کر تیار کی تھین، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائین، محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا نہین ہوسکتا

ارشاد ہوا اچھا، مگر بقیمت، حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا، حضرت عائشہؓ اس وقت کمسن تھیں، ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبد اللہؓ بن زبیر کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منھ باندھا، یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے[1]،

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"۔ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے[2]، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبد اللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورہ کر رہے ہیں، جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے، حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا، اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے، تین دن تک صرف یہی غذا تھی لیکن بن بنتے نے لگی ہی کر رہی، شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گذریں[3]،

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرت، ص ۵۵۳۔ [2] یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی پر ہے، ایک میل کی چڑھائی ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے، دیکھو زرقانی جلد اول ص ۳۴۰۔ [3] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب الہجرۃ میں ہے، باب مناقب المہاجرین میں بعض مزید حالات ہیں، وہ بھی ہم نے شامل کر لیے ہیں،

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت علیؓ تھے، ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا، اور چھوڑ دیا،[1] پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے غار کے دہانہ تک آ گئے، آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ غمزدہ ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ "اب دشمن اس قدر قریب آ گئے کہ اگر اپنے قدم پر اُن کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے"۔ آپ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (توبہ) گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے

مشہور ہے کہ جب کفار، غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا، دفعۃً ببول کا درخت اُگا، اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے، اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے، حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں، اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے، اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں، اس روایت کا اصلی راوی عون بن عمرو ہے اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے "لا شیئ" یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ "وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے"۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کیے ہیں، اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے،[2]

[1] تاریخ طبری (ج ۳ ص ۱۲۳۴) [2] سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۰۰ میں بضمن "مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے)" س"

بہ ہرحال چوتھے دن آپ غار سے نکلے، عبد اللہ بن اُریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لیے اجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھادی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آرام فرمایا، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد وغبار سے صاف کردے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے، اور دودھ دوہا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لیکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور ٹھنڈا پانی ملا کر پیش کیا، آپ نے پی کر فرمایا کہ "کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا؟" آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لیے آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے،[1]

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائیگا، اس کو ایک خونبہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائیگا، سراقہؓ بن جعشم نے سنا تو انعام کی امید میں نکلا عین اس حالت میں کہ آپؐ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا، ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ

[1] یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین میں ہے، ہم نے تمام جزئیات اس لیے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکرؓ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ [2] سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے ان ہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دیکھا،

حلہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں نہیں نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گرانبہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا، اور آگے بڑھا، اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربے اسکی ہمت پست کر دی، اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھکو امن کی تحریر لکھ دیجئے حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا،[1]

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا سامان لیکر آرہے تھے، انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کیے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے،

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں، اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں، خرار، ثنیۃ المرۃ، لقف، مدلجۃ، مرجح، حداید، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپ نے مغرب کی نماز پڑھی)، ذاسلم، عثانیۃ، قاحہ، عروج، جدوات، رکوبۃ، عقیق، جثجاثہ،

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آرہے ہیں، لوگ ہر روز تڑکے سے

[1] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم. اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔

نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا، اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہل عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا" تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے،

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے، اس کو عالیہ اور قبا کہتے ہیں، یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا، اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوش مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا، یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبانِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان ہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے،[1]

اکثر اکابر صحابہؓ جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے مدینہ میں آچکے تھے، وہ بھی ان ہی کے گھر میں اترے تھے، چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبد اللہؓ ابن مخرمہ، وہبؓ بن سعد، عمرؓ بن ابی سرح، عمیرؓ بن عوف ابتک ان ہی کے مہمان تھے،

جناب امیرؓ، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے، وہ بھی آگئے، اور یہیں ٹھہرے، تمام مورخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا، لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے اور یہی قرین قیاس ہے،

[1] صحیح بخاری صفحہ ۵۵۵ طبقات ابن سعد سیرۃ نبوی ص ۵۰، [2] ابن سعد تذکرۂ کلثوم بن ہدم،

یہاں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا، حضرت کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی، جہاں کھجوریں سکھلائی جاتی تھیں، یہیں دستِ مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے،

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ	وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری
أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ	پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ
فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا	تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ (توبہ ۱۳)	بہت پسند ہے اور خدا پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے،

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی کام کرتے تھے، بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے "ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ چھوڑ دیں ہم اٹھالیں گے۔" آپ ان کی درخواست قبول فرماتے لیکن اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھالیتے،[1]

حضرت عبداللہ بن رواحہ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے، اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے،

أفلح من يعالج المساجدا	وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے،
ويقرأ القرآن قائما وقاعدا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے،
ولا يبيت الليل عنه راقدا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے،

۱؎ وفاء الوفا، بحوالہ طبرانی کبیر (ج ۱ ص ۱۸۰)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے،[۱]

قُبا میں آپ کا داخلہ اسلام کے دور خاص کی ابتدا ہے، اس لیے مورخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے، اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳ سنہ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی، (محمد بن) موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن، اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ، اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ء اسکندری کی دسویں تاریخ تھی،[۲] مورخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۶ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۹ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو)[۳] آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے (راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آگیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی نماز جمعہ، اور سب سے پہلا خطبہ نماز تھا، لوگوں کو جب تشریف آوری

۱؎ وفاء الوفاء بحوالہ شیبہ ج ۱ ص ۱۸۱ مصر ۲؎ عینی شرح بخاری جلد دوم ص ۳۷۵ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۹۳۳ھ بسماۃ لکھا گیا ہے، اس کو تسعماۃ پڑھنا چاہیے، رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید طریقۂ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے، خوارزمی نے جمعرات کا دن بتایا ہے لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے)

۳؎ خوارزمی کے حساب کے مطابق روز ورود (جمعرات) نہ لیا جاوے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔

کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیشقدمی کے لیے دوڑے، آپؐ کے ننہالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے[1]، قبا سے مدینہ تک دو رویہ جان نثارون کی صفین تھین، راہ مین انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا "حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے"۔ آپؐ منت کا اظہار فرماتے، اور دعاے خیر دیتے، شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونین چھتون پر نکل آئین اور گانے لگین

طَلَعَ البدرُ علینا	چاند نکل آیا ہے،
من ثنیات الوداع	کوہِ وداع کی گھاٹیون سے
وجب الشکر علینا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے
ما دعیٰ للہ داع	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگین

معصوم لڑکیان دف بجا بجا کر گاتی تھین

نحنُ جوارٌ من بنی النجار	ہم خاندانِ نجار کی لڑکیان ہین،
یا حبذا محمدٌ من جار	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا اچھا ہمسایہ ہے،

آپؐ نے ان لڑکیون کی طرف خطاب کر کے فرمایا "کیا تم مجھ کو چاہتی ہو"؟ بولین "ہان"، فرمایا کہ "مین بھی تم کو چاہتا ہون"۔

[1] یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ مین مذکور ہے۔ وفاء الوفا جلد اول ص ۱۸۰، پہلے اشعار کے متعلق زرقانی مین نہایت محققانہ، محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے، نہ کہ مکہ کی طرف، مواہب مین لکھا ہے کہ یہ اشعار حلوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کیے ہیں، بخاری مین بھی یہ اشعار منقول ہین، مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر، لیکن ان دونون روایتون مین کچھ تناقض نہین، ممکن ہے دونون موقعون پر یہ اشعار پڑھے گئے ہون۔

جہان اب مسجد نبوی ہے، اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا کہ کوکبۂ نبوی یہان پہنچا، سخت کشمکش تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت حضرت ابوایوبؓ کے حصہ مین آئی،

حضرت ابوایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا، انھون نے بالائی منزل پیش کی لیکن آپؐ نے زائرین کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا، ابوایوبؓ دو وقتہ آپ کی خدمت مین کھانا بھیجتے، اور آپ جو چھوڑ دیتے، ابوایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصہ مین آتا، کھانے مین جہان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیون کا نشان پڑا ہوتا، ابوایوبؓ بھی تبرکاً وہین انگلیان ڈالتے،

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل مین پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہ کر نیچے جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو، گھر مین اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا حضرت ابوایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے[۲]،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سات مہینہ تک یہین قیام فرمایا، اس اثنا مین جب مسجد نبوی اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپ نے نقل مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے.

---

[۱] ابوایوب کا نام خالد ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ مین اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہین یہ واقعہ لکھا ہے، اکثر سیر اور تواریخ کی کتابون مین لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر مین اتارنے کی درخواست کرتا تھا، آپ نے فرمایا کہ میرے ناقہ کو چھوڑ دو، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے" چنانچہ ناقہ حضرت ابوایوبؓ کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا اسلیے آپ نے ان ہی کے گھر پر قیام فرمایا، لیکن صحیح مسلم باب الہجرۃ مین ہے کہ جب لوگون مین آپ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ نے کہا کہ "مین بنو نجار کے ہان اترون گا جو عبد المطلب کے ماموں ہین"، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابوایوبؓ اسی خاندان سے تھے، امام بخاری نے تاریخ صغیر مین تصریح کی ہے کہ ابوایوبؓ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا.

[۲] اصابہ ذکر ابوایوب اور زرقانی بحوالہ حافظ ابو یوسف و حاکم و [illegible]

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زیدؓ (اور اپنے غلام ابو رافع) کو دو اونٹ اور پانسو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاجزادیوں اور حرم نبویؐ کو لے آئیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاجزادیوں میں سے صرف رقیہؓ، حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبش میں تھیں، حضرت زینبؓ کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا زیدؓ صرف حضرت فاطمہ زہرا (اور حضرت ام کلثومؓ) اور حضرت سودہؓ (زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبداللہؓ کے ساتھ آئیں۔[1]

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں، یا جہاں موقع ملتا تھا، آپ نماز پڑھا کرتے تھے[2]، دولتکدہ کے قریب خاندانِ نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا "میں یہ زمین بقیمت لینا چاہتا ہوں"۔ وہ بولے کہ "ہم قیمت لیں گے لیکن آپ سے نہیں، بلکہ خدا سے"۔ چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپ نے گوارا نہ کیا، حضرت ابوایوبؓ نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی، اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، شہنشاہ دو عالم، پھر مزدوروں کے لباس میں تھا، صحابہؓ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، اور رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے تھے[3]

---

[1] ابن سعد (جزء نساء ص ۱۴۳) [2] ابوداؤد باب بناء المسجد، [3] بخاری باب مقدم النبی و باب الہجرۃ وج ۱ باب البیوع و عینی شرح بخاری جلد ۲ ص ۳۰۰ ذکر ذی؟۔

اللھم لا خیر الا خیر الآخرۃ — اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے

فاغفر الانصار والمھاجرۃ — اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر، کھجور کے ستون تھے، قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی، ایک دفعہ صحابہ نماز کے لیے آئے تو کنکریاں لیتے آئے، اور اپنی اپنی نشستگاہ پر بچھا لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا، جو صفہ کہلاتا تھا، یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو اسلام لاتے تھے، اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبوی جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہراتؓ کے لیے مکان بنوائے، اس وقت تک حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ عقد نکاح میں آ چکی تھیں، اس لیے دو ہی حجرے بنے جب اور ازواجؓ آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے، یہ مکان کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے، ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے، اور حضرت عائشہؓ

حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ مقابل جانب تھیں۔ یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپؐ مسجد مین اعتکاف مین ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے، اور ازواج مطہراتؓ گھر مین بیٹھے بیٹھے آپؐ کے بال دھو دیتی تھین،

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے، چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازون پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا، راتون کو چراغ نہین جلتے تھے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمسایہ مین جو انصار رہتے تھے، اُن مین حضرت سعدؓ بن عبادہ، حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمارۃ بن حزم، اور حضرت ابوایوبؓ رئیس اور دولت مند تھے، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین دودھ بھیجا کرتے تھے، اور اسی پر آپؐ بسر فرماتے تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہ نے التزام کر لیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہان سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے، جس مین کبھی سالن، کبھی دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا، حضرت انسؓ کی مان حضرت ام انسؓ نے اپنی جائداد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت مین پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما کر اپنی دایہ حضرت ام ایمنؓ کو دے دیا

لہ طبقات ابن سعد، جلد سیرت نبوی صفحہ ۱۶۱ ٹہ منازل نبویؐ کا حال طبقات ابن سعد جزء ۸ ص ۱۱۷ اور وفاء الوفا مین تفصیلاً ہے ٹہ بخاری باب الصلوۃ علی الفراش ٹہ طبقات ابن سعد جلد کتاب النساء ص ۱۱۶ ٹہ صحیح بخاری ص ۳۵۸ باب فضل المنیحہ

اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا،

اذان کی ابتدا اسلام تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہی، اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ وقت کا اندازہ کرکے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا، آپنے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کردیے جائین جو وقت پر لوگون کو گھرون سے بلا لائین، لیکن اس مین زحمت تھی صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا، لوگون نے مختلف رائین دین، کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کردیا جائے، لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائین گے، آپ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا، عیسائیون اور یہودیون کے یہان اعلان نماز کے جو طریقے ہین وہ بھی آپ کی خدمت مین عرض کیے گئے، لیکن آپنے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دین[1]، اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی، دوسری طرف دن مین پانچ دفعہ دعوتِ اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا،

صحاحِ ستہ کی بعض کتابون مین ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی، جو انھون نے خواب مین دیکھی تھی، ایک اور روایت مین ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب مین توارد ہوا لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ مین کسی اور روایت کو ترجیح نہین دیجا سکتی،[2]

۱؎ ابوداؤد باب بدء الاذان و بخاری باب الاذان۔ بخاری مین زید کے واقعہ کا ذکر نہین ۔ ۲؎ یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی مین بھی ہے لیکن تمام روایات کو درجہ کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگون کی رایون کے مقابلہ مین اپنی رائے یہ پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت مین ہے کہ اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوۃ کیا ایک آدمی بھیج دیا جاے جو پکار کر نماز کا اعلان کردے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی، اور آپ نے اس کے موافق حضرت بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا، خواب کا ذکر نہیں،

مواخاۃ مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے، گوان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے، لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے، اس لیے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے،

اگرچہ مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانۂ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی، مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، تاہم چونکہ بالکل تہی دست تھے، اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتۂ اخوت قائم کر دیا جائے، جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ نے انصار کو طلب فرمایا، حضرت انسؓ بن مالک جو اس وقت دس سال کے تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرینؓ کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ تمہارے بھائی ہیں،" پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو، اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۳) نے اس کو پسند فرمایا اور الصلوٰۃ جامعۃ کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے موجودہ الفاظ کی تعلیم، اذان کو خواب میں دیکھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا، اور اسی کے مطابق اذان موجودہ جاری فرمائی گئی، فتح الباری و نووی و زرقانی و روض الانف باب بدء الاذان میں یہ تفصیلات بحوالہ سند مذکور ہیں) "س"

انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دیدیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے، سعد بن الربیع جو عبدالرحمن بن عوف کے بھائی قرار پائے، انکی دو بیویاں تھین، عبدالرحمن سے کہا کہ ایک کو مین طلاق دیتا ہون، آپ اس سے نکاح کر لیجیے، لیکن انھون نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا۔[۱]

انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا، نخلستان تھے، روپے پیسے تو اس زمانہ مین تھے نہین، انھون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیون مین بانٹ تقسیم کر دیے جائین، مہاجرین تجارت پیشہ تھے، اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے انکار کیا، انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود انجام دے لین گے جو کچھ پیداوار ہوگی اس مین نصف حصہ مہاجرین کا ہوگا مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔[۲]

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا، اور بھائی بند محروم رہتے، یہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل تھی،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی
وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ	راہ مین مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھون
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا	نے ان لوگون کو پناہ دی، اور ان کی مدد کی یہ

[۱] مواخاۃ کا ذکر اور ایک ایک کا نام ابن ہشام ص ۔۔۔ مین ہے حضرت عبدالرحمن بن عوف کا واقعہ صحیح بخاری کتاب المناقب باب ... بالتفصیل

انصار النبی مین ہے [۲] صحیح بخاری ص ۳۰۰، [۳] ایضاً ص ۔۔۔ [۴] صحیح بخاری کتاب التفسیر ... ... بعضھم ...

وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ — باہم بھائی بھائی ہین۔
اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (انفال - ۱۰)

جنگ بدر کے بعد جب مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی، تو یہ آیت اتری،

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ — ارباب قرابت ایک دوسرے کے
اَوْلٰی بِبَعْضٍ (انفال - ۱۰) — زیادہ حقدار ہین،

اس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا، چنانچہ کتب تفسیر وحدیث مین بہ تصریح مذکور ہے۔

سنہ ۴ھ مین بنو نضیر جب جلا وطن ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ مین آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ "مہاجرین نادار ہین، اگر تمھاری مرضی ہو تو نئے مقبوضات تنہا ان کو دیئے جائین، اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو" انصار نے عرض کی کہ نہین ہمارے نخلستان بھائیون ہی کے قبضہ مین رہنے دیجئے اور نئے بھی ان ہی کو عنایت فرمایئے[1]

دنیا انصار کے اس ناز پر ہمیشہ ایثار کرے گی لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعدؓ بن الربیع نے جب حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو انھون نے کہا خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے! "انھون نے قینقاع کا جو مشہور بازار تھا، جا کر راستہ بتا دیا، انھون نے کچھ گھی، کچھ پنیر خریدا، اور شام تک خرید و فروخت کی، چند روز مین اتنا

[1] فتوح البلدان، مطبوعہ یورپ ص ۲۰،

سرمایہ ہوگیا کہ شادی کرلی،[۱] رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بنجاتی ہے، ان کا اسباب تجارت سات سات سو[۲] اونٹوں پر لدکر آتا تھا، اور جس دن مدینہ پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی،[۳]

بعض صحابہؓ نے دکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ مقام سنخ میں تھا، جہان وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے،[۴] حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید وفروخت کرتے تھے،[۵] حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہوگئے تھے،[۶] اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی، اور صحابہؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کردی تھی، صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پر لوگوں نے جب کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہؓ تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انھوں نے کہا اس میں میرا کیا قصور ہے، اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے، اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا،

پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کردیے، صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے،

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما فرغ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے،

۱؎ صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے کتاب البیوع، و باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب اخاء النبی بین المہاجرین والانصار، باب الولیمہ، ولو بشاۃ ، ۲؎ اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۱۴ و ۳۱۵ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے ۳؎ ابن سعد جلد ۳ ص ۱۳۰ ۴؎ مسند امام حنبل جلد ۱ ص ۶۲ ۵؎ مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۴۰۰ ۶؎ ابن حنبل جلد ۳ ص ۳۴۴

من قتال اهل خیبر وانصرف الی	اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے
المدینۃ ردّ المہاجرون الی الانصار	انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت
منائحھم التی کانوا منحوھم من ثمارھم	میں تھے واپس کر دیے،

مہاجرین کے لیے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھرون کے آس پاس جو افتادہ زمینین تھین ان کو دیدین، اور جن کے پاس زمین نہ تھی انھون نے اپنے مسکونہ مکانات دیدیے، سب سے پہلا حضرت حارثہؓ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی، بنو زہرہ مسجد نبوی کے عقب مین آباد ہوئے، حضرت عبدالرحمن بن عوف نے یہان ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزون ہوگا) بنوایا، حضرت زبیر بن العوام کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی حضرت عثمانؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو مین زمینین دین،[1]

مواخاۃ کے رشتہ سے جو لوگ آپس مین بھائی بھائی بنے ان مین سے بعض حضرات کے نام یہ ہین :-

مہاجرین	انصار
حضرت ابو بکرؓ	حضرت خارجہ بن زید انصاری
حضرت عمرؓ	حضرت عتبان بن مالک انصاری
حضرت عثمانؓ	حضرت اوس بن ثابت انصاری
حضرت ابو عبیدہ جراحؓ	حضرت سعد بن معاذ انصاری

[1] یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر مین ہے۔[2] یہ تفصیل ابن ہشام ص ۱۷۹ مین ہے،

مہاجرین	انصار
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامۃ بنؓ وقش
حضرت مصعب بنؓ عمیر	حضرت ابوایوبؓ انصاری
حضرت عمارؓ بن یاسر	حضرت حذیفہ بنؓ یمان
حضرت ابوذر غفاریؓ	حضرت منذر بنؓ عمرو
حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابودرداؓ
حضرت بلالؓ	حضرت ابورویحہؓ
حضرت ابوحذیفہ بنؓ عتبہ بن ربیعہ	حضرت عباد بنؓ بشر
حضرت سعید بنؓ زید بن عمرو بن نفیل	حضرت ابی بن کعبؓ

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا کہ بے خانمان مہاجرین کا چندروزہ انتظام ہوجائے لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا، اسلام تہذیب اخلاق وتکمیلِ فضائل کی شہنشاہی ہے، اس سلطنت الٰہی کے لیے وزراء، ارباب تدبیر، سپہ سالارانِ لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہین، شرفِ صحبت کی برکت سے مہاجرین مین ان قابلیتون کا ایک گروہ تیار ہوچکا تھا، اور اُن مین یہ وصف پیدا ہوچکا تھا کہ ان کی درسگاہ تربیت سے اور ارباب استعداد بھی تربیت پاکر نکلین، اس بنا پر جن لوگون مین رشتۂ اخوت قائم کیا گیا، ان مین اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد مین وہ اتحاد مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لیے ضروری ہے، تفحص اور

استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونون مین باہمی مذاق ملحوظ رکھا گیا، اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت مین سیکڑون اشخاص کی طبیعت اور فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے، تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ شان نبوت کی خصوصیات مین سے ہے۔

حضرت سعید بن زیدؓ عشرہ مبشرہ مین ہین، اُن کے والد زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ملت ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے، اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے، حضرت سعیدؓ نے ان ہی کے دامنِ تربیت مین پرورش پائی تھی، اس لیے اسلام کا نام سنتے کے ساتھ انھون نے لبیک کہا، ان کی ہان بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائین۔ حضرت عمرؓ ان ہی کے گھر مین اور اُن ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے، علم و فضل کے لحاظ سے فضلاے صحابہ مین تھے، ان کی اخوت حضرت ابی بن کعبؓ سے قائم کی گئی، جنھون نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہ نبوت مین منصبِ انشا پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے، فن قرأت کے وہ امام تسلیم کیے جاتے ہین،[1]

حضرت ابو حذیفہؓ عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے، جو قریش کا رئیس اعظم تھا، اس مناسبت سے ان کو حضرت عباد بن بشر کا بھائی بنایا گیا، جو قبیلۂ اشہل کے سردار تھے،

حضرت ابو عبیدہؓ جراح جن کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتح شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے

---

[1] اصابہ ذکر ابی بن کعب

مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ غزوۂ بدر
میں جب ان کے باپ ان کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے عقوق ابوت کی مراعات
کی لیکن بالآخر اسلام پر اس کو نثار کر دینا پڑا ... حضرت سعد بن معاذ
جو قبیلۂ اوس کے رئیس اعظم تھے، ان میں بھی ایثار کا وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے
بنو قریظہ ان کے حلیف تھے، اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا
تاہم غزوۂ بنی قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا
حضرت بلالؓ اور حضرت ابو رویحہؓ، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابو درداؓ، حضرت
عمار بن یاسرؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت مصعبؓ اور حضرت ابو ایوبؓ میں وہ وحدت
موجود تھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد، بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا، حضرت
عبدالرحمن بن عوفؓ مدینہ میں آئے تو پیر سر پہ رکھ کر بیٹھے تھے، حضرت سعد بن الربیعؓ کی صحبت
میں جو امیر الامراء تھے، دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے، ہم اوپر لکھ آئے ہیں،
انصار نے مہاجرین کی مہمانی، ہمدردی اور ایثار جو کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر
نہیں مل سکتی، بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں
اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، انہوں نے عرض کی کہ پہلے ہمارے مہاجر بھائیوں
کو اتنی ہی زمین عنایت فرمائیے، تب ہم لینا منظور کریں گے۔[1]
ایک دفعہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ سخت

[1] صحیح بخاری فضائل انصار۔

بھوکا ہوں، آپ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ "صرف پانی" آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کوئی ہے؟ جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے، حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کی "میں حاضر ہوں" غرض وہ اپنے گھر لوا گئے، لیکن وہاں بھی برکت تھی، بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے، انھوں نے بیوی سے کہا چراغ بجھا دو، اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لاکر رکھ دو، تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے، میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے، اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں، اسی واقعہ[1] کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے،

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر-۱)	اور گو ان کو خود تنگی ہو تاہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں،

صفہ اور اصحاب صفہ

اصحابِ صُفّہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں،

"صفہ" سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا، جو مسجد نبویؐ کے ایک کنارہ پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، صحابہؓ میں سے اکثر تو مشاغلِ دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے، لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے، اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لیے کچھ کھانا مہیا کرتی،

[1] صحیح بخاری و فتح الباری، فضائل انصار۔

یہ لوگ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے، حضرت ابوہریرہؓ بھی ان ہی لوگوں میں تھے، ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں، یہ اٹھا کر کھا لیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ آکر شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مُسلّم ان کے پاس بھیج دیتے، اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی کبھی اسی اسی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے،[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ

[1] صحیح ترمذی باب معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] زرقانی (ج ۱ ص ۳۰۰ مصر) ذکر اصحاب صفہ و مسجد نبوی۔

مین تمام کو دو دن [illegible] صفہ والے تہجد کے رہتے، راتون کو [illegible] خوب عبادت کرتے، اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لیے ایک معلم مقرر تھا، اُن کے پاس جا کر پڑھتے، اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لیے کہین بھیجا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ معونہ مین ان ہی مین سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے،

ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی[۱] لیکن کبھی ایک زمانہ مین اس قدر تعداد نہین ہوئی، نہ صفہ مین اس قدر گنجایش تھی، ان لوگون کا مفصل حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۴۰ھ (جو ابن مندہ کے استاذ تھے) نے ایک الگ تصنیف مین لکھا ہے، سلمی نے بھی ان کے حالات مین ایک الگ کتاب لکھی ہے،[۲]

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ

مورخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے، اور اس تقریب سے عرب مین آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہین ہوتی، یہود گو تمام دنیا مین پھیلے لیکن انھون نے اپنے نام کہیں نہین بدلے، آج بھی وہ جہان ہین، اسرائیلی نام رکھتے ہین، بخلاف اس کے عرب یہودیون کے نام نضیر، قینقاع، مرحب،

---

[۱] زرقانی ذکر اہل صفہ [illegible] جلد [illegible] ص ۱۳۰،[۳] حافظ سیوطی نے اصحاب صفہ کا ایک رسالہ [illegible] نام لکھا تھا، اس رسالہ مین سو آدمیون کے نام بہ ترتیب حروف [illegible] ہین)[۴] [۵] اصحاب صفہ کا حال بخاری باب [illegible] بخاری وغیرہ [illegible] مین [illegible] نے دو کتابون سے لیکر اخذ کیا ہے،

یہ واقعات بخاری و مسلم [illegible] مین [illegible] لکھے ہین (نیز مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۰ مین بھی ہین)

حارث وغیرہ ہوتے تھے جو خالص عربی نام ہیں، یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں،
چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لڑنے کے لیے کہا تو بولے،

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ	تم اور اپنے خدا کے جاؤ، اور لڑو، ہم
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ، ع-۴)	یہاں بیٹھے ہیں گے،

بخلاف اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے،
ان قرائن عقلی کے علاوہ ایک بڑے مورخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ
قریظہ اور نضیر عرب تھے، جو یہودی بن گئے تھے،

ثم کانت وقعة بنی نضیر	پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا، یہ قبیلہ جذام کا
وھم فخذ من جذام الا انھم	ایک خاندان تھا، لیکن یہودی ہو گیا تھا
تھودوا... وکذالک قریظة[2]	اور اسی طرح قریظہ بھی،

مورخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ[3] میں ایک اور روایت لکھی ہے کہ
بنو جذام کے قبیلہ سے تھے، کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت
موسیٰ پر ایمان لائے، اور شام سے ترک مکان کر کے حجاز چلے آئے،
یہ تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور

---

[1] مسٹر [illegible] ... غالباً صحیح ہے کہ
یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصلی یہود بھی تھے، عرب جو یہودی ہوتے گئے، وہ بھی
ان میں شامل ہوتے گئے، [2] یعقوبی جلد ۲ ص ۴۹ مطبوعہ یورپ [3] ص ۲۴۷

اور مضبوط برج اور قلعے بنا لیے تھے،

انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس اور خزرج ان میں باہم جو آخیر معرکہ ہوا تھا، (جنگِ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا، یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں،

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا، جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے، خلاصہ یہ ہے،

۱۔ خونبہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا،
۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا
۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے،
۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کریگا،
۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہ دیگا،
۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے،
۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا، لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی،

واقعات متفرقہ | اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربین خاص

میں تھے، وفات پائی، حضرت کلثومؓ بن ہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ، کلثومؓ وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قبا میں تشریف لائے، تو ان ہی کے [illegible] اکثر بڑے بڑے صحابہ بھی ان ہی کے گھر اترے تھے، حضرت اسعدؓ بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کی [illegible] اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا یہی اسعدؓ تھے، یہ فخر بھی ان ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے مدینہ میں آکر جمعہ کی نماز قائم کی،

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے، اس لیے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی کہ اُن کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے، چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ”میں خود تمہارا نقیب ہوں“[1] چونکہ آپ کی ننہال اسی قبیلہ میں تھی، اس لیے اور قبائل کو رشک اور منافست کا موقع نہ تھا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہایت صدمہ ہوا، منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر پیغمبر ہوتے، تو اُن کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا“ آپ نے سنا تو فرمایا،

لا املك لنفسي ولا لصاحبي — میں اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے

---

[1] طبری ص ۱۲۶۱ و ۱۲۶۲

من اللہ شیئاً (طبری ص ۲) خدا کے ہاں کوئی حق نہیں رکھتا،

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانہ میں دو بڑے رئیسان کفر نے بھی وفات پائی، یعنی ولید بن المغیرہ جو حضرت خالدؓ کا باپ تھا، اور عاص بن وائل سہمی جس کے بیٹے حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کے فاتح تھے، اور حضرت امیر معاویہؓ کے وزیر اعظم تھے،

اسی زمانہ میں حضرت عبد اللہؓ بن زبیر کی ولادت ہوئی، ان کے والد حضرت زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی تھے، اور ان کی والدہ حضرت اسماءؓ حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی ماں جائی بہن تھیں، اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی، اس لیے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، حضرت عبد اللہؓ بن زبیر پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا،

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں، اب ظہر و عصر و عشا میں چار چار ہو گئیں، لیکن سفر کے لیے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

۲ سنہ

تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لیے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے، جو آج ۴۰ کروڑ قلوب کا مرکز ہے دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں، اور مسلمان اس کی مدافعت کے لیے تیار ہوتے ہیں)

تحویلِ قبلہ، شعبان ۲ھ

ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لیے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی، اسلام نے یہ شعار، قبلۂ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے، اسلام کا خاص نمایاں وصف مساواتِ عام، جمہوریت اور توحیدِ عمل ہے یعنی تمام مسلمان یکسان اور متحد الجہۃ نظر آئیں، مذہب اسلام کا رکنِ اعظم نماز ہے جس سے ہر روز پانچ وقت کام رہتا ہے، نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افرادِ کثیر کے ساتھ ادا کی جائے، لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے، اسی بنا پر نمازِ جماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں

وابستہ ہوتی ہی، اس لیے ضرور ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے، یہی اصول ہی جسکی بناپر نماز کا ایک قبلہ قرار پایا، اور اس شعار کا دائرہ، سقدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے، یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے کیونکہ ان کی قومی و مذہبی تاریخ بیت المقدس سے وابستہ تھی لیکن ابراہیم بت شکن کے جانشینوں کا صرف کعبہ قبلہ ہو سکتا تھا، جو اس موحد اعظم کی یادگار اور توحید خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے،

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تک مکہ مین تھے، دو ضرورتین ایک ساتھ درپیش تھین، ملت ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز اور اختصاص، وہ نہین حاصل ہوتی تھی، کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے، اس بناپر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مقام ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے، جس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، (۳) طرح دونون قبلے سامنے آجاتے تھے، مدینہ مین دو گروہ آباد تھے، مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا، اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے، شرک کے مقابلہ مین یہودیت اور نصرانیت دونون کو ترجیح تھی، اس لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مدت یعنی (۱۶) مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی، لیکن جب مدینہ مین اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ چھوڑ کر دوسری طرف رخ کیا جاتا، اس بناپر یہ آیت اتری اور دفعۃً

قبلہ بدل گیا[1]

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ	تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو
الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا	اور جہاں کہیں رہو اسی طرف
وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ - ۱۸)	منہ پھیرو،

تحویل قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی ان کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے، یہاں تک کہ جیسا ابو داؤد میں روایت ہے، جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، وہ منتیں مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہے گا، تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے، اسلام نے ان کے اس مذہبی اعزاز کو صدمہ پہنچایا، تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا، اس لیے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی ان ہی کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہے، جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا، انھوں نے طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے، دو دلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں، اور اس سے بے استقلالی اور تزلزل اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے، اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویل قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے یہ مشکلیں حل ہوتی ہیں،

[1] اس مضمون میں حسب ذیل واقعات ہیں، صحیح بخاری احادیث قبلہ (نماز) اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے ماخوذ ہیں

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ
مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا
عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ
وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ
عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ
عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً
إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ

(بقرۃ ۲ - ۱۷)

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَ
آتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ

(البقرہ ۲ - ۲۲)

بے وقوف ایسا اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا
جو قبلہ تھا، اس سے ان کو کس نے پھیر دیا،
کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا
ہے، تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو
جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا، تو اس کی وجہ یہ ہے
کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے،
اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے، اور بے شبہہ
یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے بجز ان
لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے۔
پورب پچھم منہ کرنا ہی کوئی ثواب کی بات نہیں
ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر قیامت پر
ملائکہ پر خدا کی کتابوں پر پیغمبروں پر
ایمان لائے، اور خدا کی محبت میں
عزیزوں کو، یتیموں کو، مسکینوں
کو، مسافروں کو، سائلوں کو، غلاموں
کو آزاد کرنے میں اپنی دولت
دیدے۔

ان آیتوں میں خدا نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، خدا کی عبادت کے لیے پورب پچھم سب برابر ہیں، خدا ہر جگہ ہے، ہر سمت ہے، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کی تعیین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے، اور اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے، بہت سے یہودی تھے، جو منافقانہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے، یہ اسلام کے لیے مار آستین تھے، لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا تھا، تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا، کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے، یعنی بیت المقدس اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے، پھر دوبارہ خدا نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کرنا اصل ثواب نہیں، بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمال صالحہ کا نام ہے،

سلسلۂ غزوات۱؎

کیا عجیب بات ہے، ارباب سیر مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہین، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے، اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے، کیونکہ اس کو اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے، اس کے نقش و نگار کے لیے لہو کے چند قطرے نہین، بلکہ چشمہ ہاے خون درکار ہین، یورپ کے تمام مورخون نے سیرتِ نبوی کو اس انداز مین لکھا ہے کہ وہ لڑائیون کا ایک مسلسل سلسلہ ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائین،

لیکن یہ خیال چونکہ واقع مین غلط اور سرتاپا غلط ہے، اس لیے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے،

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ مین تھا، مصائب گوناگون کا آماج گاہ تھا، مدینہ پہنچ کر اس کی کلفتین دور ہوئین، مگر یہ خیال صحیح نہین مکہ مین جو مصیبت تھی گو سخت تھی

۱؎ غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات مین پیش آئے ان کے لیے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، کیونکہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہین ہو سکتے تھے، لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گذر جائین، اس لیے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے، ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھین،

لیکن تنہا اور منفرد تھی، مدینہ میں اگرچہ متعدد اور گوناگوں بن گئی، مکہ کل ایک قوم تھا، مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے، جو عادات خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور اُن کے حریف مقابل تھے، اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا، جو مار آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے، مکہ اگر قابو میں آجاتا تو حرم کی وسعت اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں، لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا، مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا، لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قیامگاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا آماج گاہ بنا دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبد اللہ ابن اُبی کو جو واقعۂ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا، اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی، شاہانہ رسم ادا کرنے کے لیے تیاری کر لی تھی، خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے،

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے،
باللہ لتقاتلنه او تخرجنه	ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ
او لنسیرن الیکم باجمعنا	ان کو قتل کر ڈالو، یا مدینہ سے نکال دو،
حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح	ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے، اور تم کو
نسائکم (سنن ابوداؤد ص ۱ جلد ۲ باب خبر النضیر)	فنا کر کے تمھاری عورتوں پر تصرف کریں گے،

جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبد اللہ کے پاس تشریف لے گئے

لہ بخاری باب (التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین) " س

اس کو سمجھایا کہ "کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے"، چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے عبد اللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا، بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا، اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بنو الحارث بن خزرج کے محلہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے، ایک جگہ مشرکین و منافقین مدینہ، یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے، گدھے کے چلنے سے گرد اڑی، تو عبد اللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا، اور حقارت سے بولا "گرد نہ اڑاؤ"، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجمع کو سلام کیا، اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں، عبد اللہ نے کہا "اے شخص مجھ کو پسند نہیں، اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آ کر ہم کو نہ ستایا کرو، جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو" مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے، اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے، آخر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دونوں کو ٹھنڈا کیا)

اسی زمانہ کے قریب حضرت سعد بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے، عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے، امیہ بن خلف سے اور ان سے دوستی کا یارانہ تھا، اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا، اس تعلق سے حضرت سعد اب بھی امیہ ہی کے مہمان ہوئے، ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے، اتفاق سے ابو جہل سامنے سے آ گیا، امیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا "سعد ہیں"، ابو جہل نے کہا تم لوگوں نے

[1] صحیح مسلم صفحہ ۹۲ جلد ۲ و بخاری باب مذکور۔

صابیوں (کفار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے، میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آسکو، خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے، تو تم بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے" حضرت سعدؓ نے کہا، "اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے"۔ (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا، اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے، سب قریش کے زیر اثر تھے، اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا، ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے، چنانچہ ۵ھ میں جب بحرین سے عبد القیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو آپ تک پہنچنے نہیں دیتے، اس لیے ہم ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے، آپ کی خدمت میں آسکتے ہیں۔[3]

قریش نے ان ہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ انہوں نے عبد اللہ بن ابی کو لکھا تھا، اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں، مدت تک حال رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگ کر بسر کرتے تھے، صحیح نسائی میں ہے۔

---

[1] یہ پورا واقعہ مع تفصیل کتاب صحیح بخاری باب المغازی کی ابتدا میں مذکور ہے۔ [2] ابن ہشام واقعات وفود میں ہے [illegible]
ان قریشا کانوا امام الناس ... وقادة العرب لا ینکرون ذلک وکانت قریش هی التی نصبت لحرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [3] وفد بنی عبد القیس کے ذکر میں صحیح بخاری اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اول	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول جب مدینہ میں
ما قدم المدينة يسهر من الليل	آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا" چنانچہ حضرت سعد وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپ نے آرام فرمایا، اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں،

عن ابی بن کعب قال لما قدم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ
رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه	جب مدینہ آئے، اور انصارؓ نے
المدينة واوتهم الانصار	ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ
رمتهم العرب عن قوس واحدة	ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے، صحابہ
وكانوا لا يبيتون الا بالسلاح	رضی اللہ عنہم صبح تک ہتھیار باندھکر
ولا يصبحون الا فيه[1]	سوتے تھے۔

مورخین مغازی کی ابتدا، ان ہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال خدا نے جہاد کی اجازت دی لیکن ایک دقیقہ میں انہی کی تصریحات سے پتہ لگ سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ خدا نے ۱۲ صفر ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی، اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے،

---

[1] لباب فی اسباب النزول للسیوطی سورۂ نور آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ الخ، مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔

اول آیۃ نزلت فی الاذن	پہلی آیت جو قتال کی اجازت مین نازل ہوئی
بالقتال اذن للذین یقاتلون	وہ یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ، جن سے لڑائی
بانھم ظلموا وان اللہ علی	کیجاتی ہے (مسلمان)، ان کو بھی اب لڑنے کی
نصرھم لقدیر	اجازت دیجاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا جارہا ہے
(زرقانی بحوالۂ صحیح نسائی جلد ا ص ٣٣٠)	اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے،

تفسیر ابن جریر مین ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ	اور خدا کی راہ مین ان لوگون سے لڑو
یُقَاتِلُوْنَکُمْ (بقرہ - ٢٤)	جو تم سے لڑتے ہین،

لیکن غور سے دیکھو دونون آیتون مین ان ہی لوگون سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانون سے لڑنے آتے ہین، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کیے جاتے تھے،

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ مین آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی، بلکہ انصار کی بھی، کیونکہ اس جرم مین کہ انصار نے مسلمانون کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کرلیا، اور اپنے تمام قبائل متحدہ مین یہ آگ بھڑکا دی تھی، اس بنا پر آپ نے دو تدبیرین اختیار کین، اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی بند کردیجائے، تاکہ وہ صلح پر مجبور ہوجائین اور یاد ہوگا کہ حضرت سعد بن معاذ نے مکہ مین ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی، دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب وجوار کے جو قبائل ہین، ان سے امن وامان کا معاہدہ ہوجائے،

(غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں، ابوا کی مہم سے پہلے بذاتِ خاص آپ نے کسی مہم میں شرکت نہیں کی، اس ابوا کی مہم سے پہلے جو صفر سنہ ۲ھ میں واقع ہوئی، اور جس میں آپ نے خود شرکت فرمائی تھی، اربابِ سیر نے تین مہم کا ذکر کیا ہے، جن کو ان کی زبان میں "سریہ" کہتے ہیں سریۂ حمزہؓ، سریۂ عبیدہ بن حارث، سریۂ سعد بن ابی وقاص، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت و خون نہیں ہوا، یا بیچ بچاؤ ہو گیا یا بچ کر نکل گئے، اربابِ سیر نے سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لیے بھیجے جاتے تھے، یعنی حضرت سعدؓ کی تصریح کے مطابق ان کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا، مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارتگری کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اولاً تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت گناہ ہے، ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہؓ نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟)

بدر سے پہلے جو مہمیں بھیجی گئیں

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لیے مہم بھیجی گئی، ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے، جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا، اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا، ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں تعلقات رکھیں گے، یعنی دونوں

جہینہ

۱؎ اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور پر نہیں کیا، بلکہ جہاں سب سے پہلے سریۂ حمزہ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہنی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے، وکان موادعاً للفریقین یعنی اس نے دونوں فریق سے صلح کر رکھی تھی،

سے الگ رہین گے،

صفر سنہ ۲ھ مین آپ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے، اور ابوا تک گئے (جس کے قریب ہی غزوۂ ابوا یا غزوۂ وَدّان واقع ہوا) اور جہان آپ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے، ابوا کا صدر مقام فرع ہے، جو ایک وسیع قصبہ ہے، اور جہان قبیلۂ مزینہ آباد ہے، اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے، یہ مدینہ کی اخیر سرحد ہے، ان اطراف مین قبیلۂ بنو ضمرہ آباد تھا، اور یہ نواح اُن کی حدود حکومت مین داخل تھے، یہان آپ نے چند روز قیام کرکے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا، جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا، معاہدہ کے یہ الفاظ تھے،

هذا كتاب من محمد رسول الله	یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر
لبني ضمرة فانهم آمنون على	ہے، بنو ضمرہ کے لیے، ان لوگون کا جان
اموالهم وانفسهم وان لهم	اور مال محفوظ رہے گا، اور جو شخص
النصر على من رامهم الا ان	ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلہ
يحاربوا في دين الله ما بل بحر	مین ان کی مدد کی جائے گی، بجز اس
صوفة وان النبي اذا دعاهم	صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ مین
لنصره اجابوه (لخذروص ١٠٠١	لڑین، اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے
ج ٢ ص ٥٠، وزرقانی ج ١ ص ٣٩١)	بلائین گے تو یہ مدد کو آئین گے۔

تمام محدثین مغازی کی ابتدا، اسی واقعہ سے کرتے ہین، صحیح بخاری مین بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے،

قریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا، مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مویشی لوٹ لیے، اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے)

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینے آپ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذو العشیرہ پہنچ کر بنو مدلج سے معاہدہ کیا، یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل ینبوع کے نواحی میں ہے۔

بنو مدلج، بنو ضمرہ کے حلیف تھے، اور چونکہ بنو ضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے انھوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کر لیں[1]،

چند روز کے بعد یعنی رجب ۲ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) ابن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا، یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے، آپ نے حضرت عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) کو ایک خط دے کر فرمایا تھا،

---

[1] اصابہ ذکر کرز فہری ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مورخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مقصد قریش کے کاروان کا لوٹنا تھا لیکن اتفاق سے کاروان ہاتھ نہ آیا، اور بچ کر نکل گیا؛ لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں، اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا، اس سے آگے مورخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کاروان پر حملہ کرنا مقصود تھا گو یہ مقصود نہ حاصل ہو سکا، گر خدانخواستہ کاروان کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عیاذاً باللہ بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر دفعہ ناکامیابی ہوتی تھی، اور قافلہ بچ بچ کر نکل جاتا تھا، یہاں تک کہ بار بار کے تجربہ کے بعد بھی بدل رہیں، اس قسم کی ناکامیابی ہوئی، اور قافلہ صحیح و سلامت نکل گیا،

کر دو دن کے بعد اس کو کھولنا، حضرت عبد اللہؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ "مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو"۔ اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لیے آتے تھے، سامنے سے نکلے، حضرت عبد اللہؓ نے ان پر حملہ کیا، ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا، حضرت عبد اللہؓ نے مدینہ میں آکر یہ واقعہ بیان کیا، اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی"، غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپ نے انکار فرمایا صحابہؓ نے حضرت عبد اللہؓ نہایت برہم ہو کر کہا۔

صنعتم ما لم تؤمروا به وقاتلتم	تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹا) جس کا تم کو
فی الشھر الحرام ولم تؤمروا	حکم نہیں دیا گیا تھا، اور ماہ حرام میں لڑے
بقتال (طبری ص ۱۲۷۵)	حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا،

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا، عبد اللہ حضرمی کا بیٹا تھا، جو حرب بن امیہ (امیر معاویہ کے دادا) کا حلیف تھا[۱] حرب قریش کا رئیس اعظم تھا، اور عبد المطلب کے بعد ریاست عام اُسی کو حاصل ہوئی تھی، جو لوگ گرفتار ہوئے یعنی عثمان و نوفل دونوں مغیرہ کے پوتے تھے[۲]، مغیرہ ولید کا باپ حضرت خالدؓ کا دادا، اور حرب کے بعد دوسرے درجہ کا رئیس تھا، اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا، اور شاہ یعنی انتقام خون کی بنیاد قائم ہو گئی، معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ

۱؎ اصابہ ترجمہ علاء حضرمی ۲؎ طبری ص ۱۲۷۴

سے وابستہ ہے، حضرت عروہؓ بن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، انھوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے، علامہ طبریؒ[1] لکھتے ہیں:-

وکان الذی هاج وقعة بدرٍ	اور جس نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور
وسائر الحروب التی کانت بین	وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں جو آنحضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبین مشرکی	صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین
قریش فیما قال عروة بن الزبیر	قریش میں پیش آئیں سب کا سبب
ماکان من قتل واقد بن عبد اللہ	یہی تھا کہ واقد تمیمی نے حضرمی کو
التمیمی عمرو بن الحضرمی	قتل کر دیا تھا،

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے، اس لیے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

---

(۱) ص ۱۲۸۴ س

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

رمضان ۲ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے، جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے، یہ مقام اس نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گذار گھاٹیوں میں سے ہو کر گذرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے،

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن اُبی کو انھوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کردو، یا ہم آکر اُن کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں، کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آکر غارت گری کر گیا تھا۔

حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارفِ جنگ کا بندوبست تھا، اس لیے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی[1]، کل کی کل دے دی،

[1] ابن سعد ص، میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے واللہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں، اُن کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا، قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آگیا جس نے قریش کی آتش غضب کو اور بھڑکا دیا۔

اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کے لوٹنے کو آرہے ہیں،

قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہؓ کو جمع کیا، اور واقعہ کا اظہار فرمایا، حضرت ابوبکرؓ وغیرہ نے جاں نثارانہ تقریریں کیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے، جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا "کیا حضورؐ کا اشارہ ہماری طرف ہے؛ خدا کی قسم آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

صحیح مسلم کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ "ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے لڑیں گے"۔ اُن کی اس تقریر سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چہرہ چمک اٹھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۵) لیُنش وصاعدا لا بعث بہ معنا ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی، اس لیے انھوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا، لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے لگا دینے کی ضرورت کیا تھی۔

غرض ۱۲ رمضان سنہ ۲ھ کو آپ تقریباً تین سو جان نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے، ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا، جو کم عمر تھے واپس کر دئیے گئے کہ ایسے پرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں، عمیر بن ابی وقاص ایک کمسن بچہ تھے، جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی، عمیرؓ کے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی[۱]، اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے، چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لیے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا، اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں، عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا، ان انتظامات کے بعد آپ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی، دو خبر رساں بسیسہ اور عدی آگے روانہ کر دیے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں، روحا، منصرف، ذات اجذال، معلاۃ، اثیل سے گذرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے، خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آگئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں رک گئے، اور فوجیں اتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے، ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا، رؤسائے قریش سب شریک تھے، ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، اس لیے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا، رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس ابن مطلب، عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل

[۱] ابن سعد ص ۸ ۔ [۲] منتخب کنز العمال بروایت ابن عساکر۔

امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے، اور لوگون کو کھلاتے تھے،[1]

عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا، فوج کا سپہ سالار تھا،

قریش کو بدر کے قریب پہنچکر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے، تو قبیلہ زہرہ و عدی کے سردارون نے کہا، "اب لڑنا ضرور نہیں،" لیکن ابوجہل نے نمانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے، باقی فوج آگے بڑھی،

قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے، انھون نے مناسب موقعون پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اسکے مسلمانون کی طرف چشمہ یا کنوان تک نہ تھا، زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹون کے پانون ریتی مین دھنس دھنس جاتے تھے، حضرت حبابؓ بن منذر نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت مین عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے، وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہین ہے۔" حضرت حُبابؓ نے کہا، تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئین بیکار کر دیے جائین۔" آپؐ نے یہ راے پسند فرمائی، اور اسی پر عمل کیا گیا، تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا، جس سے گرد جم گئی، اور جابجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئین، اس قدرتی احسان کا خدا نے قرآن مجید مین بھی ذکر کیا ہے،

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ	اور جب کہ خدا نے آسمان سے پانی
مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ (انفال ۲۰)	برسایا کہ تم کو پاک کرے،

[1] معارف ابن قتیبہ (باب سماء المطعمین من قریش فی غزاۃ بدر) و سیرۃ ابن اسحاق بروایت ابن ہشام غزوۂ بدر [2] ابن ہشام

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا، لیکن ساقی کوثر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیض عام تھا، اس لیے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی[1]، یہ رات کا وقت تھا، تمام صحابہ نے بے فکر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا، لیکن صرف ایک ذات تھی (ذات نبوی) جو صبح تک بیدار اور مصروف دعا رہی صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لیے آواز دی، بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا[2]۔

قریش جنگ کے لیے بیتاب تھے، تاہم کچھ نیک دل بھی تھے، جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے، ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردار فوج عتبہ سے جا کر کہا "آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے"۔ عتبہ نے کہا کیونکر؟ حکیم نے کہا قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے، وہ آپ کا حلیف تھا، آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے! "عتبہ نیک نفس آدمی تھا، اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا، لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضرور تھا، حکیم عتبہ کا پیغام لیکر گئے، ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا، عتبہ کا پیغام سنکر بولا، ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دیدیا، عتبہ کے فرزند حضرت ابوحذیفہؓ اسلام لاچکے تھے، اور اس معرکہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ آئے تھے۔ اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لیے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو بلا کر کہا، دیکھتے ہو تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آکر نکلا جاتا ہے، عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ ص ۲۰، [2] منتخب کنز العمال غزوۂ بدر، بہ روایت مسند ابن حنبل و ابن ابی شیبہ۔

واعموہ واعموہ کا نعرہ مارنا شروع کیا، اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگادی،

عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا، اور کہا میدانِ جنگ بتادیگا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے، یہ کہکر مغفر مانگا، لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا، مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا، اور لڑائی کے ہتھیار سجے،

چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے صحابہؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپ اس میں تشریف رکھیں، حضرت سعد بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے،

اگرچہ بارگاہِ الٰہی سے فتح ونصرت کا وعدہ ہوچکا تھا، عناصرِ عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں، تاہم عالمِ اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصولِ جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا، خزرج کے علمبردار حضرت خبابؓ ابن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے،

صبح ہوتے ہوتے آپ نے صف آرائی شروع کی، دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اس کے اشارے سے صفیں قائم کرتے تھے کہ کوئی شخص تل بھر آگے پیچھے نہ رہنے پائے، لڑائی میں شور وغل عام بات ہے لیکن منع کردیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے،

اس موقع پر بھی جب کہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی، اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی اگر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمہ تن وفا تھے، حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور حضرت حسیلؓ دو صحابی کہیں سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے

روکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کو جارہے ہو، انھوں نے انکار کیا، اور عدم شرکت کا وعدہ کیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا ہم ہرحال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے،[1]

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں، حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام،

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ	جو لوگ باہم لڑے اُن میں تمھارے لیے
الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	عبرت کا نشان ہے، ایک خدا کی راہ میں
وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ (آل عمران ۲)	لڑ رہا تھا اور دوسرا منکر خدا تھا،

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی، دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے "خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر" محویت اور بےخودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی، اور آپ کو خبر تک نہ ہوتی تھی کبھی سجدے میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے، تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا۔"

اس بیقراری پر بندگانِ خاص کو رقت آگئی حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی حضور خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا، آخر روحانی تسکین کے ساتھ

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ	فوج کو شکست دیجائے گی اور وہ
(قمر۔۳)	پشت پھیردیں گے،

[1] صحیح مسلم (باب الوفا بالعہد کتاب الجہاد والسیر) ص

بڑھتے جوئے، لب مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے،

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں، تاہم آپ نے صحابہؓ کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائیں تو تیر سے روکو،

یہ معرکہ ایثار اور جانبازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا، دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے، تو حضرت ابوبکرؓ تلوار کھینچکر نکلے[1] عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو نکلے، حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی،

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا، آگے بڑھا، مہجع حضرت عمرؓ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا،[2]

عتبہ جو سردار لشکر تھا، ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا، سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا، اور مبارز طلبی کی، عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدان جنگ میں جاتے تھے، عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے، حضرت عوفؓ حضرت معاذؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصار ہیں، تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف خطاب کرکے پکارا کہ محمد! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد سے

۱؎ استیعاب ذکر عبد الرحمن بن ابی بکرؓ ۲؎ سیرت ابن ہشام ص ۴۴۸ مطبع محمد علی مصر، ۳؎ کتب حدیث

مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے چونکہ یہ لوگ خود پہنے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے، عتبہ نے پوچھا تم کون ہو، سب نے نام بتائے، عتبہ نے کہا "ہاں اب ہمارا جوڑ ہے"۔

عتبہ حضرت حمزہؓ سے اور ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا اور دونوں مارے گئے لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کیا، حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے، حضرت عبیدہؓ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا کہ میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ فرمایا "نہیں تم نے شہادت پائی"۔ حضرت عبیدہؓ نے کہا "آج ابو طالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے اس شعر کا مستحق میں ہوں"[۲]۔

ونسلمه حتى نصرع حوله	ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دشمنوں کے [illegible]
ونذهل عن ابنائنا والحلائل	جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم [illegible]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۲) میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابوداؤد (کتاب الجہاد) میں ہے کہ عتبہ نے کہا [illegible] غرض ہے، تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ اس کا [illegible] انتقام خون کا مطالبہ قریش کر کے معصور ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عرب انصار کو [illegible] روایتوں میں مذکور ہے کہ ابو جہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا کاش مجھ کو [illegible] مارا ہوتا، انصار کھیتی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔ [۱] ابن سعد غزوۂ بدر و [illegible]

[۲] زرقانی ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں، اور قریباً سب ہم رتبہ ہیں، ایسے جزئیات [illegible]

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا، اور پکارا کہ میں ابوکرش ہوں" حضرت زبیرؓ اس کے مقابلہ کو نکلے، اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری، وہ زمین پر گرا اور مرگیا، برچھی اس طرح پیوست ہوگئی تھی کہ حضرت زبیرؓ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا، تو بڑی مشکل سے نکلی لیکن دونوں سرے خم ہوگئے، یہ برچھی یادگار رہی یعنی حضرت زبیرؓ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مانگ لی پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس آئی،[1]

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی چنانچہ ان کے بیٹے (عروہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑے تھے، وہ لڑتے لڑتے کرگئی تھی، چنانچہ جب حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروہ سے کہا تم زبیرؓ کی تلوار پہچان لوگے؟ انھوں نے کہا ہاں، عبدالملک نے پوچھا کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑگئے تھے عبدالملک نے تصدیق کی، اور یہ مصرع پڑھا، بھن فلول من قراع الکتاب عبدالملک نے تلوار عروہ کو دیدی، انھوں نے اس کی قیمت لگوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا،[2]

اب عام حملہ شروع ہوگیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے، لیکن ادھر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) سربسجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا،

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بدر میں پورا واقعہ منقول ہے [2] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری غزوۂ بدر کے ذکر میں ہے،

ابوجہل کی شرارت اور دشمنیِ اسلام کا عام چرچا تھا، اس بنا پر انصار مین سے معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیون نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہان نظر آئے گا، یا اس کو مٹا دین گے یا خود مٹ جائین گے،

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ مین صف مین تھا کہ دفعۃً مجھکو داہنے بائین دو نوجوان نظر آئے، ایک نے مجھ سے کان مین پوچھا کہ ابوجہل کہان ہے؟ مین نے کہا برادر زادہ! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ "مین نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہان دیکھ لون گا یا اُسے قتل کر دون گا، یا خود لڑکر مارا جاؤن گا؟ مین جواب نہین دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانون مین یہی باتین کہین، مین نے دونون کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے، بتانا تھا کہ دونون باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا، دونون جوان عفراءؓ کے بیٹے تھے[1] "معوذ و معاذ" ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذ کے بائین شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا، لیکن تسمہ باقی لگا رہا، معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا، معاذ اسی حالت مین لڑ رہے تھے، لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤن کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہوگیا، اور اب وہ آزاد تھے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ "کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہین، ان مین ایسے بھی لوگ ہین جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہین"، ان لوگون کے نام بھی آپ نے بتا دیے تھے، ان مین ابوالبختری بھی تھا، مجذر کی نظر (جو انصار کے حلیف تھے) ابوالبختری پر پڑی، مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

---

[1] بعض روایتون مین معاذ بن عمرو و معاذ بن عفراء ہے،

تیرے قتل سے منع فرمایا ہے، اس لیے تجھ کو چھوڑ دیتا ہون، ابو البختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا، ابو البختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا نہین"، ابو البختری نے کہا تو مین خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہین سن سکتا کہ ابو البختری نے اپنی جان بچانے کے لیے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا، یہ کہکر ابو البختری یہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔

لن یسلم ابن حرۃ زمیلہ	شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہین سکتا
حتی یموت او یری سبیلہ	جبتک کہ مر نہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے

عتبہ اور ابو جہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا، اور فوج مین بے دلی پھیل گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگ بدر مین شریک تھا، حضرت عبد الرحمن بن عوف نے اس سے کسی زمانہ مین معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ مین آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہون گے، بدر مین اس دشمن خدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا، لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے، حضرت عبد الرحمن بن عوف نے چاہا کہ وہ بچکر نکل جائے۔ اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے، اتفاق یہ کہ حضرت بلال نے دیکھ لیا، انصار کو خبر دی۔ دفعۃً لوگ ٹوٹ پڑے، انھون نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا، لوگون نے اس کو قتل کر دیا، لیکن اس پر بھی قناعت نہین کی اور امیہ کی طرف بڑھے۔ انھون نے امیہ سے کہا کہ تم زمین پر لیٹ جاؤ، یہ لیٹ گیا تو اس پر چھا گئے کہ اس کو مارنے نہ پائین، لیکن لوگون نے ان کی ٹانگون کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا، حضرت عبد الرحمن

کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا۔[1]

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈالدی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا،

حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی)، نوفل، اسود بن عامر، عبد اللہ بن زمعہ، اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ کوئی شخص جاکر خبر لائے، ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے جاکر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا، بولے تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا، تو یہ فخر کی کیا بات ہے[2] ابوجہل نے ایک دفعہ ان کو پتھر مارا تھا، انھوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ ابوجہل نے کہا او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدموں پر ڈال دیا،[3]

مغربی مورخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب ظاہری کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا، کیونکر فتح پائی لیکن تائید آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں، تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں، اول تو قریش میں باہم اتفاق

---

[1] یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے، لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالہ میں ہے اس لیے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی۔ [2] بخاری غزوۂ بدر۔ [3] ایضاً

نہ تھا، عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلۂ زہرہ کے لوگ بدر تک آکر واپس چلے گئے، پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ قریش جہان صف آرا تھے، وہان کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا، قریش مرعوب ہوکر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے یعنی اپنی تعداد سے دوگنا، چنانچہ قرآن مجید مین ہے،

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ	وہ اپنی آنکھون سے مسلمانون کو اپنے آپ
(آل عمران ۲۰)	سے دوگنا دیکھ رہے تھے،

کفار کی فوج مین کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود دست مبارک مین تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفین درست کی تھین، مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے، بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے،

تاہم یہ اسباب ہین، ان کا اجتماع اور تہیہ بھی تائید الٰہی ہے، پھر قریش اور مسلمانون کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانون کی فتح کی مقتضی تھی، قریش کی فوج مین بڑے بڑے دولتمند تھے، جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانون کے پاس کچھ نہ تھا، قریش کی تعداد ایک ہزار تھی، مسلمان صرف ۳۰۰ سو تھے، قریش مین ۱۰۰ سوار تھے، مسلمانون کی فوج مین صرف دو گھوڑے تھے، مسلمانون مین بہت کم سپاہی تمام ہتھیارون سے پورے تھے، اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے مین غرق تھا،

بااین ہمہ خاتمۂ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانون مین سے صرف ۱۴ شخصون نے شہادت پائی

جن میں ۱۴ مہاجر اور باقی انصار تھے، لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی، اور رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کرکے مارے گئے، ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اسیران جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کردیے گئے، باقی گرفتار ہوکر مدینہ میں آئے، ان میں حضرت عباسؓ، عقیل، حضرت علیؓ کے بھائی، ابوالعاص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد) بھی تھے،[۱]

لڑائیوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپ اسکو زمین میں دفن کرادیتے تھے، لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا، ایک وسیع کنواں تھا، تمام لاشیں آپنے اس میں ڈلوادیں لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ جگہ سے ہٹائی جاوے، اس لیے وہیں خاک میں دبادی گئی،

اسیران جنگ جب مدینہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے آئے تو حضرت سودہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں، ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمرو بھی تھے، ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے بھی عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہوسکا کہ لڑکر مرجاتے،[۲]

اسیران جنگ دو دو، چار چار صحابہؓ کو تقسیم کردیے گئے، اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ

---

[۱] روض الانف [۲] ابن ہشام

رکھے جائیں، صحابہؓ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے، اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے، جو حضرت مصعبؓ بن عمیر کے بھائی تھے، ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھدیتے، اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی، اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیدیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے، اور مجھی کو واپس دیتے، اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔[1]

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا، اور عام مجمعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا، (مثلہ) تو گو نبی ہوں، لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضا بھی بگاڑے گا۔[2]

حضرت عباسؓ (کے بدن پر کرتا نہ تھا لیکن ان) کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتا ان کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین نے کہ حضرت عباسؓ کا ہم قد تھا، اپنا کرتا منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کیلئے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا، وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔[3]

جنگ
عام روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیران

---

[1] طبری ص ۱۳۳۷، [2] ایضاً ص ۱۳۴۴، [3] صحیح بخاری ص ۴۲۲ (باب الکسوۃ للاساری)

کے معاملہ مین کیا کیا جائے حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب مین فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائین، لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ مین دوست دشمن عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لیے انھون نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیے جائین، اور ہم مین سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی، اور فدیہ لیکر چھوڑ دیا، اس پر خدا کا عتاب آیا، اور یہ آیت اتری،

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال ۹)

اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا، اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے،

یہ روایت تمام تاریخون مین مذکور اور احادیث مین بھی موجود ہے، لیکن سبب عتاب کے بیان مین اختلاف ہے، ترمذی مین جو روایت ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مال غنیمت کے متعلق احکام نہین آئے تھے، عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ غنیمت مین مصروف ہو گئے، اس پر عتاب آیا، لیکن چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہین دیا گیا تھا، اس لیے یہ جرم معاف کر دیا گیا، اور حکم آیا کہ مال غنیمت جو ہاتھ آیا حلال ہے،

قرآن مجید مین عتاب کے بعد یہ الفاظ ہین،

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا (انفال-۹)

تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے،

اس آیت مین صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا، وہ حلال کر دیا گیا، اور وہ مال غنیمت

تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے، یا مال غنیمت کے لوٹنے پر تھا، صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپ رونے لگے، اور حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا ابکی ی عرض علی اصحابک من اخذھم الفداء (یعنی تمھارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا اس پر میں رو رہا ہوں" عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیران جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے،[1]

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ	کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی
اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ	طرح خونریزی کرنے کے لیے لوگوں کو
(انفال ۹)	قیدی بنائے،

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدان جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے، قیدی بنانا مناسب نہیں، اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لیے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کیے جا سکتے ہیں،

بہرحال اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوڑ دیے گئے، ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے، ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیے جائیں گے، حضرت زید بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا،[2]

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۴۷ [2] طبقات ابن سعد ص ۱۴

انصار نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباسؓ ہمارے بھانجے ہیں، ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا[1]، اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا، فدیہ کی عام مقدار ۴ ہزار درہم تھی لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباسؓ دولتمند تھے، اس لیے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی، انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شکایت کی، لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی، اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے، لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباسؓ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے، لوگوں نے ان کی گرہ کھولی تو آپ نے فرمایا)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد ابو العاص بھی اسیران جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں، حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا، حضرت زینبؓ نے زرِ فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آگیا، آپ بے اختیار رو پڑے، اور صحابہ سے فرمایا کہ تمھاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو، سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور ہار واپس کر دیا[2]،

---

[1] بخاری ص ۵۷۲ جلد اول کتاب المغازی [2] تاریخ طبری ص ۱۳۴۸ و ابوداؤد

ابو العاص رہا ہو کر مکہ آئے، اور حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا، ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے، چند سال کے بعد بڑے سرو سامان سے شام کی تجارت لیکر نکلے، واپسی مین مسلمان دستون نے ان کو مع تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہوگیا، یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، انھون نے پناہ دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگون سے فرمایا کہ اگر مناسب سمجھو تو ابو العاص کا اسباب واپس کردو، پھر تسلیم کی گردنین جھک گئین، اور سپاہیون نے ایک ایک دھاگا تک لا لا کر واپس کر دیا، اب یہ وار ایسا نہ تھا جو خالی جاتا، ابو العاص مکہ آئے، اور تمام شرکا کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے، اور کہدیا کہ مین اس لیے یہان آکر اور حساب سمجھا کر ہوا ہون تاکہ یہ نہ کہو کہ ابو العاصؓ ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہوگیا[1]

بدر کی خبر مکہ مین پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا، لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرادی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے، اس لڑائی مین اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے، اس کا دل امنڈا آتا تھا لیکن قومی غیرت کے خیال سے رو نہین سکتا تھا، اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے، نوکر سے کہا دیکھنا کون ہے، کیا رونے کی اجازت ہو گئی میرے سینہ مین آگ لگ رہی ہے، جی کھول کر رو لون تو تسکین ہو جائے، نوکر نے آکر کہا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہوگیا ہے اس کے لیے رو رہی ہے، اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے،

ابتکی ان یضل لھا بعیر — اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے

ویمنعھا من النوم السھود — اور اس کو نیند نہیں آتی (اونٹ)

وابکی علی بکرو شکن — پر مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں

علی بدر تقاصرت الجدود — قسمت نے کمی کی، تجھکو رونا ہے

فبکی ان بکیت علی عقیل — تو عقیل پر رو اور حارث پر رو

وبکی حارثا اسد الاسود — جو شیروں کا شیر تھا۔"

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے صفوان نے کہا خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں" عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی، اور مدینہ پہنچا حضرت عمر نے اس کے تیور دیکھ لیے، گلا دبائے اس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے، آپ نے فرمایا عمر! چھوڑ دو، عمیر قریب آجاؤ، پوچھا کس ارادہ سے آئے، جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں" فرمایا کیوں نہیں، تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھکر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر یہ کی بات سن کر سناٹے میں آگیا بے اختیار ہو کر بولا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بیشک تم پیغمبر ہو، بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی، قریش جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے، انھوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی،

حضرت عمیرؓ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے، جہان کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانون کے خون کا پیاسا تھا، ان کو اسلام کے دوستون سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی، اسی شدت سے وہ دشمنانِ اسلام کے دشمن تھے، یہان پہنچکر انھون نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا، اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کردیا[1]

عزوۂ بدر کا بیان قرآن مین

(اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ خود خدا نے اپنے کلام پاک مین اس کا مفصل ذکر کیا ہے، اور ایک خاص سورۃ (انفال) بدر کے احسانات و نعم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقۂ بدر کی توضیح کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لیے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہین،

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ	مومن وہ ہین کہ جب خدا کا نام لیا جائے
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا	تو ان کے دل دہل جائین اور جب اسکی
تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ	آیتین پڑھ کر سنائی جائین تو ان کا ایمان
اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ	بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا	ہین، جو نماز پابندی پڑھتے ہین، اور
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ	خدا نے جو ان کو روزی دی ہے اس سے
هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ	راہِ خدا مین بھی کچھ دیتے ہین، یہ ہین سچے

[1] یہ تمام واقعات تاریخ طبری مین بحوالۂ عروہ بن زبیر مذکور ہین، ص ۱۳۵۴

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ	مومن، اُن کے لیے خدا کے پاس درجے ہیں،
كَرِيْمٌ ۝ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ	بخشش ہے، اور اچھی روزی ہے جس طرح
مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ص وَاِنَّ	اے پیغمبر تیرا خدا تجھ کو حق پر تیرے گھر سے
فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ	(بدر تک) نکال لایا، حالانکہ مسلمانوں کا
يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا	ایک گروہ اس سے ناخوش تھا، وہ تجھ سے
تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ	حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا ہے، گویا
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ	کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں
اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا	اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں، اور جب
لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ	خدا تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی
الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ	فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ
اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ	وہ تمہارے لیے ہے، تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ
دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ	والا گروہ تم کو مل جائے، یعنی قافلہ، اور
وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ	خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت
اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ	کرے اور باطل کو مٹائے، گو گنہگار اس سے
لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ	رنجیدہ ہوں، یاد کرو جب تم اپنے
الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ	پروردگار سے فریاد کر رہے تھے، اس نے
اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ	تمہاری سنی اور کہا میں تمہاری مدد کو

قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ
إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِنْهُ
وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ
رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ
قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ
إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي
مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي
فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا
مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا
اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ
وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ
ذٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ
عَذَابَ النَّارِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا

ہزار فرشتون سے مدد کرونگا، خدا نے یہ نصرت
مسلمانون کی خوشی اور اطمینان قلب کے لیے کی،
اور فتح تو صرف خدا کے پاس ہے، خدا غالب
دانا ہے، یاد کرو جب تمھارے چین کے لیے اپنی
طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان
سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک کرے اور
شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور تمھارے
دل مضبوط کرے، اور ثابت قدم رکھے، یاد کرو
جب خدا فرشتون کو حکم دے رہا تھا کہ مین تمھارے
ساتھ ہون مسلمانون کو ثابت قدم رکھنا، مین
کافرون کے دل مین رعب ڈال دونگا، کافرون
کی گردنین مارو، اور ہر جوڑ پر زد دو، یہ اسلیے کہ
انھون نے خدا اور خدا کے رسول کی دشمنی کی ہے، اور جو
خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کریگا، خدا اسکو
سخت عذاب دینے والا ہے، یہ ہے عذاب،
اس کا مزہ چکھو، کافرون کے لیے عذاب دوزخ ہے،
مسلمانو جب میدان جنگ مین کافرون کے

فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔ وَمَنْ
يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ اِلَّا مُتَحَرِّفًا
لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ
بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ ۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ فَلَمْ
تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَ
مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
رَمٰى ۔ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ
بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ
ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ
الْكٰفِرِيْنَ ۔ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ
جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۔ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۔ وَ
لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ
كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(انفال ۲)

(۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى

مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس کے کہ
لڑنے کے لیے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے
جو کوئی پشت پھیرے وہ خدا کا غضب لائیگا
اور اسکا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور کیا بُرا ٹھکانا ہے!
مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا لیکن
خدا نے مارا، اور اے محمد! تم نے نہیں پھینکا،
جب تم نے پھینکا لیکن خدا نے پھینکا تاکہ وہ اپنی
طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے، خدا
اور دانا ہے، اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور
کرنے والا ہے، اگر فتح چاہتے تھے تو فتح آ چکی
اب اگر رُک جاؤ تو بہتر ہو اور تم پھر شرارت پر
آمادہ ہوگے تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کرینگے،
یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں،
گو وہ کتنی ہی کثیر ہو، اور خدا مومنوں
کے ساتھ ہے!

(۲) اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اسکا
پانچواں حصہ خدا کے لیے اور اسکے رسول

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ	کے لیے، اہل قرابت کے لیے، یتیموں کے لیے،
اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ	مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے،
اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ	اگر خدا پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى	فرق کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں)
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اِذْ اَنْتُمْ	خدا نے اپنے بندے پر جو فتح اتاری اسکو
بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ	مان چکے جب دونوں فوجیں آمنے سامنے
الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ	آگئیں، اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے،
وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي	جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج
الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا	دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا،
كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ	اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے
هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى	آتے تو وقت میں خلاف ہو جاتا، لیکن (خدا
مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ	نے یہ اس لیے کر دیا) تاکہ جو ہونے والا تھا،
اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اِذْ يُرِيْكَهُمُ	خدا اس کو کر دے تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی
اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَلَوْ	دلیل دیکھ کر مرے، اور جس کو زندہ رہنا ہے
اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ	وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے، اور بیشک
لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ	خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، یاد کرو جب
اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ	خدا، تم کو جنگ کی حالت میں ان کو تھوڑا

الصُّدُوْرِ ﴿﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ
اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ
يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ
اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ
تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا
تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ
رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ
الصّٰبِرِيْنَ ﴿﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ
النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
مُحِيْطٌ (انفال)
(۳) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ
اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ

دکھا رہا تھا اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم
سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑا پڑتے لیکن خدا
نے محفوظ رکھا وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے
جب تمہاری نظر میں ان کو تھوڑا دکھا رہا
تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں تاکہ جو ہونے والا
ہے خدا اس کو پورا کرے اور اسی کی طرف تمام
معاملے پھرتے ہیں مسلمانو جب کسی دستہ فوج
سے مقابلہ پڑے تو ثابت قدم رہو اور خدا
کو اکثر یاد کیا کرو تاکہ کامیاب ہو اور خدا اور
اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو
ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی
مستقل رہو خدا مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور
ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں
سے مغرور ہو کر نمائش اور دکھاوے کیساتھ اور
خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور خدا
[illegible]
(۳) پیغمبر کیلئے یہ مناسب نہ تھا کہ اسکے پاس قیدی
ہوں تا آنکہ خوب سی خونریزی نہ کر لے تم دنیا کی

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ
يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ
لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ
فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ
فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا
وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (انفال)

دولت چاہتے ہو (قیدی ہونگے تو فدیہ ہاتھ آئیگا)
اور خدا آخرت چاہتا ہے خدا دانا اور توانا ہے اگر خدا
کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو فدیہ لے لیا
اس پر دردناک عذاب پہنچتا، اب جو کچھ تم کو
غنیمت میں ملا کھاؤ وہ حلال طیب ہے اور
خدا سے ڈرا کرو خدا غفور اور مہربان ہے،

(۴) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ
مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي
قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا
أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ
رَحِيمٌ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ
فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ
مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (انفال)

(۴) اے پیغمبر تمہارے ہاتھ میں جو قیدی
ہیں ان سے کہو کہ خدا اگر تمہارے دلوں میں
کچھ نیکی دیکھیگا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس سے
بہتر وہ نیکی عطا کریگا اور تمہیں معاف کریگا وہ بخشش
اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا
چاہتے ہیں تو اس سے پہلے وہ خدا کیساتھ خیانت کر چکے
ہیں اسی لئے تو خدا نے ان کو تمہارے قابو میں کر دیا ہے

خدا نے اسی احسان کو احد کے موقع پر یاد دلایا ہے،

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ
وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (آل عمران ۱۳)

یقیناً خدا نے تمہاری بدر میں مدد کی جب
تم کمزور تھے، تو خدا سے ڈرو تا کہ تم
شکر گزار بن جاؤ،

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مورخین نے بیان کیا ہے، کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا، یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا،

"میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمۂ دیوانی یا فوجداری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعۂ تاریخی نے مقدمۂ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اس لیے مجھ کو اپنے منصب سے ہٹ کر فصلِ مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے"

(اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے، سامنے کے کلام کے اچھی طرح پیشِ نظر رکھنے کے لیے ضرور ہے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہماری تحقیقات کے رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی،

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ

مین چھوٹی چھوٹی لڑائیان بھی پیش آگئین، دونون فریق ایک دوسرے سے بدظن رہتے تھے، اور جیسا کہ ایسی حالتون مین عام قاعدہ ہے، غلط خبرین خود بخود مشہور ہوکر پھیل جاتی ہین، اسی اثنا مین ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا، اور ابھی وہ شام ہی مین تھا کہ یہ خبر وہان مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہین، ابوسفیان نے وہین سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہوجائے، قریش نے لڑائی کی تیاریان شروع کردین، مدینہ مین یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آرہے ہین، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدافعت کا قصد کیا، اور بدر کا معرکہ پیش آیا،

اس بحث کے فیصلہ کے لیے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے جن پر دونون فریق کا اتفاق ہے تاکہ وہ انفصالِ بحث مین اصولِ موضوعہ کے طور پر کام آئین، وہ یہ ہین،

(۱) قرآن مجید مین اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ مین کسی اور روایت کا اعتبار نہ کیا جائے گا؟

(۲) کتبِ حدیث مین صحت کے لحاظ سے باہم جو فرقِ مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا،

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہین، تو آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہوکر ان کا استمزاج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر سعد بن عبادہ کو کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا، یا رسول اللہ! کیا آپ کا روے سخن ہماری طرف ہے، ہم وہ لوگ نہین ہین جنھون نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ تم اور تمھارا خدا دونون

جا کر لڑو ہم یہین بیٹھے رہین گے، خدا کی قسم اگر آپ حکم دین تو ہم آگ اور سمندر مین کود پڑین،
یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہ مین کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید
مین تصریح ہے،

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ (انفال-۱) اور مسلمانون کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا،

عموماً ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار کی رضامندی
جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ مین جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی
تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کرین گے، یہ اقرار
نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑین گے، ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے کہ یہ واقعات
کہان (مدینہ یا راہ مین) پیش آئے؟ ارباب سیر لکھتے ہین کہ مدینہ سے جب آپ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر
حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجین لیے چلے آتے ہین، اس وقت
آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائین، آگے کے واقعات یہین
پیش آئے، لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتون سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے
پاس موجود ہے، (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے،

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ — جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق
بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ — پر نکالا اور ایک مسلمانون کا ایک گروہ اسکو
لَكَارِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ — پسند نہین کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے
بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ — پیچھے تجھ سے حق بات مین جھگڑا کرتے تھے، گویا

إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝ وَ	کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں، اور موت کو
إِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ	آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور جبکہ خدا تم سے وعدہ
أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ	کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہات
الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللّٰهُ	آ جائیگی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو
أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ	ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں
دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (انفال - ۱)	سے قائم کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے،

(۱) ترکیب نحوی کی رو سے وَاِنَّ میں جو واو ہے، حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے، کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے،

(۲) آیت مذکورہ میں بتصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اُس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروانِ تجارت، اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح سلامت بچکر نکل گیا تھا، اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے"، اسلیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو، اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

مدینہ میں تھے، اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں، کہ اُدھر ابوسفیان کاروانِ تجارت لیکر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں،

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورۂ بالا میں کفار کے وہ فریق کا خدا نے بیان کیا ہے، ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آرہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے، خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا،

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ	اور تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ
تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ	تم کو ہاتھ آجائے، اور خدا یہ چاہتا ہے کہ
يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ	اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے، اور
الْكٰفِرِيْنَ (انفال۔ ۱)	کافروں کی جڑ کاٹ دے،

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے، جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں،

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں، اُن میں فاتح خیبرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ سید الشہدا بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود

ایک شکر ہے، باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید مین بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے بچھ
صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے، اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منھ مین لیے جاتا ہے،

وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور مسلمانون کی ایک جماعت اور
لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ	تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہونے پیچھے بھی
بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ	جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف
إِلَى الْمَوْتِ (انفال - ۱)	ہنکائے جا رہے ہیں،

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلو تہی کس بنا پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیجے گئے تھے، اور کبھی ان کو ضرر نہین پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا تماشا ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہین، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی مین خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہین،

(۵) قرآن مجید مین ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپ مدینہ ہی مین تشریف رکھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورہ نساء مین تصریحاً مذکور ہے، آیت یہ ہے

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ	بجز معذورون کے، وہ لوگ جو بیٹھ رہے،
الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ	اور وہ لوگ جو خدا کی راہ مین جان اور مال
وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ	سے جہاد کرتے ہین، برابر نہین ہو سکتے

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ	خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں
عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً (نساء-۱۳)	فضیلت دی ہے،

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور جو شریک ہوئے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا "غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ" یعنی معذوروں کے سوا، یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے،

(۴) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے اُن کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ	اور (ان لوگوں کی طرح نہ ہو) جو اپنے
دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَ	گھروں سے مغرور، نمایشی اور خدا
يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (انفال)	کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیون کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگون کو روکتے ہوئے نکلے؟ اس میں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی، اور خدا کی راہ سے لوگون کو روکنا کیا تھا؟ البتہ چونکہ درحقیقت

مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمایش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا، اس لیے خدا نے اس کو غرور و نمایش اور صد عن سبیل اللہ کہا،

(قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے، لیکن حضرت کعبؓ بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لیے نکلے تھے،

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے:۔

عن عبد اللہ بن کعب قال کعب	کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لم اتخلف عن رسول اللہ صلی اللہ	کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا،
علیہ وسلم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ	بجز غزوۂ تبوک کے، اور ہاں غزوۂ بدر میں
تبوک غیر انی کنت تخلفت فی	بھی شریک نہ تھا، اور جو اس میں شریک نہ ہوا
غزوۃ بدر ولم یعاتب احد	اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا کیونکہ آنحضرت
تخلف عنھا انما خرج النبی	صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے نکلے
صلی اللہ علیہ وسلم یرید عیر قریش	تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک
حتی جمع اللہ بینہ وبینھم علی غیر میعاد	مقابل کر دیا،

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے:۔

۱۔ عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۱۔ انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

شاور حین بلغه اقبال ابی سفیان
قال فتکلم ابوبکرؓ فاعرض عنه
ثم تکلم عمرؓ فاعرض عنه فقام
سعد بن عبادة فقال ایانا
ترید یا رسول اللہ والذی نفسی
بیدہ لو امرتنا ان نخیضها البحر
لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب
اکبادها الی برک الغماد لفعلنا قال
فندب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم
الناس فانطلقوا حتی نزلوا
بدرا
ووردت علیهم روایا قریش و
فیهم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوہ
فکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم
یسئلونه عن ابی سفیان واصحابه
فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن
هذا ابوجهل وعتبة وشیبة و

[illegible]

کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی
تو آپ نے مشورہ طلب کیا۔ حضرت ابوبکرؓ
بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی پھر حضرت عمرؓ
بولے، آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی، پھر
حضرت سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہوئے اور
کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب
ہم انصار کی طرف ہے، خدا کی قسم اگر دریا میں
سوار ہو جانے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے،
اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیجئے تو ہم
کر دیں گے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے
بعد آپ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت
(۲) دورد ہیے قریش کا ہراول بدر تک آ پہنچا ان
میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، مسلمانوں
نے اس کو گرفتار کر لیا، اور اس سے ابو سفیان
کا حال پوچھنے لگے۔ وہ کہتا تھا مجھ کو ابو سفیان
کی خبر نہیں لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف
آ رہے ہیں، جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے،

امية بن خلف فاذا قال ذالك ضربوه	وہ کہتا اچھا ابو سفیان کو بتاتا ہوں تب اسکو
فقال نعم انا اخبركم هذا ابو سفيان	چھوڑ دیتے، تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو
فاذا تركوه فسألوه فقال مالي بابي	ابو سفیان کی خبر نہیں لیکن ابو جہل، عتبہ، شیبہ
سفيان علم ولكن هذا ابو جهل و	امیہ بن خلف وغیرہ سب قریش آرہے ہیں،
عتبة وشيبة وامية بن خلف في	لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے
الناس فاذا قال هذا ايضا ضربوه	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے آپ نے
ورسول الله صلى الله عليه وسلم قائم يصلي	یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے
فلما رأى ذالك انصرف قال والذي	ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے
نفسي بيده لتضربوه اذا صدقكم	تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ
وتتركوه اذا كذبكم (صحيح مسلم باب غزوه بدر)	بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو،

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابو سفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اسی وقت آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی، اور یہ متفقاً ثابت ہے کہ ابو سفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا، اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ ارباب سیر کے مطابق واقعہ یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے

خلاف شرکت کے لیے نکلے! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا، اور اس کے بعد شرکت کے لیے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے[۱] سے بوضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔

اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے، اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا، اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لیے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہو کہ جب مشرکین کی آمد کی خبر معلوم ہوئی، چنانچہ اسی واقعہ کو ان ہی الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل نے بھی، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن جریر نے تاریخ میں[۲] اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے، اور اس کو صحیح کہا ہے، اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسداللہ علی بن ابی طالب ہیں۔

عن علی قال لما قدمنا المدینۃ	حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے
اصبنا من ثمارھا فاجتویناھا	تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے نا موافق
واصابنا بھا وعک وکان النبی	مزاج تھے، اس لیے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم یتخبر عن بدر فلما	صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو پوچھا کرتے تھے جب
بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سا	ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آ رہے ہیں تو

[۱] جلد اول ص ۱۱۷، [۲] منتخب کنز العمال غزوۂ بدر، [۳] جلد ۳ صفحہ ۱۲۸۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی بدر و	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو چلے، بدر ایک
بدر بئر فسبقنا المشرکین الیہا،	کنوئیں کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین
(اس کے بعد بدر کے تمام واقعات وجزئیات مذکور ہیں)	سے پہلے پہنچ گئے

اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں، ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے)

ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں، لیکن لیطمئن قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے،

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لیے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لیکر سو سو، دو دو سو کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں، اور اس تصریح کی اس لیے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا، اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے،

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بنا پر آپ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا،

(۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا،
مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے، عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے
شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا، اس بنا پر اگر کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہو
تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آرہا ہے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو چکی ہے، اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں مکہ کی
طرف جاتے ہیں، اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا، اور
قریش سے جنگ پیش آجاتی ہے،

(۳) واقعات کی ترتیب یہ ہے:-

۱- قریش نے عبد اللہ بن ابی کو خط لکھا کہ "محمدؐ اور ان کے رفقاءؓ کو مدینہ سے نکال دو
ورنہ ہم مدینہ آکر تم کو برباد کر دیں گے"۔ (بحوالہ سنن ابی داؤد اوپر گذر چکا)

۲- ابو جہل نے سعد بن معاذ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ
کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر دیتا،

۳- کرز بن جابر نے جمادی الثانی ۲ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا، اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ لوٹ لیے،

۴- اس کے بعد ہی رجب ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن جحشؓ کو
کے لیے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں،

۵- عبد اللہ بن جحشؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف قریش کا ایک محترم

قافلہ لوٹ لیا، اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کیے،

قریش نے مکہ مین جو کچھ مسلمانون کے ساتھ کیا تھا، اس کو پیش نظر رکھو پھر خیال کرو کہ انکا جوش انتقام کسی طرح کم نہین ہوتا، اور وہ عبد اللہ بن ابی کو لکھتے ہین کہ ہم مدینہ آکر تم کو اور محمد دونون کو فنا کر دین گے، کرز فہری مدینہ پر چھاپہ مارتا ہے، اسی اثنا مین قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن جحش نے ان کا قافلہ لوٹ لیا، اور ان کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کر لیے، ان تمام باتون کے ساتھ قریش صبر کرتے ہین، اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہین کرتے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قافلہ کو جس مین مکہ کی کل کائنات تھی، لوٹنے کے لیے نکلتے ہین، تب مجبوراً ان کو مدافعت کے لیے نکلنا پڑتا ہے، اس پر بھی بدر تک پہنچکر جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو ان کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالار لشکر تھا، رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہین، واپس چلنا چاہیے، کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوش عداوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت کے مواقف ہے،

۴- ارباب سیر عموماً لکھتے ہین کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ مین صحابہؓ کو کاروانِ تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگون نے چندان مستعدی ظاہر نہین کی کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ درپیش نہین ہے، بلکہ صرف تحصیلِ غنیمت ہے، اس لیے جن لوگون کو مال کی حاجت تھی، وہ گئے، لیکن ہم دیکھتے ہین کہ انصار مین جس قدر اعیانِ قوم اور سرگروہ تھے سب گئے، زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے لیکن جانے والون مین انصار کی تعداد

مہاجرین سے دوگنی تگنی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جان نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ ومقدادؓ تھے، اور انصار میں حضرت سعدؓ بن عبادہ تھے[1] حضرت سعدؓ بن عبادہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جاسکے تھے، اس لیے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سعدؓ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا، اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہوگیا تھا، اور اس لیے یقینی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے،

۵۔ عام ارباب سیر، بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے، صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لیے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے جائے جس کا جی چاہے نہ جائے، طبری میں ہے،

قالوا لما سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت
بابی سفیان مقبلا من الشام ندب	صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کا شام سے واپس
المسلمین الیہم وقال ھذہ	ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا، اور فرمایا کہ یہ
عیر قریش فیہا اموالہم فاخرجوا	قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں ان کا مال ہے،
الیہا لعل اللہ ان ینفلکموھا فانتدب	چلو شاید خدا تم کو اس میں سے مال غنیمت

[1] صحیح مسلم وصحیح بخاری غزوۂ بدر

الناس فخف بعضهم وثقل بعضهم وذلك انهم لم يظنوا ان رسول الله يلقى حربا (ص ۲۹۲)	ولا دی، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلو تہی کی کیونکہ وہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی،

لیکن یہ واقعات صریح آیاتِ قرآنی کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے، وہ عدم ضرورت کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کی ڈر سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں،

وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ. (انفال - ۱)	اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا، وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں،

۲- تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل نکل کر (مقام بیر ابی عنبہ میں) آپ نے فوج کا جائزہ لیا، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیئے گئے کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں، یا یہ کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا جو ایک فریضۂ الٰہی ہے، اور اس کے لیے بلوغ کی قید ہے، اس لیے نابالغ لوگ واپس کر دیئے گئے کہ ابھی اس کے اہل نہیں،

۔حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہ نے جو ایک انصاری تھے، اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو، اور تم یہاں مستورات کی خبرگیری کرو، سعدؓ نے کہا حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے، میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔" چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی، اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا، سعدؓ شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے،

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا، اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے،

غزوۂ بدر کا اصلی سبب عرب کا قاعدۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقے سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا، تو ایک سخت ہنگامۂ کارزار قائم ہو جاتا تھا، دونوں طرف بڑی دل امنڈ آتا تھا، اور خون کی ندیاں بہ جاتی تھیں، یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا، عرب لکھے پڑھے نہ تھے، تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر خاندان میں وراثتہً چلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہو کر اس خون کا انتقام لینا ہے، داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں، اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہو گئیں، اسی بنا پر ہوئیں، عربی زبان میں اس انتقام کو ثار کہتے ہیں، اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا

لہ استیعاب تذکرہ سعد بن خیثمہ، اصابہ اور طبقات میں یہ واقعہ باختلاف الفاظ منقول ہے،

سب سے بڑا اہم لفظ ہے،

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، حضرت عبداللہ بن جحش کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا، حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا، جو تمام قریش کا سردار تھا، بدر، اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا، عروہ بن زبیر (حضرت عائشہؓ کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بتصریح بیان کیا ہے،

وکان الذی هاج وقعة بدر	جس چیز نے غزوۂ بدر، اور دیگر وہ تمام لڑائیاں
و سائر الحروب التی کانت بین	برپا کیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین قریش
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و بین مشرکی	کے درمیان واقع ہوئیں، وہ جیسا کہ عروہ
قریش فیما قال عروة بن الزبیر	ابن زبیر کا بیان ہے کہ عروہ بن حضرمی کا قتل
ما کان من قتل واقد بن عبد اللہ	کیا جانا ہے، جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی
التمیمی عمرو بن الحضرمی (تاریخ طبری ۱۲۸۴)	نے قتل کر دیا تھا،

ایک عام غلطی جس نے واقعہ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے، یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، عروہ بن الزبیر نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا، اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

۱؎ عبداللہ بن جحش جن کی سرداری میں یہ جنگ واقع ہوا، حضرت حمزہؓ کے بھانجے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف، اور حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک زندہ رہے، دیکھو طبقات ابن سعد ذکر عبداللہ بن جحش و واقد بن عبداللہ،

ان اباسفیان بن حرب اقبل	ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے
من الشام فی قریب من سبعین	ساتھ شام سے آرہا تھا جو کل کے کل قریشی
راکبا من قبائل قریش فذکروا	تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سوار کا
لرسول الله صلی الله علیہ وسلم واصحابہ	تذکرہ ہوا، اور دونوں فریق میں لڑائی
وقد کانت الحرب بینھم	شروع ہو چکی تھی، اور ادھر کے چند لوگ
فقتلت قتلی وقتل ابن الحضرمی	جن میں ابن حضرمی بھی تھا مارے جا چکے
فی اناس بنخلة واسرت اساری	تھے، اور کچھ قیدی بھی ہو چکے تھے ..
من قریش .... وکانت	.... اور اسی واقعہ
تلک الوقعة ھاجت الحرب	نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش میں جنگ
بین رسول الله صلی الله علیہ وسلم وبین	برپا کر دی تھی، اور یہی سب سے پہلا واقعہ
قریش داول ما اصاب بہ بعضھم	تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے
بعضا من الحرب وذلک قبل	کو صدمہ پہنچایا، اور یہ لڑائی ابوسفیان
مخرج ابی سفیان واصحابہ الی	کی روانگی شام سے پہلے وقوع میں
الشام (طبری ص ۱۲۸۵)	آچکی تھی،

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا، اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی، غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسی شام کے بعد واقع ہوا ہے، اصلیت واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفانِ جنگ کی شہادت

بہم پہنچائی جائے، اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آسکتی ہیں، لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے۔ حضرت حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے، اور اس وقت تک کافر تھے، وہ عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ برس بڑے تھے، اور گو زمانۂ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے، اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی، تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے، وہ رؤسائے قریش میں تھے، حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے،¹ وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے، ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے، مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدر مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا، اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے، انھوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کرکے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے کہا:

یا ابا الولید هل لك ان تذهب	اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر
بشرف الیوم ما بقیت	کے لیے ساری نیکنامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟
قال افعل ماذا؟ قلت انكم	عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا تم یعنی
لا تطلبون من محمد الا دم	قریش، محمد سے ابن حضرمی کے خون کے سوا
ابن الحضرمی وهو حلیفك	اور کچھ نہیں چاہتے، اور وہ تمہارا حلیف تھا
فتحمل دیته فترجع بالناس²	اس لیے تم اس کا خون بہا ادا کردو کہ سب لوگ

¹ اصابہ تذکرہ حکیم بن حزام ² طبری ص ۱۳۱۳، و سیرت ابن ہشام بعنوان ذکر "غزوۂ بدر" ص

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی، لیکن ابوجہل نے نہ مانا، اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا کہ خون کا بدلہ سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دہائی دو، عامر عرب کے دستور کے مطابق ننگا ہو گیا اور پکارا،[1]

واعمراہ واعمراہ۔ ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر!

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدانِ جنگ میں نکلا، وہ یہی عامر حضرمی تھا،

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے، عتبہ و ابوجہل جو سردارانِ قریش تھے، کفر پر تادمِ مرگ قائم رہے، اگر اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے، اور سمجھتے رہے تو ہم کو کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے کہ عروہ نے جو اس کے سیکڑوں برس بعد پیدا ہوئے، اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا سمجھا، وشتان بینھما۔

ایک ضروری نکتہ | گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا، تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام اربابِ سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتدا قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی،

اصل یہ ہے کہ اصولِ جنگ کے موافق، اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے؟ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعبؓ بن مالک جو مشہور صحابی ہیں، ان کا قول نقل کیا ہے،

---

[1] پوری تفصیل طبری ص ۱۳۱۴ تا ۱۳۰۱ میں ہے۔

ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید غزوۃ الا وری بغیرھا،	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے،

"توریہ" کے معنی شارحین بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ "آپ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے"، گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں، تاہم واقعات کے استقصاء سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں سعد بن خیثمہ کو پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے، بخلاف اس کے صحیح بخاری میں ان ہی کعبؓ بن مالک کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا،

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے، وہ حقیقت میں واقعہ نہیں، بلکہ اس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یونہی سمجھا، بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی، اور اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کیے، اور جو قیاس مذاق عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا،

بدر کے نتائج | (بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالت پر گوناگوں اثرات پیدا کیے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدم اولین تھا، قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سد آہن تھا، فنا ہو گئے، عتبہ اور ابو جہل کی موت نے قریش کی ریاست عامہ کا تاج ابو سفیان کے سر پر رکھا جس سے دولت امویہ کا آغاز ہوا لیکن

قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا،

مدینہ مین اب تک عبد اللہ بن ابی بن سلول علانیہ کافر تھا لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ مین آگیا، گو تمام عمر منافق رہا، اور اسی حالت مین جان دی، قبائلِ عرب جو سلسلۂ واقعات کا رخ دیکھتے تھے، اگرچہ رام نہیں ہوئے، لیکن سہم گئے.

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب مین بھی انقلاب شروع ہوگیا، یہود سے معاہدہ ہوچکا تھا کہ وہ ہر معاملہ مین یکسے رہین گے، لیکن اس فتح نمایان نے ان مین حسد کی آگ بھڑکا دی، اور وہ اس کو ضبط نہ کرسکے، چنانچہ اس کی تفصیل یہودیون کے واقعات مین بالتفصیل آتی ہے،

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا، بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا، اور مقتولین بدر کے انتقام کے لیے مکہ کا بچہ بچہ مضطر تھا، چنانچہ سویق کا واقعہ اور احد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا،

غزوۂ سویق، ذی الحجہ سنہ

ابوسفیان اب قریش کا رئیس تھا، اور اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا، اس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولانِ بدر کا انتقام نہ لے گا، نہ غسل جنابت کرے گا، نہ سر مین تیل ڈالے گا، چنانچہ دو سو شتر سوارون کے ساتھ مدینہ پر بڑھا، یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانون کے مقابلہ مین مدد دین گے، اس لیے پہلے حیی بن اخطب کے پاس گیا لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا، مایوس ہوکر سلام بن مشکم کے پاس آیا، وہ یہود بنو نضیر کا سردار تھا، اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا، اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا، خوشگوار کھانے کھلائے، شراب

بلوائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے، صبح کو ابوسفیان عُرَیض پر حملہ آور ہوا، جو مدینہ سے ۳ میل کے فاصلہ پر ہے، ایک انصاری کو جن کا نام سعد بن عمرو تھا قتل کیا، چند مکانات اور گھانس کے انبار جلا دیے، ان باتون سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے تعاقب کیا، ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا گھبرا مین ستو کے بورے پھینکتا گیا جو مسلمانون کے ہاتھ آئے، عربی مین ستو کو سویق کہتے ہین، اس لیے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے،

حضرت فاطمہ زہرا کی شادی
ذی الحجہ سنہ ۲ھ

حضرت فاطمہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیون مین سب سے کمسن تھین، اب ان کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی، اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے، ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ جو خدا کا حکم ہوگا، پھر حضرت عمرؓ نے جرأت کی، ان کو بھی آپ نے کچھ جواب نہین دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے، لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہین معلوم ہوتی، حافظ ابن حجر نے اصابہ مین ابن سعد کی اکثر روایتین حضرت فاطمہؓ کے حال مین روایت کی ہین، لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے،

بہرحال حضرت علیؓ نے جب درخواست کی تو آپ نے حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی، وہ چپ رہین، یہ ایک طرح کا اظہار رضا تھا، آپ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمھارے پاس مہر مین دینے کے لیے کیا ہے، بولے کچھ نہین، آپ نے فرمایا، "اور وہ حطمیہ زرہ کیا ہوئی (جنگ بدر مین ہاتھ آئی تھی)، عرض کی وہ تو موجود ہے، آپ نے فرمایا بس وہ کافی ہے،

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی، لیکن اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپئے[1]، زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علیؓ کا سرمایہ تھا، وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی، حضرت علیؓ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہؓ کے نذر کیا، حضرت علیؓ اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہتے تھے، شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں، حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، جن میں سے وہ کئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کر چکے تھے، حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان ہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے، آپ نے فرمایا کہ کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے، حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپ کا ہے، خدا کی قسم میرا جو مکان آپ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے، غرض انھوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا، حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں،

شہنشاہ کونینؐ نے سیدۂ عالمؓ کو جو جہیز دیا، وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے، حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا لیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے، اور حضرت علیؓ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا، وہ شرم سے

[1] غلطی سے پہلے اور دوسرے اڈیشن میں سوا درہم چھپ گیا ہے، [illegible]

رہ کر گزارتی ہیں، ان پر بھی پانی چھڑکا، اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل تر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے،[۱]

واقعات متفرقہ ۲ھ مورخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضان مبارک کے روزے فرض ہوئے،

صدقۂ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا، پہلے آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔

عید الفطر کی نماز با جماعت عید گاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی،

ارباب سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہئے تھا لیکن اتصال و تسلسلِ واقعہ کی بنا پر وہ آیندہ مذکور ہوگا)

---

[۱] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد اور اصابہ سے ماخوذ ہے،

سنہ ٣

غزوۂ اُحد[1]

(وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران)[2]

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سینکڑوں برس تک ختم نہیں ہو سکتا تھا، طرفین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی، وہ انتقام کو ایسا فرض سمجھتا تھا جس کے ادا کئے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی، بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج و افسر تھے، اس بنا پر تمام مکہ جوش انتقام سے لبریز تھا، قریش کا کاروان تجارت جو جنگ بدر کے زمانہ میں نفع کثیر کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا اس کا راس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا، لیکن زر منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا، قریش کو کشتگان بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کی ادائی کا خیال آیا، چند سرداران قریش جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز واقارب جنگ بدر میں قتل

---

[1] مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے [2] (صحیح بخاری باب غزوۂ احد میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ احد میں نازل ہوئی)

ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابو سفیان کے پاس گئے، اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا، اب انتقام کا وقت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مالِ تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے وہ اس کام میں صرف کیا جائے، یہ ایک ایسی درخواست تھی جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی لیکن قریش کو اب مسلمانوں کے قوت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا، وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے، اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے، عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا، قریش میں دو شاعر شاعری میں مشہور تھے، عمرو جمحی اور مسافع، عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا، قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے اور تمام قبائل قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے،

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوئی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی، بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی، اولاد جنگ بدر میں قتل ہو چکی تھی، اس لئے وہ خود جوشِ انتقام سے لبریز تھیں، اور انھوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گے، غرض جب فوجیں تیار ہوئیں، تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں،[1]

---

[1] طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۶) زرقانی (جلد ۲ ص ۳۰) نے ان ۷ خواتین کے سوا سلافہ بنت سعد و عمیرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے، ان میں خناس اور عمیرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہوگئیں خناس اور عمیرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں، زرقانی علی المواہب، ج ۲

۱۔ ہند	عتبہ کی بیٹی، اور امیر معاویہ کی ماں،
۲۔ ام حکیم	عکرمہ (فرزند ابوجہل) کی بیوی،
۳۔ فاطمہ (بنت ولید)	حضرت خالدؓ کی بہن
۴۔ برزۃ	مسعود ثقفی جو طائف کا رئیس تھا اس کی بیٹی،
۵۔ ریطہ،	عمرو بن العاص کی زوجہ،
۶۔ خناس	حضرت مصعب بن عمیر کی ماں،

حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا، جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا، اور یہ قرار ہوا کہ اس کارگذاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا،

حضرت عباسؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا گو اسلام لا چکے تھے لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے، انھوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے پانچویں شوال ۳ھ کو دو خبر رسان جن کے نام انس اور مونس تھے، خبر لانے کے لئے بھیجے، انھوں نے آکر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا، اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا،

آپ نے حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں، انھوں نے آکر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے حضرت

سعدؓ بن عبادہ، اور حضرت سعد بن معاذؓ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے،

صبح کو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا، مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں، اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے، عبد اللہ بن ابی بن سلول جو اب تک کبھی شریک مشورہ نہیں کیا گیا تھا، اس نے بھی یہی رائے دی، لیکن ان نوخیز صحابہؓ نے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے، اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے، اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا، سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے،

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہِ اُحد پر پڑاؤ ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے، عبد اللہ بن اُبی تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری رائے نہ مانی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہؓ رہ گئے، ان میں ایک سو زرہ پوش تھے، مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا، اور جو لوگ کمسن تھے، واپس کر دیئے گئے، ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت

[1] طبری ج ۳ ص ۱۳۰۹ مطبوعہ یورپ، [2] زرقانی ج ۲ ص ۲۵

عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عرابہؓ اوسی بھی تھے لیکن جان نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانون مین سے جب حضرت رافع بن خدیجؓ سے کہا گیا کہ تم عمر مین چھوٹے ہو واپس جاؤ، تو وہ انگوٹھون کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ اُن کی یہ ترکیب چل گئی، اور وہ لے لئے گئے، سمرہؓ ایک نوجوان، جوان کے ہمسن تھے، انھون نے یہ دلیل پیش کی کہ مین رافع کو لڑائی مین پچھاڑ لیتا ہون، اس لئے اگر اُن کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہئے، دونون کا مقابلہ کرایا گیا، اور سمرہؓ نے رافع کو زمین پر دے مارا، اس بنا پر اُن کو اجازت مل گئی،[1]

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا، حضرت زبیر بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن اُدھر سے آئین، اس لئے پچاس تیراندازون کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہوجائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹین، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ ان تیراندازون کے افسر مقرر ہوئے،

قریش کو بدر مین تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انھون نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سوارون کا دستہ

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۱۳۹۱ یہ طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی مین تیراندازی مین کمال رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو اُن کو شرکت کی اجازت دیدی، ابن ہشام ذکر غزوۂ اُحد و زرقانی ج ۲ ص ۲۹ و بدایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵) ۲ یضاً ص ۱۳۹۴،

صفوان بن امیہ کی کمان مین تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیراندازون کے دستے الگ تھے، جن کا افسر عبد اللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب مین تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئین،

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونان قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن مین کشتگان بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتین ساتھ تھین، اشعار یہ تھے،

نحن بنات طارق	ہم آسمان کے تارون کی بیٹیان ہین،
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیان ہین،
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑوگے تو ہم تم سے گلے ملین گے،
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہوجائین گے،

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا، اور مدینہ چھوڑ کر مکہ مین آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیون کے ساتھ میدان مین آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اُس کی عزت کرتا تھا، چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دین گے، میدان مین آکر پکارا مجھ کو پہچانتے ہو؟ مین ابو عامر ہون، انصار نے کہا "ہان او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہین، خدا تیری آرزو بر نہ لائے"

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا، کیون مسلمانو! تم مین کوئی ہے؟ کیا

مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دو، یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے، حضرت علی مرتضیٰؓ نے صف سے نکل کر "ہاں میں ہوں" یہ کہکر تلوار ماری، اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی، طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں علم ہاتھ میں لیا، اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا

ان علی اهل اللواء حقا	علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون
ان تخضب الصعدة او تندقا	میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا "میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں"

اب عام جنگ شروع ہو گئی، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ، فوجوں کے دل میں گھس گئے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں، حضرت ابودجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا، "کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟" اس سعادت کے لئے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے لیکن یہ فخر حضرت ابودجانہؓ کے نصیب میں تھا، اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے" حضرت ابودجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی

لہ یا اس بات پر ظاہر تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں،

کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے،

حضرت حمزہؓ دودستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفین کی صفین صاف ہوجاتی تھیں، اسی حالت میں سباغ غبشانی سامنے آگیا، پکارے کہ او ختانہ الفساء کے بچے؟ کہاں جاتا ہے؟ یہ کہہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا،

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اُس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کردے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اُس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں، اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک مارا جو ناف میں لگا، اور پار ہوگیا، حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے، اور روح پرواز کرگئی[1]،

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہوجاتے تھے، تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا، ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا، اور علم کو سینہ سے دبا لیا، اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ میں نے اپنا فرض ادا کردیا[2]، علم دیر تک خاک پر پڑا رہا، آخر ایک بہادر خاتون (عمرۃ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی، اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا، یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑے ہوئے

[1] صحیح بخاری باب قتل حمزہ ص ۵۸۳ [2] ابن ہشام وطبری (ج ۳ ص ۱۴۰۱) "ش"

پاؤن پھر جم گئے،

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اس کے بیٹے حضرت حنظلہؓ اسلام لا چکے تھے، انھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کے مقابلہ مین لڑنے کی اجازت مانگی لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے، حضرت حنظلہؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا، اور قریب تھا کہ اُن کی تلوار ابو سفیان کا فیصلہ کر دے، دفعۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر اُن کے وار کو روکا، اور اُن کو شہید کر دیا، تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانون ہی کی طرف بھاری تھا، علمبردارون کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابودجانہؓ کے بے پناہ حملون سے فوج کے پاؤن اکھڑ گئے، بہادر نازنینیں جو رجز سے دلون کو ابھار رہی تھین، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹین، اور مطلع صاف ہو گیا لیکن ساتھ ہی مسلمانون نے لوٹ شروع کر دی، یہ دیکھ کر تیرانداز جو پشت پر مقرر کئے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے،

حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے بہت روکا، لیکن وہ رک نہ سکے، تیراندازون کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبداللہ بن جبیرؓ چند جانبازون کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہوئے، اب راستہ صاف تھا، خالد نے سوارون کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا، لوگ لوٹنے مین مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلوارین برس رہی ہین، بدحواسی مین دونون فوجین اس طرح باہم مل گئین کہ خود مسلمان مسلمانون کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت

۱؎ صحیح بخاری غزوۂ احد ص ۵۷۹،

مصعب بن عمیرؓ جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا، اور غل مچ گیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شہادت پائی، اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر لوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہؓ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے، وہ ان پر تلواریں برس پڑیں، حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں لیکن کون سنتا تھا، غرض وہ شہید ہو گئے، حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا مسلمانو! خدا تم کو بخش دے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جان نثار پہلو میں تھے جن میں حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت ابودجانہؓ، حضرت طلحہؓ کا نام بتخصیص معلوم ہے، صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔

اس ہلچل اور اضطراب میں، اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی، لیکن جانبازوں کو بھی یہ نہیں چلتا تھا، جو جہاں تھا وہیں ٹھہر کر رہ گیا تھا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کسی کو خبر نہ تھی، حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے لیکن مقصود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پتہ نہ تھا، حضرت انسؓ کے چچا انس بن نضرؓ لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے، دیکھا تو حضرت عمرؓ مجاہدین ہو کر ہتھیار پھینک دئیے ہیں، پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے اب لڑ کر

۱؎ صحیح بخاری جزء ۲ صفحہ ۵۸۰، ۲؎ یہ زاد المعاد جزء ثانی کی روایت ہے، صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے لیکن حضرت عمرؓ کا نام نہیں۔

کیا کریں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہادت پائی، انسؓ بن نضر نے کہا اُن کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے، یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے، اور لڑ کر شہادت پائی، لڑائی کے بعد جب اُن کی لاش دیکھی گئی تو اسّی سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان تک نہ سکا، اُن کی بہن نے انگلی دیکھ کر پہچانا۔

جان نثارانِ خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈتی تھیں، سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں، حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں"، سُن کر ہر طرف سے جان نثار ٹوٹ پڑے، کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رُخ پر زور دیا، دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" زیاد بن سکنؓ پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے، اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں[۲]، حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اُن کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا، اور اسی حالت میں جان دی،

[illegible] جان نیاز مند — کہ بوقت جان سپردن بسرم رسیدہ باشی

---

(۱) صحیح بخاری غزوۂ اُحد ص [illegible] و صحیح مسلم ج ۲ ص [illegible] باب ثبوت الجنۃ للشہید (۲) صحیح مسلم غزوۂ اُحد میں ہے کہ سات انصاری تھے، اور ساتوں نے باری باری جانیں فدا کیں۔

(ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، بڑھ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ آپ نے فرمایا جنت میں! اس بشارت سے بیخود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا[۱])

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا، اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری، اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ ہر طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپ کو دائرہ میں لے لیا، ابو دجانہ جھک کر سپر بن گئے، اب جو تیر آتے تھے، ان کی پیٹھ پر آتے تھے، حضرت طلحہ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، اس حالت میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیروں کی بارش تھی، لیکن آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

رب اغفر قومی فانہم لا یعلمون — اے خدا میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں،

حضرت ابو طلحہ جو حضرت انس کے علاتی باپ تھے، مشہور تیرانداز تھے، انہوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ کر رہ گئیں، انہوں نے سپر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو اوٹ کر لیا تھا کہ آپ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، میرا سینہ سامنے ہے۔ حضرت سعد وقاص بھی مشہور تیرانداز تھے، وہ اس وقت آپ کے رکاب میں حاضر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ترکش ان کے آگے ڈال دیا اور فرمایا تم پر میرے

[illegible]

ماں باپ قربان، بتیرا تے جاؤ۔

اسی حالت میں آپؐ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا، وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے" بارگاہ خداوندی میں یہ الفاظ پسند نہ آئے، اور یہ آیت اُتری،

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ — تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں،

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے؛

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آسکتے تھے، ابوسفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جن سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

آپؐ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی، تو خلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے، جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا، تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے، جناب سیدہؓ دھوتی تھیں، لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا، اور زخم پر رکھدیا، خون فوراً تھم گیا۔

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ آپؐ نے حکم دیا کوئی جواب نہ دے، ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر پکارا، اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے "او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں"!

۱؎ صحیح بخاری غزوۂ احد ص ۵۸۰، ۲؎ طبری ص ۱۴۱۰، ۳؎ صحیح بخاری غزوۂ ... ص ۵۸۴

ابوسفیان نے کہا،

اعل ھبل — اے ہبل تو اونچا رہ،

صحابہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم سے کہا،

اللہ اعلی و اجل — خدا اونچا اور بڑا ہے،

ابوسفیان نے کہا:۔

لنا العزی ولا عزی لکم — ہمارے پاس عزّی ہے تمھارے پاس نہیں،

صحابہؓ نے کہا:۔

اللہ مولانا ولا مولی لکم، — خدا ہمارا آقا ہے تمھارا کوئی آقا نہیں،

ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے ہمارے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لئے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو مجھ کو رنج بھی نہیں ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] حضرت یمان اور حضرت ثابت کی [illegible] میں مدینہ سے باہر کے قلعوں میں بھیج دیا تھا، [illegible] شہادت کی [illegible] تو سب کو چھوڑ کر میدان کی طرف بڑھے، حضرت ثابت مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت یمان کو مسلمان پہچان نہ سکے [illegible] حضرت حذیفہؓ نے ہر چند [illegible] میرے باپ ہیں [illegible] حذیفہ نے [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] غزوہ احد کے ذکر میں [illegible]

یمانؓ کا خونبہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا، لیکن حضرت حذیفہؓ نے معاف کر دیا، ابن ہشام میں یہ واقعہ بتفصیل مذکور ہے، صحیح بخاری میں بھی ہے لیکن مختصر ہے۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا، اُن کے ناک کان کاٹ لئے، ہند (حضرت امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا، اور اپنے گلہ میں ڈالا، حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی، اور اُن کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا، اور چبا گئی، لیکن گلے سے اتر نہ سکا، اس لئے اگل دینا پڑا، تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے، ہند فتح مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے تفصیل آگے آئے گی،

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی، حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ جو حضرت انسؓ کی ماں تھیں، زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں، اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، مشک خالی ہو جاتی تھی تو جا کر بھر لاتی تھیں

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی،

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تھے، حضرت ام عمارہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں

؎ صحیح بخاری کتاب المغازی غزوۂ احد، صحیح بخاری میں غزوۂ احد کا ذکر ہے،

کفار جب آپ پر بڑھتے تھے، تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں، ابن قمیہ جب دراتا ہوا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچ گیا، تو حضرت اُمِ عمارہؓ نے بڑھ کر روکا، چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا، انھوں نے بھی تلوار ماری لیکن وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا، اس لئے کارگر نہ ہوئی[۱]

حضرت صفیہؓ حضرت حمزہؓ کی بہن شکست کی خبر سنکر مدینہ سے نکلیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہ کی لاش نہ دیکھنے پائیں، حضرت زبیرؓ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام سنایا بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سُن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے لیکن اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہکر چپ ہو رہیں، اور مغفرت کی دعا مانگی[۲]،

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے، باری باری میں سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے ہیں، لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آکر چہرہ مبارک دیکھ لیا، اور بے اختیار پکار اٹھی[۳]،

کل مصیبۃ بعدک جلل، — تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں،

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا — اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

مسلمانوں کی طرف ستر آدمی مارے گئے جن میں زیادہ تر انصار تھے، لیکن مسلمانوں

۱؎ ابن ہشام ص ۰۰۰ (۲) ؎ طبقات ... سیرۃ ابن ہشام طبری ... ۳؎ طبری ص ۱۴۲۵

کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہداء کی پردہ پوشی ہوسکتی حضرت مصعبؓ بن عمیر ایک صحابی تھے کہ ان کا پانوں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پانوں کھل جاتا، آخر پانوں اذخر کی گھاس سے چھپا دیئے گئے، یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آجاتا، تو آنکھیں تر ہوجاتیں، شہداء بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کئے گئے، جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا ان شہداء پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی۔[۱] آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپؐ ادھر سے گذرے تو بے اختیار آپؐ پر رقت طاری ہوئی، اور اس طرح آپؐ نے یہ درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو، اور اس کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا کہ "مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ"[۲]

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے، تاہم یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، آپؐ نے مسلمانوں کی طرف روئے خطاب کر کے فرمایا کہ کون ان کا تعاقب کرے گا، فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت

---

[۱] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ پر تخصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہداء پر بھی نماز جنازہ پڑھی، یہ شہدا ایک ایک کر کے اور بعض میں ہے کہ دس دس کر کے لائے جاتے تھے، اور آپؐ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے، اور حضرت حمزہؓ کی لاش مبارک ہر ہر جماعت کے ساتھ تھی گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی، شرح معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہداء و نصب الرایہ زیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید و مغازی واقدی ص ۳۰۰ مطبوعہ کلکتہ۔

[۲] یہ تمام واقعات صحیح بخاری غزوۂ احد کے متفرق ابواب میں ہیں۔

اس مہم کے لیے تیار ہو گئی جن میں حضرت ابو بکرؓ و زبیرؓ بھی داخل[۱] تھے۔

ابوسفیان اُحد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام تمام رہ گیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہلے ہی سے گمان تھا، دوسرے ہی دن آپ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے چنانچہ حمراء اسد تک جو مدینہ سے ۸میل ہے، تشریف لے گئے قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا، لیکن دریردہ اسلام کا طرفدار تھا اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا، ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا "میں دیکھتا آتا ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سر و سامان سے آراستہ ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے" غرض ابوسفیان واپس گیا[۲] یہی واقعہ ہے جس کو مورخین نے تکثیر غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے، اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا آپ جس طرف سے گذرتے تھے، گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں، آپ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیزو اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں لیکن حمزہؓ کا کوئی نوحہ خوان نہیں ہے، رقت کے جوش میں آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا،

اما حمزۃ فلا بواکی لہ — لیکن حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں،

انصار نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اُٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ

(۱) صحیح بخاری ص ۵۸۲)تس" (۲) طبری ص ۱۴۲۰، ۱۴۲۹، (۳) مسند احمد ج ۲ ص ۴۰ (تس"

پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی، اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند تھا، اُن کے حق مین دعاے خیر کی، اور فرمایا مین تمھاری ہمدردی کا شکر گذار ہون لیکن مُردون پر نوحہ کرنا جائز نہین (عرب مین دستور تھا کہ مردون پر عورتین زور زور سے نوحہ، درین کرتی تھین، کپڑے پھاڑ لیتی تھین، گال نوچتی، گالون پر تھپڑ مارتی تھین اور چیختی چلاتی تھین، یہ رسم بد اسی دن سے بند کر دی گئی، اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مردہ پر نوحہ نہ کیا جائے[1]، یہ بھی بعد کو ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہین[2]۔)

(قرآن مجید مین سورۂ آل عمران مین غزوۂ احد کا مفصل ذکر موجود ہے)

واقعاتِ متفرقہ ۳ھ | اسی سال یعنی ۳ھ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، کی ولادت ہوئی، رمضان کی پندرہوین تاریخ تھی، اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھین، اور غزوۂ بدر کے زمانہ مین بیوہ ہوگئی تھین نکاح کیا، اسی سال حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے شادی کی

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا، اب تک وراثت مین ذوی الارحام کا کوئی حصہ نہ تھا، اُن کے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی، مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی)

[1] ابن ہشام (غزوۂ احد) و مسند احمد (جلد ۲ ص ۸۴) [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز

سنہ ۴ھ

سلسلۂ غزوات و سرایا

تمام قبائل عرب، بجز ایک دو کے، اسلام کے دشمن تھے، دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دین و آئین سمجھتا تھا، اسلام اسی کو مٹاتا تھا، اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا، حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے، اور قریش ان کو اسلام دشمنی پر برانگیختہ کرتے تھے، ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہ معاش لوٹ اور غارتگری تھی، اور اسلام اس کو نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا، اس لئے وہ جانتے تھے کہ اسلام اگر قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہوجائیں گے، تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا، جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے لیکن اُحد کی شکست نے حالت بدل دی، اور دفعۃً تمام قبائل دفعۃً اٹھ کھڑے ہوئے، سیرت نبوی میں سرایا[1] (چھوٹی چھوٹی لڑائیاں) کا جو یک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں، عام مورخین نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق

---

[1] غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں، زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے، اور جس میں صحابہ افسر مقرر کر کے بھیجے جاتے تھے، وہ سریہ کہلاتا تھا،

ان لڑائیون کے ذکر مین اُن کے اسباب سے بحث نہین کی لیکن ابن سعد نے طبقات مین، اور اور ائمہ فن نے قریبًا ہر واقعہ کا سبب لکھدیا ہے، یعنی کسی خاص قبیلہ نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کے لئے فوجین بھیجیں۔

سریۂ ابوسلمہ

۱- سب سے پہلے محرم سنہ ۴ھ مین طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ مین رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابوسلمہؓ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا، یہ خبر سن کر اُن کی جماعت منتشر ہو گئی،[۱]

سریۂ ابن انیس

۲- اس کے بعد محرم سنہ ۴ھ مین سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا، اور جو کوہستان عرنہ کا رئیس تھا، مدینہ پر حملہ کا قصد کیا، اس کے مقابلہ کے لئے آپ نے حضرت عبداللہ بن انیسؓ کو بھیجا جنھون نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا،[۲]

صفر سنہ ۴ھ مین ابوبراء کلابی[۳] جو قبیلۂ کلاب کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ چند لوگون کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دین، آپ نے فرمایا "مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے"[۴] ابوبراء نے کہا "اُن کا مین ضامن ہون"، آپ نے منظو

---

[۱] ابن سعد صفحہ ۳۵ (ج ۲ قسم اول) اصل عبارت یہ ہے بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان طلیحۃ وسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومھا ومن اطاعھما یدعوانھم الی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، [۲] طبقات ابن سعد ص ۳۶، اصل عبارت یہ ہے وذلک انہ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سفین بن خالد الھذلی ... قد جمع الجموع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، [۳] ابوبراء نجد کو اسلام لایا تھا یا نہین اس مین اہل علم کا اختلاف ہے، ذہبی کہتے ہین کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہین لائے، اصابہ مین ہے کہ ان کے قبول اسلام کی کوئی روایت نہین ہے، امام حنبل روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے (اصابہ ج ۲ ص ۳) اس کا ایک ... یہ کچھ بیان بھی نہ تھا عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ میرے تمھارے درمیان تین باتین ...

فرمایا، اور ستر انصار ساتھ کر دیئے، یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے، اور اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے، ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کے نذر کرتے، کچھ اپنے لئے رکھتے،

اُن لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا، اور حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دیکر بیر معونہ
عامر بن طفیل (بن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا، جو قبیلہ کا رئیس تھا، عامر نے حرام کو قتل کر دیا، اور اس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عصیہ، رعل، ذکوان، سب کے پاس آدمی دوڑائے کہ تیار ہو کر آئیں، ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا، اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا، صحابہؓ حرام کی واپسی کے منتظر تھے، جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے، راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا، کفار نے اُن کو گھیر لیا، اور سبؓ کو قتل کر دیا، حضرت عمرو بن امیہؓ کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں، یہ کہکر اُن کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بد دعا کی، حضرت عمرو بن امیہؓ نے واپسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۹) رہ دیہ کے ، کہہ دیتا ہوں، اور شہر بن ... بن نوفل، یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ، ورنہ غطفان کو لے کر میں چڑھ آؤنگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور نہیں فرمایا تھا، اس لئے کسی طرف سے ڈر تھا، صحیح بخاری غزوۂ رجیع و رعل و ذکوان) ملاحظہ ہو؛ کہ اس جماعت میں حضرت کعب بن زیدؓ بھی تھے، کفار نے سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں لیکن اُن میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ گئے، اور غزوۂ خندق میں شہید ہوئے، زرقانی ج ۲ ص ۹۰، ۱س (۲) حضرت عمرو بن امیہ اور حضرت منذر بن محمد عقبہ انصاری پیچھے تھے جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذرؓ کو شہید کر دیا گیا، اور حضرت عمرو بن امیہؓ کو قید کر لیا گیا، اور بعد کو وہ چھوڑ دیئے گئے، زرقانی ج ۲ ص ۸۹، ۱س"

ین راستہ میں بنی عامر کے) دو آدمیون کو قتل کر دیا تھا (جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) امان دے چکے تھے، مگر حضرت عمرو بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا، وہ یہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے ان کی بیوفائی کا بدلہ لے لیا، جو انھون نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ کے ساتھ کیا ہی۔ (جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنا تو) اس پر آپ نے ناراضی ظاہر فرمائی، اور دونون کے خونبہا ادا کر دینے کا اعلان فرمایا،

واقعہ رجیع

انہی دنون عضل اور قارۃ جو دو مشہور قبیلے ہین، اُن کے چند آدمی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہی، چند لوگون کو ہمارے ہان بھیجئے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائین، آپ نے دس شخص ساتھ کر دیئے جن کے سردار حضرت عاصم بن ثابت تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے، جو عسفان اور مکہ کے وسط میں ہے، تو ان غدارون نے بدعہدی کی، اور قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دین، بنو لحیان دو سو آدمی لے کر جن مین ایک سو تیرانداز تھے، ان لوگون کے تعاقب مین چلے، اور اُن کے قریب آگئے، اُن لوگون نے بڑھ کر ایک ٹیلے پر پناہ لی، تیراندازون نے اُن سے کہا کہ "اُترآؤ ہم تم کو امن دیتے ہین" حضرت عاصمؓ نے کہا مین کافر کی پناہ مین نہین آتا" یہ کہہ کر خدا سے خطاب کیا کہ اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے" غرض وہ مع سات آدمیون کے لڑ کر تیراندازون کے ہاتھ سے شہید ہوئے، (قریش نے چند آدمیون کو بھیجا کہ

---

(۱) البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۳، زرقانی ج ۲ ص ۹۲) (۲) بخاری (کتاب المغازی) نے اس موقع پر جن تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہی، ان کا نام نہین لکھا ہی، ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہ بن طارق بتلایا ہی، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ اسی وقت اس موقع پر شہید کر دیئے گئے لیکن دوسری روایتون مین جو کہ بیان سے آگے چل کر مکہ کے راستہ مین بہ مقام ظہران اُن کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی ج ۲ ص ۷۰، ۷۱

عاصم کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ اُن کی شناخت ہو، قدرت خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پرا ڈال دیا، قریش ناکام پھر گئے) لیکن (تین) شخصوں نے جن (میں سے دو) کے نام حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ (بن الدثنہ) تھے، کافروں کے وعدہ پر عتماد کیا اور ٹیکرے سے اُتر آئے، کافروں نے بدعہدی کرکے اُن کی مشکیں کس لیں، اور مکہ میں لے جاکر بیچ ڈالا، حضرت خبیبؓ نے جنگ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا اس لیے اُن کو حارث کے لڑکوں نے خریدا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کرینگے، چند روز انہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے، اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی، بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آگئی، دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے کانپ اٹھی، حضرت خبیبؓ نے کہا کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کردوں گا؟ ہمارا یہ کام نہیں، خاندانِ حارث، اُن کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا، اور قتل کرنا چاہا، انھوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، قاتلوں نے اجازت دی، انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہوگا کہ موت سے ڈرتا ہوں، پھر یہ اشعار پڑھے،

وما ان ابالی حین اُقتل مسلما	جب میں اسلام کے لیے قتل کیا جا رہا ہوں تو
علی ای شق کان للہ مصرعی	مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤنگا
وذٰلک فی ذات الالٰہ ان یشأ	یہ جو کچھ ہے خاص خدا کے لیے ہے، اگر وہ چاہے گا تو
یبارک علی اوصال شلو ممزع	جسم کے اُن پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا

ۡ؎ حارث کے بیٹے ابو سروعہ جنھوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے اور شرفِ صحابیت سے سرفراز

ۡ؎ دیکھو صفحہ (۹) حاشیہ نمبر ۱۲،

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہین، تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کرلیتا ہے اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے)

دوسرے صاحب حضرت زید رضی اللہ عنہ تھے اُن کو صفوان بن اُمیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا، اِن کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے جن مین ابوسفیان بھی تھا جب قاتل نے تلوار ہاتھ مین لی، تو ابوسفیان نے کہا سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے؟ بولے خدا کی قسم مین تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہین رکھتا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تلوون مین کانٹا چبھ جائے "صفوان کے غلام نِسطاس نے ان کی گردن ماردی،

ان لڑائیون کا سلسلہ یہود کی لڑائیون سے مل جاتا ہے، اور چونکہ یہود کے واقعات اور اُن کی سرگذشت تاریخ اسلام سے گوناگون تعلقات رکھتی ہی اس لئے ہم اُن کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہین، اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹۲) بحوالہ زرقانی ج ۲ ص ۷۳ (ن س نز ۳۰ صحیح بخاری مین استرہ لکھا ہی) ن س

[۱] طبری ص ۱۴۳۵ و طبقات ابن سعد اشعار اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع سے لئے گئے ہین نیز صحیح بخاری ھل یستاسر من لعرلیتا سر وصلی رکعتین عند القتل (۲) اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپنے اسکو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی اول ص ۱۵۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا (الروض الانف جلد ۲ ص ۱۸۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں یعنی حضور کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضور کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو، اور حضور کو اسکی اطلاع ملی ہو مگر آپ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو ایسے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائیگا) س (۳) زکان نے بعد کو اسلام قبول کیا، زرقانی ج ۲ ص ۷۳) ن س

واقعات متفرقہ سنہ | اسی سال شعبان مین حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی،

اسی سال ازواج مطہرات مین سے حضرت زینب بنت خزیمہ نے انتقال فرمایا جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا،

اسی سال آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لین، اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہین، تاریخون مین لکھا ہو کہ حضرت زید نے صرف پندرہ دن مین عبرانی زبان سیکھ لی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ مین عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے،

اسی سال شوال مین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ام سلمہ سے نکاح فرمایا،

اسی سال یہودیون نے آپکے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا، اور آپ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا، (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصون میں آئے گی)

بعض مورخون کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا لیکن اس مین روایتین نہایت مختلف ہین، پوری تحقیق احکام شرعیہ کے ذکر مین آئے گی،

یہودیون کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

سنہ ۲ و سنہ ۴

اوپر گذر چکا ہے کہ یہود مدت دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے، انصار نے آکر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے، اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا، لیکن جنگِ بعاث نے اُن کی قومی طاقت توڑ دی، اور اب وہ اس قابل نہین رہے تھے کہ یہود سے ہمسری کا دعوی کرسکتے،

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی مین آباد تھے، اور عموماً زمیندار، دولتمند، تجارت پیشہ، اور صناع تھے، قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے، اور چونکہ سب مین زیادہ بہادر اور شجاع تھے، اس لئے ہمیشہ اُن کے پاس اسلحہ جنگ کے ذخیرے مہیا رہتے تھے، انصار عموماً اُن کے مقروض اور زیر بار تھے، ملکی اور تجارتی اثر کے ساتھ اُن لوگون کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا، انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے، اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، اور ان کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شایستہ سمجھتے تھے، جن لوگون کے بچے زندہ نہین رہتے تھے، وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا بچہ زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنا دین گے چنانچہ مدینہ مین اس قسم کے بہت سے جدید الیہودیہ موجود تھے،

ابوداؤد (کتاب الجہاد) فتوح البلدان بلاذری ص ۱۷

یہود میں امتدادِ زمانہ سے نہایت اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہوگئے تھے اُن کے امتیازی خصائص زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا، اور تمام آبادی اُن کے قرضوں میں زیر بار تھی اور چونکہ تنہا وہی صاحبِ دولت تھے، اس لیے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے، اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے، یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے، کعب اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی، وہ مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائداد پر تصرف کرتے تھے،

طماعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپیے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے،[1] دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا، اور چونکہ زیادہ تر امرا اس کے مرتکب ہوتے تھے، اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف دُرّہ مارنا ہے؟ اس نے کہا نہیں، بلکہ سنگسار کرنا ہے لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہوگئی، اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے، البتہ عام آدمیوں کو یہ سزا دیتے تھے، بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا دُرّہ سے بدل دی جائے تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جاسکے،[2]

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب اُن کا جاہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں

بخاری ومسلم ذکر قتل کعب اشرف [1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۱۶ کتاب الدیات باب اذا قتل بحجر او بعصا "س"

[2] اسباب النزول، واحدی ص ۱۴۲ مصر و صحیح مسلم (ص ۹۰ ذکر رجم الیہود) "س"

رہ سکتا، اسلام جس قدر روز بروز مدینہ مین پھیلتا جاتا تھا، اسی قدر یہودیون کے مذہبی وقار کو جو اُن کو مدتون سے حاصل تھا زوال ہوتا جاتا تھا، مدینہ کے مشرکین مین یہودیت جو مدریجاً پھیل رہی تھی، دفعتہً رک گئی، نئے نئے فتوحات کی بدولت، انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیون کے قرض کے شکنجون سے آزاد ہوتے جاتے تھے، یہودیون مین جو اخلاق بدعمُوماً پھیلے ہوئے تھے، اور جن پر دولتمندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا اب اُن کا راز فاش ہونے لگا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا، اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی، لیکن منصب نبوت کی حیثیت سے ذمائم اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپ کا فرض نبوت تھا، قرآن مجید مین اُن کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھین،

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ-۶)	وہ جھوٹ باتون کے سننے والے اور مال حرام کے بڑے کھانے والے ہین،
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۹)	اور تو ان مین سے اکثرون کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہین
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء-۲۲)	اور چونکہ یہ سود خواری کرتے ہین، حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ وہ لوگون کا مال خوردبرد کر جاتے ہین،

ان اسباب نے تمام یہود مین اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی، انھون نے

طرح طرح سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اذیتین دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کین،
لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم تھا کہ اُن کی ہر طرح کی ایذا رسانیون کی برداشت کرین،

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ	اے اہل کتاب اور مشرکون سے تم
مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا	بہت سی ایذا (کی باتین) سنو گے، اور
أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا	اگر صبر کئے رہو، اور پرہیزگاری پر قائم
فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (آل عمران - ۱۹)	رہو تو یہ ہمت کے کام ہین،

یہودیون نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سلام علیکم کرتے تو بجائے
السلام علیک کے السام علیک کہتے تھے جس کے معنی یہ ہین کہ تجھ کو موت آئے؛ ایک دفعہ
حضرت عائشہؓ بھی موجود تھین، انھون نے سُنا تو اُن کو سخت غصہ آیا اور بےاختیار ہو کر بول اٹھین
کہ کمبختو! تم کو موت آئے؛ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ نرمی سے کام لو، حضرت عائشہؓ
نے کہا آپ نے کچھ سنا بھی کہ ان لوگون نے کیا کہا"؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہان لیکن کافی
ہے کہ مین نے علیک کہہ دیا[1]،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)، صرف مجاملت اور درگذر ہی پر اکتفا نہین فرماتے تھے، اکثر معاشرت
کی باتون مین یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے، اور اُن کی مذہبی توقیر رکھنا چاہتے تھے، اہل عرب
کی عادت تھی کہ بالون مین مانگ نکالتے تھے، بخلاف اس کے یہودی بالون کو یون ہی چھوڑ دیتے
تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی یہودیون ہی کی موافقت کرتے تھے، صحیح بخاری مین ہی،

---

[1] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب مین مذکور ہی،

وکان یحب موافقۃ اھل	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزون
الکتاب فیما لم یؤمر فیہ	مین جن مین کوئی خاص حکم الٰہی نہین
بشئی،	ہوتا تھا، اہل کتاب کی موافقت پسند
(بخاری کتاب اللباس باب الفرق (جلد ۲ ص ۸۷۷))	فرماتے تھے،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ مین تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے، آپ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھین[۱] کسی یہودی کا جنازہ گذرتا تو آپ تعظیما کھڑے ہو جاتے[۲]،

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰ کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی افضل ہین، اس پر ایک انصاری کو غصہ آگیا، انھون نے اس کو تھپڑ مارا، یہودی نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شکایت کی، آپ نے فرمایا مجھ کو اور پیغمبرون پر (ایسی) فضیلت نہ دو (جس سے اُن کا نقص لازم آئے) قیامت کے دن لوگ بیہوش ہو جائین گے، اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت مین دیکھون گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہین[۳]،

احکام الٰہی جو قرآن مجید مین نازل ہو رہے تھے، سرتاپا اہل کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب مین تھے،

---

[۱] بخاری جلد اول ص ۵۶۲ (باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین قدم المدینۃ) [۲]

بخاری جلد ۱ ص ۱۷۵، [۲] "کتاب الجنائز" [۳] بخاری جلد ۲ ص ۶۶۰ تفسیر سورۂ اعراف،

وَطَعَامُ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ، (مائدہ - ۱)	اور اہل کتاب کا کھانا تمھارے لئے حلال ہے،

عموماً اُن کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا۔

يَا بَنِيٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ)	اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کا خیال کرو، جو مین نے تم کو دین اور یہ کہ مین نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی،

تبلیغ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت اُن کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا،

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران - ع ۷)	کہدو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکسان مانتے ہین، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجین اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائین اور ہم مین سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منھ پھیر لین تو تم کہدو کہ اچھا تم گواہ رہو، ہم تو مسلمان ہین،

ان باتون مین سے ایک بھی اُن کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی لیکن ان تمام مہربانیون اور اظہار لطف و مدارات کا جو صلہ تھا، یہ تھا کہ انھون نے ہرطرح سے

اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کرلیا،

اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لئے مشرکون سے کہتے تھے کہ مذہب مین مسلمانون سے تو تم ہی اچھے ہو،

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ	اور کافروں کی نسبت کہتے ہین کہ مسلمانون
أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا (نساء)	سے زیادہ ہدایت یافتہ ہین،

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کیلئے یہان تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہوکر پھر مرتد ہوجائین تاکہ لوگون کو خیال ہوکہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کرکے کوئی کیون چھوڑ دیتا،

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	اور اہل کتاب مین سے ایک گروہ کہتا ہے
آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا	کہ مسلمانون پر جو اترا ہے اس پر صبح کو
وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ	ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ تاکہ
يَرْجِعُونَ (آل عمران - ۸)	وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائین،

ان باتون کے علاوہ، اسلام کی بربادی کی نئی تدبیرین اختیار کین، وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانون کو جو قوت ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے "اوس" اور "خزرج" جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے ان کو باہم متحد کردیا ہے، ان دونون کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہوجائے گا، عرب مین پچھلے کینہ اور بیرون کو تازہ کردینا نہایت آسان کام تھا، ایک دفعہ دونوں قبیلون کے بہت سے آدمی جلسہ مین بیٹھ کر بات چیت کررہے تھے، چند یہودیون نے اس صحبت مین جاکر جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑا، یہ وہ لڑائی تھی جس مین انصار کے یہ دونون

قبیلے آپس مین لڑتے تھے، اور اسی لڑائی نے اُن کی تمام قوت برباد کر دی تھی، اس لڑائی کے تذکرہ نے دونون کو پرانے واقعے یاد دلائے، اور دفعۃً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی لعن طعن سے گذر کر تلوارین کھنچ گئین، حُسنِ اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوگئی آپنے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونون فریق کو ٹھنڈا کیا، اُس پر یہ آیت اُتری، [1]

یَآاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا	مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگون
فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	کا کہا مانوگے تو وہ تم کو ایمان لائے

یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ (آل عمران – ۱) بعد پھر کافر بنادین گے،

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا، جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، لیکن درحقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا، اس گروہ کا سردار عبد اللہ بن اُبی بن سلول تھا یہودیون نے اس کو نہایت آسانی سے درپردہ ملا لیا، اور اُن کے ساتھ مل کر سازش شروع کی، اتفاق یہ کہ عبد اللہ ابن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا،

قریش نے بدر سے پہلے عبد اللہ بن اُبی کو لکھا تھا کہ مسلمانون کو نکال دو، ورنہ ہم آکر تمھارا استیصال کردین گے، لیکن جب اس مین کامیابی نہین ہوئی جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے تو بدر کے بعد انھون نے یہود کو خط لکھا،

انکم اھل الحلقۃ والحصون	تم لوگون کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات
وانکم لتقاتلن صاحبنا اولنفعلن	ہین، تم ہمارے حریف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ حافظ ابن حجر عسقلانی مطبوعۂ مصر جلد ا ص ۸۸

کن او کن ا، ولا یحول بیننا وبین خدم نساءکم شیء[۱] — سے لڑو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ یہ یہ کریں گے، اور یہ کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی،

ابوداؤد نے چونکہ بنو نضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس لئے صرف بنو نضیر کا نام لیا ہے ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا، اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بنا پر محدث حاکم نے بنو نضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے، غرض اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) راتوں کو گھر سے نکلتے تھے، تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا، حضرت طلحہ بن براء ایک صحابی تھے، انہوں نے (نزع کے وقت) وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر نہ کرنا، اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر حادثہ گذر جائے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابوداود وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے[۲]

شوال سنہ ۲ھ
غزوۂ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائل یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر قینقاع تھے[۳]، اس لئے سب سے پہلے انہی نے اعلان جنگ کی جرأت کی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو معاہدہ کیا تھا سب سے پہلے انہی نے اس کی عہد شکنی کی، ابن ہشام و طبری نے ابن اسحاق

---

۱ سنن ابی داؤد ذکر خیبر (کتاب الخراج والامارۃ) ش ۲ دیکھو اصابہ تذکرہ طلحہ بن براء ش ۳ طبقات ابن سعد (جلد ۲ قسم اول ص ۱۹) ش

کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے،

ان بنی قینقاع کانوا اول یھود	بنو قینقاع پہلے یہود تھے جنھوں نے اس
نقضوا ما بینھم و بین رسول اللہ	معاہدہ کو جو ان میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم وحاربوا فیما بین بدر	میں تھا، توڑ ڈالا اور بدر و احد کے درمیانی
واحد،	زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی،

ابن سعد نے غزوۂ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے،

	(ابن سعد جزء مغازی ص ۱۹)	
فلما کانت وقعۃ بدر اظھروا البغی		واقعۂ بدر میں یہودیوں نے شورش اور
والحسد ونبذوا العھد والمدۃ		حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ دیا،

ایک اتفاقیہ سبب پیش آگیا جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا، ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دوکان میں نقاب پوش آئیں، یہودیوں نے ان کی بےحرمتی کی، ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بےتاب ہوگیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے مسلمان کو قتل کردیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ خدا سے ڈرو ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے، بولے کہ "ہم قریش نہیں ہیں ہم سے معاملہ پڑیگا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے"، چونکہ ان کی طرف سے نقض عہد اور اعلان جنگ ہوگیا تھا، مجبور ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوگئے، پندرہ دن تک محاصرہ رہا، بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے ان کو منظور ہوگا، عبداللہ بن ابی ان کا حلیف تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

درخواست کی کہ وہ جلا وطن کر دیئے جائیں[1]، غرض وہ اذرعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے جلا وطن کر دیئے گئے۔ یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے[2]،

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا، اس کے باپ اشرف نے جو قبیلۂ طے سے تھا، مدینہ میں بنو نضیر کا حلیف ہو کر اس قدر عزت اور اعتبار پیدا کیا کہ ابو رافع بن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب[3] تھا، اس کی لڑکی سے شادی کی، کعب[4] اس کے بطن سے پیدا ہوا، اس دو طرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا، اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا، رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیانِ عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علما اور پیشوایانِ مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے، اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رائے دریافت کی، اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا تب ان کے مقررہ روزینے جاری کئے[5]،

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی، بدر کی لڑائی میں سردارانِ قریش مارے گئے، تو اسکو نہایت صدمہ ہوا، تعزیت کے لئے مکہ گیا، کشتگانِ بدر کے پُر درد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا، اور روتا اور رلاتا تھا، ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کئے ہیں، اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں تاہم جہاں تک اس

---

[1] عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے، عبد اللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہو گئے لیکن سنن ابی داؤد میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے، اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے، [2] صحیح بخاری باب قتل النائم المشرک [3] خمیس ص ۳۰۲ [4] زرقانی ج ۲ ص ۹ بحوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔

زمانہ کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں:

طحنت رحی بدر لمهلك اهله	جنگ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا
ولمثل بدر تستهل وتدمع	بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہیے
كم قد اصيب به من ابيض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے
ذي بهجة تأوي اليه الضيع	یہان اہل حاجت پناہ لیتے تھے مارے گئے

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہنا، اور لوگون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا،[1]

عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبرون کی پرجوش تقریرون اور اخبارات کی تحریرون کا ہوتا ہے تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کے اثر سے آگ لگا دیتا تھا،

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا وہان ابوسفیان سے ملا، اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا، اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا، سب نے حرم کا پردہ تھام کر عہد کیا کہ بدر کا انتقام لین گے؛[2]

---

[1] ابوداود میں ہے وکان کعب بن الاشرف یہجو النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویحرض علیہ کفار قریش (ابوداود جلد دوم باب کیف کان اخراج الیہود کتاب الخراج والامارة) اور ابن سعد میں ہے کان رجلا شاعرا یہجو النبی واصحابہ ویحرض علیہ (تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ ص ۹) عن عکرمہ ان کعب بن الاشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشہم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامرہم ان یغزوہ (تاریخ خمیس ص ۵۱۰)

[2] دیکھو پہلا ... جس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے

اس پر آمادہ کرکے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرادے، علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنو نضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں،

کعب بن الاشرف الیھودی الذی	کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت
اراد ان یمکر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے میں قتل کردینا چاہا[1]

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے، جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ذکر کعب اشرف) میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کردیا کہ جب آپ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کردیں، حافظ ابن حجر نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے، لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہوجاتا ہے،

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ نے بعض صحابہؓ سے شکایت کی اور آپ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بمشورہ رؤسائے[2] اوس جاکر اس کو ربیع الاول ۳ھ میں قتل کردیا، ارباب روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دیجائے، ارباب سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انھوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی، کیونکہ الحرب خدعۃ یعنی لڑائی میں دھوکہ دینا جائز ہے، لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہیں،

فاذن لی ان اقول	ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم گفتگو کریں،

---

[1] جلد، ص ۲۵۹ [2] ابن سعد مغازی ص ۲۱،

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ لیکن جو گفتگو ہوئی، اُس سے کعب اور عام یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے، حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا، اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے، اب تمہیں سے کچھ قرض لینا ہے" کعب نے کہا تم خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے، اکتا جاؤ گے، اچھا قرض کے لئے اپنی بیویاں گرو رکھو" محمد بن مسلمہؓ نے کہا تمہارے اس حسن و جمال کے سبب ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں، اُس نے کہا "اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو" انھوں نے کہا اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی، ہم اپنے ہتھیار گرو رکھیں گے، اور تم جانتے ہو آج کل اُن کی جیسی ضرورت ہے[1]

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقہ سے اس کو گھر سے بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑ لی، اور قتل کر ڈالا[2] لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی اجازت دی تھی، اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی، آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی،

غزوۂ بنو نضیر
ربیع الاول ۴ھ

حضرت عمرو بن اُمیہؓ نے قبیلۂ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیئے تھے، اور جن کا خونبہا اب تک واجب الادا تھا، اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کے رو سے یہود بنو نضیر پر واجب الادا تھا، اُس کے مطالبہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، بنو نضیر کے پاس تشریف

(۱) زرقانی جلد ۲ ص ۱۳ و صحیح بخاری باب قتل کعب بن اشرف ص (۲) صحیح بخاری باب قتل کعب (کتاب المغازی) (۳) ص بنی نضیر کی

لے گئے، انھون نے قبول کیا، لیکن درپردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالاخانہ پر چڑھ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پتھر گرادے، اتفاق سے اُس وقت آپ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ مین کھڑے تھے، عمرو بن جحاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا، آپ کو اُس کے ارادہ کا حال معلوم ہوگیا اور آپ فوراً مدینہ واپس چلے آئے،[1]

اوپر گذر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو لکھا بھیجا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو، ورنہ ہم خود آکر تمھارا استیصال کر دین گے، بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے، قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا، بنو نضیر نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمیون کو لے کر آئین ہم بھی اپنے احبار لے کر آئین گے، آپ کا کلام سُن کر اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کرین گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا، چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے، آپ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو، مین تم پر اعتماد نہین کر سکتا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے، آپ یہود بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے، اور اُن سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی، انھون نے تعمیل کی، بنو نضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ اُن کے برادران دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے، لیکن ...

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے متعلق جو گفتگو فرمائی اس کی دو تشریحین کی گئی ہین ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے، دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا ماحصل یہ ہو کہ قبیلۂ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے، اور اُن کے یہان دیت کا دستور کیا ہے، بنی نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے، اس لئے اُن سے اس مسئلہ مین گفتگو قرین قیاس بھی ہے (سیرۃ حلبیہ جلد ۲ ص ۳۰۰) [1] یہ روایت ابن ہشام وغیرہ مین مذکور ہے، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے یہ عبارت نقل کی ہے وکانوا قد دسوا الی قریش فی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحضوهم علی القتال ودلوهم علی العورة (زرقانی صفحہ ۹۵ جلد ۲) یعنی ان لوگون نے قریش سے درپردہ سازش کر کے ان کو آمادۂ جنگ کیا، اور اُن کو حملے کا موقع بتایا۔

طرح معاہدہ کرنے پر رضی نہ ہوئے[1] آخر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں ہم بھی اپنے تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں، یہ علما اگر آپ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے، آپ نے منظور فرمایا، لیکن راہ میں آپ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں۔[2]

بنو نضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے، وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی نے کہلا بھیجا کہ تم اطاعت نہ کرنا، بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کو آؤں گا، قرآن مجید میں ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ	تم نے دیکھا منافق اپنے کافر بھائیوں سے
لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ	کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ
أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ	نکلیں گے، اور ہم تمہارے باب میں کسی کا
لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا	کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کوئی لڑا تو
وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ (حشر)	ہم بھی تمہاری مدد کریں گے،

لیکن بنو نضیر کے تمام خیالات غلط نکلے، بنو قریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا، اور منافق علانیہ اسلام

---

[1] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد، خبر بنی النضیر باب الخراج والامارۃ میں ہے، تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابو داؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔ [2] فتح الباری واقعۂ غزوۂ بنو نضیر جلد سابع ص ۲۵۵، فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اسناد صحیح ہے، صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا، بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے، باب حدیث بنی النضیر و مخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیہم فی دیۃ الرجلین وما ارادوا من الغدر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[illegible] نہیں کٹے تھے،

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا، قلعے کے گرد جو ان کے نخلستان تھے، ان کے چند درخت کٹوا دیے، سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا بلکہ صرف لینہ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے، اس کے درخت کاٹے گئے تھے، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے،

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا	تم نے لینہ کے جو درخت کاٹے اور جس قدر
قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ	قائم رہنے دیے، سب خدا کے حکم سے تھا
وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (سورۂ حشر)	تاکہ خدا فاسقوں کو رسوا کرے،

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لیے وہ صاف کر دیے گئے کہ محاصرہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو[1]،

بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جا سکیں، لے کر مدینہ سے باہر نکل جائیں، چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے، ان میں سے معززین رؤسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیی بن اخطب خیبر چلے گئے، وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا، اس واقعہ کو اس غرض سے [illegible] کہ خیبر [illegible]

[1] مصنف کے اس خیال کی تائید [illegible] ہوتی ہے کہ [illegible] درخت وغیرہ [illegible] جنگ [illegible] [illegible] [illegible]

کا دیباچہ ہے،

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ چھ سو اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطرب عورتیں دف بجاتی اور گاتی جاتی تھیں، سلمیٰ عروہ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی، ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا اس میں پچاس زرہیں پچاس خود، اور تین سو چالیس تلواریں تھیں[1] ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اپنے مذہب کی وجہ سے ساتھ لے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری،

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ط — یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے

ابوداؤد نے کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے،

---

[1] یہ تفصیل طبری میں ہے ص ۱۴۵۵ تا

سنہ ۵ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک، و غزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے عرب کو سرے سے لیکر مدینہ تک آگ لگا دی جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی، ۱۰ محرم سنہ ۵ھ کو آپ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے، لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے[1]

ربیع الاول سنہ ۵ھ میں یہ خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار کی جمعیت لیکر مدینہ سے نکلے، انکو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع (شعبان سنہ ۵ھ) | خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف تھا اور [illegible] قریش

[1] ابن سعد [illegible] رجب [illegible] غزوۂ ذات الرقاع خندق کے بعد فتح [illegible] صلاۃ خوف سب سے پہلے [illegible] ابن اسحاق [illegible] طبری [illegible] ابن ہشام [illegible] نے بھی اس غزوہ کو سنہ ۴ھ میں ذکر کیا ہے [illegible] گو سنہ ۵ھ میں [illegible] صلاۃ خوف کا ذکر ہے لیکن غلطی [illegible] ابو عقبہ کی طرف [illegible] کی نسبت [illegible] ابن عقبہ اور ابوموسیٰ اشعری کی روایتوں [illegible] تفصیل کیلیے دیکھو فتح الباری)

[illegible] زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیم کی نسل سے ہیں، اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہئے، حج کا ایک رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہئے جو حدود حرم کے اندر ہے، اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے ان کو بھی یہ لقب دے دیتے، اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے، قبیلہ خزاعہ کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا،

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل پر آباد تھا، اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے حضرت زید بن خصیب کو بھیجا، انہوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی، آپ نے صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا، ۲ شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں، مریسیع میں خبر پہنچی، تو حارث کی جمعیت منتشر ہو گئی، اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے، انہوں نے صف آرائی کی، اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے، مسلمانوں نے دفعۃً ایک ساتھ حملہ کیا، تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے، دس آدمی مارے گئے، اور باقی گرفتار ہو گئے جن کی تعداد تقریباً ... تھی غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں،

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

۱؎ یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں ... جلد اول، ۲؎ باب العتق ۳؎ کتاب الجہاد والسیر

بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے، اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے، ابن سعد نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصول حدیث کے رو سے قابل حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا، اس لئے یہ روایت اصطلاح محدثین میں منقطع ہے۔[1]

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی، لیکن اتفاقات سے بعض مہتم بالشان واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے، اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے، یہ بد باطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے، ایک دن چشمہ پر پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا، انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یا للانصار کا نعرہ مارا (انصار کی مدد)، مہاجر نے بھی یا معشر المہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا، نعرہ سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں، اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، لیکن چند لوگوں نے

---

[1] طبقات ابن سعد جلد مغازی ص [illegible] ہوتا ہے کہ مصنف [illegible] لیکن اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے [illegible] فی ذالک الجیش یعنی نافع نے [illegible] حضرت عبداللہ بن عمر سے [illegible] صحیح مسلم کتاب الجہاد و بخاری کتاب العتق، اس [illegible] منقطع [illegible]

بیچ بچاؤ کرا دیا، عبد اللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا، تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر آشنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود ایمان سے نکل جائیں گے"،

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہا، حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، غصہ سے بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے کرتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں"[1]

یہ عجیب بات ہے کہ عبد اللہ بن اُبی جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا، اس کے بیٹے ... ان کا نام بھی عبد اللہ تھا، اسی قدر اسلام کے جان نثار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبد اللہ بن اُبی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گذار ہوں، لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھی کو حکم ہو میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، ایسا ہو کہ آپ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آ کر قاتل کو قتل کر دوں"، آپ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا[2]، یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرمایا، جنازہ

---

[1] دیکھو صحیح بخاری ص ۲۰، [2] یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد اور طبری نے لکھے ہیں، اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں،

کی نماز پڑھائی حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہین! لیکن دریاے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا،

حضرت جویریہؓ کا واقعہ

لڑائی مین جو لوگ گرفتار ہوے، اُن مین حضرت جویریہؓ بھی تھین، جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھین، ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابون مین بھی ہے کہ تمام اسیران جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیے گئے، حضرت جویریہؓ حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصّہ مین آئین، انھون نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ مکاتبت کر لو، یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو، حضرت ثابتؓ نے منظور کیا، حضرت جویریہؓ کے پاس روپیہ نہ تھا، چاہا کہ لوگون سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کر دین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آئین حضرت عائشہؓ بھی وہان موجود تھین،

ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً اُن کی ذاتی راے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیرین ادا تھین، مین نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اُن کے حسن و جمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا غرض وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئین، آپ نے فرمایا اگر اس سے بہتر بات تمھارے ساتھ کیجائے تو قبول کرو گی، انھون نے پوچھا وہ کیا ہے، آپ نے فرمایا تمھاری طرف سے مین روپیہ ادا کر دون، اور تم کو اپنی زوجیت مین لے لون، حضرت جویریہؓ نے کہا مین نے منظور کیا، آنحضرتؐ نے وہ رقم ادا کر دی، اور ان سے شادی کر لی؛

؎ ابوداؤد کتاب العتاق،

یہ ابن اسحاق کی [illegible] روایت ہے [illegible] دوسرے طریق

روایت میں [illegible]

آ[illegible] حارث [illegible] عجیب گرے

ہوئیں [illegible] آنحضرت [illegible] کی خدمت [illegible] کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی میری

شان اس [illegible] جویریہ کی مرضی

پر چھوڑ دیا جائے۔ حارث نے جا کر جویریہ سے کہا کہ محمدؐ نے تیری مرضی پر [illegible] دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انہوں

نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی [illegible] چنانچہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے ان سے شادی کرلی

[illegible] نقل [illegible]

ابن سعد نے بھی [illegible] کہ حضرت

جویریہ کے والد نے ان کا زرفدیہ [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ان سے نکاح کرلیا۔

اس نکاح کا اثر

حضرت جویریہ [illegible] جب [illegible] جو اہل فوج کے حصہ میں گئے

تھے، [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی

کرلی [illegible]

واقعہ افک

واقعہ افک [illegible] حضرت [illegible] جو حضرت [illegible] لڑائی سے

۱؎ سنن ابی داود کتاب العتق [illegible]

دلچسپی میں پیش آیا تھا، احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے، لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ کھلا افترا ہے، اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں،

البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے، یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آگئے جن کو حد قذف کی سزا دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے،

آج کل کے عیسائی مؤرخین نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش و مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے، لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کرسکتے تھے،

یہ تمام لڑائیاں اس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود نے متحدہ قوت سے کرنا چاہی تھی، اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں،

غزوۂ احزاب
یعنی تمام عرب کی متحدہ جنگ
ذوقعدہ سنہ ۵ھ

بنو نضیر مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے، تو انھوں نے یہاں نہایت بڑا [illegible] سازش [illegible] ان کے رؤسا میں سے [illegible]

[illegible]

بنی النضیر عن دیارھم (ج ۲ ص [illegible]) [illegible]

فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۱ غزوہ [illegible]

[illegible] ملتقی [illegible]

ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان [illegible]

ثم خرجوا [illegible]

من بنی [illegible]

کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کیا جاسکتا ہے، قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلہ غطفان کے پاس گئے، اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف حاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، قصۂ غزوۂ معونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیس قبیلہ نے بنی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی، اس لئے یہ فوراً تیار ہوگئے) بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو کہلا بھیجا کہ تم بھی فوجیں لیکر آؤ، قبیلہ بنو سُلَیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق سے انھوں نے بھی ساتھ دیا، بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا، غرض تمام قبائل عرب سے لشکر گراں تیار ہوکر مدینہ کی طرف بڑھا، فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی،[2]

یہ لشکر تین مستقل فوجوں[3] میں تقسیم تھا، غطفان کی فوجیں عیینہ[4] بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں، جو عرب کا مشہور سردار تھا، بنو اسد طلیحہ کی افسری میں تھے، اور ابو سفیان (بن حرب) سپہ سالارِ کل تھا،[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبریں سنیں تو صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے، انھوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں

---

۱ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع ۲ طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ و فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۱ س ۳ طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ س ۴ افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے، اس سلسلہ میں مورخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتائے ہیں، چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رخیلہ تھا، بنو مرہ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہوگئے تھے زرقانی ج ۲ قسم اول ص ۴۷ س ۵ طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ س

نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہین، ایک محفوظ مقام مین لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے،
خندق دراصل فارسی کندہ کا معرب ہو جس کے معنی کھودے گئے کے ہین، کاف، خ، سے، اور ہائے ہوز
قاف سے بدل گئی ہے، جس طرح پیادہ سے بیدق ہو گیا ہے،

تمام لوگون نے اس رائے کو پسند کیا، اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے،

مدینہ تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف
شامی رخ کھلا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام
مین خندق کی تیاریان شروع کین، یہ ذوقعدہ کی ۸ تاریخ تھی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود خود قائم کئے، داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیون پر
دس دس گز زمین تقسیم کی، خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا، بیس دن مین ۳ ہزار متبرک ہاتھون
سے انجام پائی،

یاد ہو گا کہ جب مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرور دو جہان مزدورون کی صورت مین تھے، آج
بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے، جاڑے کی راتین ہین، تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار
اپنی پیٹھون پر مٹی لادلاد کر پھینکتے ہین، اور جوش محبت مین ہم آواز ہو کر کہتے ہین،

نحن الذین بایعوا محمدا، علی الجہاد ما بقینا ابدا

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مٹی پھینک رہے ہین، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے، اسی
حالت مین یہ رجز زبان پر ہے،

فاللہ لولا اللہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینۃ علینا   وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الالی قد بغوا علینا   وان ارادوا فتنۃ ابینا

ابینا کا لفظ جب آتا تو زور زور سے پکار کر کہتے تھے، اس کے ساتھ ہمارے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے، اور یہ موزون فقرہ زبان پر لاتے تھے،

اللھم انہ لا خیر الا خیر الآخرۃ   فبارک فی الانصار والمہاجرۃ

[illegible] ایک سخت چٹان [illegible] کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا، اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا، آپ نے دست مبارک سے پھاوڑا مارا، تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی،

خندق کی تیاری کے بعد عورتیں اور بچے اور مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں، اور چونکہ بنو قریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت سلمہ بن اسلم دو سو آدمیوں کے ساتھ متعین کئے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے،

بنو قریظہ اب تک الگ تھے لیکن بنو نضیر نے ان کے ملانے کی کوشش کی، حیی بن اخطب (حضرت صفیہ کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیی نے کہا میں فوجوں کا دریا ساتھ لایا ہوں، قریش، غطفان، تمام عرب امنڈ آیا ہے، اور سب محمد کے خون کے پیاسے ہیں، یہ موقع ہاتھ سے دینے کے قابل نہیں، اسلام کا خاتمہ ہے، کعب اب بھی راضی نہ تھا، اس نے کہا میں نے محمد کو ہمیشہ راست باز پایا، ان سے عہد شکنی

[illegible] صحیح بخاری [illegible]

کرنا ضرورت [illegible] نہیں [illegible]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمام حجت کے لئے سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو وہاں سے آکر اس خبر کو [illegible] دونوں صاحبوں نے بنو قریظہ کا معاہدہ یاد دلایا تو انھوں نے کہا، ہم نہیں جانتے محمد کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے، غرض بنو قریظہ بھی [illegible] ذکر [illegible] قریش، یہود اور قبائل عرب دس ہزار فوجیں تین سمتوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کے تین طرف اس زور و شور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی،

اس معرکہ کی تصویر [illegible] نے کھینچی ہے

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ	جب کہ دشمن اوپر کی طرف سے اور نشیب کی
مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ	[illegible] اور جب آنکھیں [illegible]
وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ [illegible]	[illegible] اور تم خدا کی [illegible]
وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ	[illegible]
ابْتُلِيَ [illegible] وَزُلْزِلُوا	[illegible]
زِلْزَالًا [illegible]	[illegible]

فوج اسلام کی [illegible] تین ہزار تھی [illegible] ان کے ساتھ تھے، لیکن موسم کی سختی [illegible] فوجوں کا ہجوم ایسے

واقعات تھے، جنھوں نے اُن کا پردہ فاش کردیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دیجائے،

یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ وَمَا ھِیَ	کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں،
بِعَوْرَۃٍ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (احزاب-۲)	وہ کھلے نہیں، بلکہ اُن کو بھاگنا مقصود ہے،

لیکن جاں نثارانِ اسلام کا طلاے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا،

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ	جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں
قَالُوْا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ	تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا
وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَمَا	نے اور اس کے رسول نے کیا تھا، اور خدا
زَادَھُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ہ	اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات
(احزاب-۳)	نے اُن کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر تین تین فاقے گذر گئے، ایک دن صحابہ نے بیتاب ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیٹ شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں لیکن جب آپ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے۔[1] محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہوگیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی

---

[1] شمائل ترمذی، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پتھر باندھتے تھے جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی،

موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب دیا۔

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، ادھر دوسری سمت سے یہودیوں نے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اہل و عیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں، جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں، ایک حصہ خود آپ کے اہتمام میں تھا،

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ انصار ہمت ہار جائیں، اس لئے آپ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دیا جائے، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ کو جو انصار کے سردار تھے، بلا کر مشورہ کیا، دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا، اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے، یہ استقلال دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوا، حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا مسودہ ہاتھ میں لیکر تمام عبارت مٹا دی،[2] اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

---

[1] صحیح بخاری ذکر غزوہ احزاب و صحیح مسلم کتاب الفضائل میں، ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان کا نام ہے، شارحین نے دونوں روایتوں کے وقتوں کی تطبیق یہ کی ہے، حافظ ابن حجر اور زرقانی نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضرت حذیفہؓ قریش کی تحقیق حال کے لئے اور حضرت زبیرؓ بنو قریظہ کی تحقیق خبر کیلئے گئے تھے، یہ تفصیل واقدی اور زرقانی نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہے، فتح الباری ج ۷ ص ۳۱۲ و زرقانی ج ۲ ص ۱۲۰) [2] طبری ج ۳، ص ۱۴۷۴،

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل ابو سفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، ہبیرہ، کا ایک ایک دن مقرر ہوا، ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا، خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے لیکن خندق کی چوڑائی چونکہ زیادہ نہ تھا، اس لئے باہر سے تیر اور پتھر برساتے تھے،

چونکہ اس طرح فتح یابی نہیں ہوئی، اس لئے قرار پایا کہ عام حملہ کیا جائے، تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے، خندق ایک جگہ سے کم چوڑی تھی، یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا، عرب کے مشہور بہادر یعنی ضرار، ہبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدود نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا، تو اس پار تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا، وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا، اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا، بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا، اس وقت اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی، تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا، اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے، حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں"، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے، حضرت علیؓ بیٹھ گئے، لیکن عمرو کی آواز پر کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا، عمرو نے دوبارہ پکارا، اور پھر وہی صورت، یعنی صدا جواب نہ پاتی، تیسری دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے تو حضرت علیؓ نے عرض کی "میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے"، آنحضرت صلعم نے اجازت دی خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا،

عمرو کا یہ [illegible] تھا کہ اگر کوئی شخص دنیا میں اُس سے تین باتوں کی درخواست کرے، تو ایک ضرور قبول کرے گا۔ حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ یہ سچ ہے؟ اُس نے کہا ہاں، اس کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔

حضرت علیؓ — میری [illegible] یہ ہے کہ تو اسلام قبول کر۔

عمرو — یہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت علیؓ — لڑائی سے واپس چلا جا۔

عمرو — میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔

حضرت علیؓ — تو مجھ سے لڑ۔

عمرو ہنسا، اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست کوئی میرے سامنے پیش کی جائے گی، حضرت علیؓ کو پیادہ دیکھ کر عمرو کی غیرت نے گوارا نہ کیا، گھوڑے سے اتر آیا، اور پہلے گھوڑے کے پاؤں پر اس زور سے تلوار ماری کہ کونچیں کٹ گئیں، پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا، بولا کہ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا [illegible]۔ لیکن میں چاہتا ہوں، عمرو [illegible] تھا، طیش سے تلوار نکالی، اور آگے بڑھ کر وار کیا، حضرتؓ نے سپر پر روکا، تلوار سپر میں ڈوب کر نکل گئی، اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری نہ تھا، تاہم عمر بھر آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا۔ قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو ذوالقرنین کہتے تھے جس کی [illegible] آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا، اور ایک ابن ملجم دشمن کا [illegible] حضرت علیؓ نے [illegible] عمرو [illegible] [illegible] حضرت علیؓ نے نعرۂ تکبیر کا نعرہ مارا، اور فتح کا اعلان ہوگیا، عمرو کے بعد [illegible] نے [illegible] والفقار کا

ہٹھ بڑھا، تو پیچھے ہٹنا پڑا، حضرت عمر فاروقؓ نے ضرار کا تعاقب کیا، ضرار نے مڑکر برچھے کا وار کرنا چاہا، لیکن روک لیا، اور کہا عمر! اس احسان کو یاد رکھنا،

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گر، صحابہؓ نے تیر مارنے شروع کئے، اُس نے کہا "مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں" حضرت علیؓ نے درخواست منظور کی، اور خندق میں اُتر کر تلوار سے مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔[1]

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا، تمام دن لڑائی رہی، کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینھ برسا رہے تھے، اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں متصل تیراندازی و سنگباری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا،

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھی، یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا، ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا، اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا حضرت صفیہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی) نے دیکھ لیا، مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کر دیئے گئے تھے، حضرت صفیہؓ نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا،

---

[1] یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں، لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے، ابن سعد اور خمیس سے ماخوذ ہے [2] اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں، یا ایک اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن کی، ہم اگر اور تاریخ میں یہ بحث مفصل ہو،

حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی، اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا، حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی، اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا، حضرت صفیہؓ چلی آئیں، اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ، حسانؓ نے کہا جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ، اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینی پڑی، یہودیوں کو یقین ہو کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے، اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔[1]

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا، محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے، دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی، کہ طوفان آ گیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولھوں پر الٹ الٹ جاتے تھے، اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام کیا، اسی بنا پر قرآن مجید نے اس واقعہ کو خدائی فوج سے تعبیر کیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا	مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد رکھو
نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ	جب کہ تم پر فوجیں آئیں تو ہم نے ان
جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا	پر آندھی بھیجی، اور فوجیں بھیجیں جو تم کو

[1] زرقانی بحوالہ طبرانی وبزار وابویعلی بہ سند (حسن) دیکھو ص ۱۲۵، جلد ۲، ابن ہشام۔

جنود اللہ تعوذ (جواب ۔۔)   وکھائی نہیں دیتی ،

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے ، قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے ، وہ اسلام لاچکے تھے لیکن لوگوں کو ابھی اس کا علم نہ تھا ، انہوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جاکر اس قسم کی باتیں کیں جن سے دونوں میں پھوٹ پڑگئی ،

ابن سعد کی روایت ہے کہ نعیم نے آنحضرت سے اجازت لی تھی کہ دونوں سے مختلف باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہوجائیں اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الحرب خدعة فرمایا ہے ، ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور زرقانی نے ... تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ یہ واقعہ محض ان کی سند سے قبول کرلیا جائے اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقین کا اتحاد بغیر اس کے ٹوٹ جاتا ... ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے جاکر کہا کہ قریش تو چار روز کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے ، تمہارا اور مسلمانوں کا ساتھ رہے گا ، اس لئے قریش سے بیچ میں ضمانت کے لئے یرغمال لینے ہوں گے ... قریش ... تمہارے ... ان ...

... دکھا ... جائیں تو تم ... دینا "

... قریش ... کہتے تھے کہ ...

... ابن اخطب ... شرط ... قریش

... تمہارے پاس ... قریش ... قسم کی ضمانت ... رہے تھے

اس لیے جب انھوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود پھوٹ پڑ گئی ہوگی، اس کے لئے ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی[1]،

بہرحال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علیحدگی، تمام اسباب ایسے جمع ہوگئے تھے کہ قریش کے پاے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے، ابوسفیان نے فوج سے کہا: رسد ختم ہوچکی، موسم کا یہ حال ہے کہ یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بیکار ہے، یہ کہکر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا، غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہوگئے، بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰-۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہوگیا،

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ — اور خدا نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا (پھیر دیا)

---

[1] مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل سے حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے، اس روایت کے رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے حوالہ کردیں، مگر انھوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی، اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے شبہ پیدا ہوگیا تھا، اور انھوں نے خفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیام بھیجا کہ بنو نضیر جو خیبر کو جلاوطن کردیے گئے تھے، پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے، نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے، ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرمادیا، انھوں نے جاکر یہ قریش تک پہنچادیا، جس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہوگئی، اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا (دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۂ خندق والبدایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۱۱۲، مصر، س)

لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا وَّكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ ۔ (احزاب ۳) ‏ ‏ ہٹا دیا کہ اُن کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی،

اس معرکہ میں فوج اسلام کو جانی نقصان کم ہوا، لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے سردار تھے، زخمی ہوئے، اور پھر جانبر نہ ہو سکے، اُن کے زخم لگانے کا واقعہ پُراثر اور عبرت انگیز ہے،

حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزین تھیں، حضرت سعدؓ بن معاذ کی ماں بھی وہیں اُن کے ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مڑ کر دیکھا، تو سعدؓ ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں، اور یہ شعر زبان پر ہیں،

لَبِّثْ قَلِیْلًا یُدْرِکُ الْهَیْجَا حَمَلْ ‏ ‏ لَا بَأْسَ بِالْمَوْتِ اِذَا الْمَوْتُ نَزَلْ

ذرا ٹھہر جاؤ کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے ‏ ‏ وقت جب آگیا تو موت سے کیا ڈرنا

حضرت سعدؓ کی ماں نے سُنا تو پکاریں بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی، سعدؓ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ اُن کے دونوں ہاتھ باہر تھے، حضرت عائشہؓ نے سعدؓ کی ماں سے کہا کاش سعدؓ کی زرہ بڑی ہوتی، اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہاتھ پر تیر مارا، جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی، خندق کا معرکہ ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا، اور اُن کی تیمارداری شروع کی، اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں جو

۱؎ ابن ہشام و طبری و خمیس۔ [illegible] حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ) میں امام بخاری کی

اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، یہ خیمہ انہی کا تھا، اور وہ علاج کی نگران تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دست مبارک میں مشقص[1] لیکر داغا لیکن پھر ورم کرآیا، دوبارہ داغا لیکن پھر فائدہ نہ ہوا، کئی دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا، اور انھوں نے وفات پائی،

بنو قریظہ کا خاتمہ اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، اور اُن کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی لیکن جب قریش نے اُن کو تحریص و تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادہ بغاوت ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنی چاہی، بنو نضیر نے انکار کیا، اور وہ جلاوطن کر دیے گئے، لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا[1] چنانچہ اُن کو امن دیدیا گیا، صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

عن ابن عمر ان یهود بنی النضیر و قریظة حاربوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بنو نضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۲) ادب المفرد سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، حضرت سعدؓ انہی کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے، ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبوی کے پاس تھا، اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح ہونے کا ذکر ہے۔ [1] مسلم باب التداوی [2] واقدی نے حُیّی بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ کر کے ٹھہر جانے کے واقعہ کو اُن کی سازشی چال ظاہر کیا ہے، حُیّی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے ٹھہر گئے ہیں تاکہ موقع پاکر اندر سے مسلمانوں پر حملہ کر سکیں مغازی واقدی ص ۳۶۲ (کلکتہ) "ش"

فاجلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر واقر قریظة ومن علیهم — صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کی تو آپ نے بنونضیر کو جلاوطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا"

(صحیح مسلم ذکر جلاء الیہود من الحجاز) — اُن پر احسان کیا،

بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے تو اُن کے رئیس اعظم حیی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق خیبر میں جاکر آباد ہوئے، اور وہاں ریاست عام حاصل کر لی، جنگ احزاب انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، قبائل عرب میں دورہ کرکے تمام ملک میں آگ لگا دی، وہ قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اس وقت قریظہ معاہدہ پر قائم تھے، لیکن حیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا، اور اُن سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے دست بردار ہو کر چلے گئے، تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آرہوں گا، چنانچہ اُس نے یہ عہد وفا کیا،

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت کی، اور شکست کھا کر ہٹ آئے، تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو ساتھ لائے۱؎،

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُن کا آخری فیصلہ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں، وہ قریظہ کی طرف بڑھیں، قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو نہایت اطمینان سے تصفیہ کے بعد اُن کو امن دیا جاتا، پیشتر بنو نضیر کا فیصلہ کر چکے تھے، [illegible] آنحضرت اُن کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے

۱؎ سرولیم میور صاحب [illegible] لکھتے ہیں [illegible] جنگ [illegible] حصہ لیا تھا [illegible] قرآن مجید [illegible]

علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں۔[1] غرض اُن کا محاصرہ کیا گیا، اور تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا، بالآخر انھوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔[2]

حضرت سعدؓ بن معاذ اور اُن کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا، عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھکر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست منظور کی،

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے، چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلۂ نماز، رجم، قصاص، باشل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توراۃ ہی کی پابندی فرمائی، حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے،[3] توراۃ کے مطابق تھا، توراۃ کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے:

تجب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کریں، اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو اُن کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب قتل کر دے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۴) قرآن میں صاف یہ الفاظ ہیں، وانزل الذین ظاہر وھم من اہل الکتاب، مظاہرہ (امداد) سے بڑھکر اور کون لفظ مددگاری کا ہے، [1] طبری ج ۳ ص ۱۴۸۵، ابن ہشام صفحہ ۲۰۴ جلد دوم،

[2] طبری جلد ۳ ص ۱۴۸۵ میں ہے حتی اذ دنا من الحصون سمع منہا مقالۃ قبیحۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہم

[3] صحیح مسلم جلد (۲) ص ۹۴ (باب جواز قتال من نقض العہد وجواز انزال اہل الحصون علی حکم حاکم عدل اہل للحکم ص ۹۴) اور نیز بخاری (باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب ص ۵۹۱) میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے، گو دوسی صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعد بن معاذ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ بالآخر ہلاک ہوگئے، اس لئے انھوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بیرحمانہ فیصلہ کیا، لیکن وہ تیرانداز ابن العرقہ قریشی تھا، قریظی نہ تھا، صحیح بخاری و مسلم میں صاف یہ تصریح ہے، ۱۲

باقی بچے، عورتیں جو نذر، اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے مال غنیمت ہوں گی،"

احادیث میں مذکور ہے کہ سعدؓ نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا، یہ اسی تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا، یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے اُن کی زبان سے نکلے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکم الٰہی کے موافق سمجھتے تھے، حیی بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، اور یہ فقرے کہے،

اما واللہ ما لمت نفسی فی	ہاں خدا کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں
عداوتک ولکنہ من یخذل	کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی، لیکن
اللہ یخذل،	بات یہ ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے خدا
	بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے،

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا،

ایھا الناس، انہ لا باس بامر اللہ	لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں،
کتاب وقدر وملحمۃ کتبھا	یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا، ایک سزا
اللہ علی بنی اسرائیل،[۱]	تھی، جو خدا نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی،

حیی بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دیگا،[۲] اس

۱؎ یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوہ بنی قریظہ) میں ہیں طبری میں بھی تقریباً یہی الفاظ ہیں ۲؎ بلاذری مطبوعہ یورپ

معاہدہ پر اس نے خدا کو ضامن کیا تھا، لیکن احزاب مین اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گذر چکا،

بنو قریظہ کے متعلق مخالفینِ اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے،

لیکن واقعات حسب ذیل ہین،

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ مین آکر اُن کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس مین اُنکے مذہب کو پوری آزادی دی گئی، اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا،

۲۔ بنو قریظہ رتبہ مین بنو نضیر سے کم تھے یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خونبہا دینا پڑتا تھا، بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خونبہا ادا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ پر یہ احسان کیا کہ اُن کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا،

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی،

۴۔ باوجود ان باتون کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب مین [illegible]

۵۔ خود مستورات قلعہ مین حفاظت کے لیے بھیج دی گئی تھین ان پر حملہ کرنا چاہا،

۶۔ حیی بن اخطب جو بغاوت کے جرم مین جلاوطن [illegible] عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی، اس کو اپنے ساتھ [illegible] قتل کا [illegible]

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا [illegible]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۶) صفحہ ۲۲ (یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ [illegible] بھی مذکور ہے اور [illegible] باب النضیر [illegible]

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرب مین محالفت کا معاہدہ اخوتِ حقیقی کے برابر تھا، بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے، اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے اُن کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی، حضرت سعدؓ بن معاذ اوس کے سردار تھے، اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے، وہ سخت کشمکش مین تھے، اُن کے حلیفون کی موت وحیات کا مسئلہ تھا جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے لیکن حضرت سعد بن معاذؓ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

مقتولین کی تعداد ارباب سیر نے ۶۰۰ سے زیادہ بیان کی ہے لیکن صحاح مین ۴۰۰ ہے، اُن مین صرف ایک عورت تھی، اور وہ اس قصاص مین ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان (خلادؓ)[۱] کو قتل کر دیا تھا، اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی سنن ابی داؤد مین وہ حسب[۲] ذیل حیرت انگیز طریقہ سے مذکور ہے،

اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست مین اس کا نام بھی ہے، قتل گاہ مین مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے، ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا، اور یہ ہوش ربا صدا بار بار اس کے کانون مین آتی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہؓ سے باتین کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی، دفعۃً قاتل نے اس کا نام پکارا، وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہان؟ بولی مین نے ایک جرم کیا تھا، اس کی سزا اٹھانے جاتی ہون، خوشی خوشی قتل گاہ مین آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا،

حضرت عائشہؓ جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھین تو نہایت حیرت کے لہجہ مین بیان کرتی تھین۔

---

۱ ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ ۲ ابوداؤد کتاب الجہاد باب قتل النساء

ریحانہ کا واقعہ۔ مستند ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا، اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، چنانچہ جن مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے، انھوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ، عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے ایک مورخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ "بانی اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آکر تفریح خاطر کے لئے ....

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے،

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں لیکن واقدی نے بتصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا ابن سعد نے واقدی کی جو روایت کی ہے اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں،

فاعتقنی وتزوج بی	پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد اور مجھ سے نکاح کر لیا،

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں،

وکانت ریحانۃ القرظیۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسکنہ،	اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں، اس مکان میں رہتی تھیں

وهی عند اصحابه ... بکرد ہیں

نکاح ایک معمولی بات [illegible] اور اس کی تفصیل کا موقع [illegible] ازواج مطہراتؓ کا عنوان ذیشان میں واقعہ میں ایسے حالات پیش ہو گئے جنہوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص و نکتہ چینی (معاذ اللہ) کے لیے ان کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی واقعہ کارآمد نہیں ہو سکتا

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی محرک کیا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو جو بچپن [illegible] گھر میں رہتے تھے متبنّی بنا لیا تھا جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں، ان کی ماں امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں، لیکن چونکہ زیدؓ غلام رہ چکے تھے، اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی۔

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے راضی [illegible]

حضرت زینبؓ [illegible]

[illegible]

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آکر شکایت کی، اور اُن کو طلاق دینا چاہا،

جاءَ زَیدُ بن حارثۃ فقال یا	زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے
رسُول اللّٰہ انّ زینب اشتد علیّ	اور عرض کی کہ زینب مجھ سے زبان درازی
لسانھا وَانا اُرید ان اطلقھا[1]	کرتی ہیں، اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں

لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بار بار اُن کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں قرآن مجید میں ہے

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ	اور جب کہ تم اس شخص سے جس پر خدا نے
وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ	اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی
زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ، (احزاب ۵)	کو نکاح میں رہنے دو، اور خدا سے خوف کرو،

لیکن کسی طرح صحبت برآر نہ ہو سکے، اور آخر حضرت زیدؓ نے اُن کو طلاق دیدی، حضرت زینبؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہن تھیں، اور آپ ہی تربیت میں پلی تھیں، آپکے فرمانے سے، انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا، جو اُن کے نزدیک اُن کے خلافِ شان تھا لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جو مساواتِ اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہیں ہو سکتی جب وہ مطلقہ ہو گئیں تو آپ نے اُن کی دلجوئی کے لئے خود اُن سے نکاح کر لینا چاہا لیکن عرب میں اس وقت متبنی اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا، اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ تامل فرماتے تھے لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی، اور اس کا مٹانا مقصود تھا، اس لئے یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ روایت عبدالرزاق از معمر از قتادہ،

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ	اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو
وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ	خدا ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے
تَخْشٰهُ (احزاب ۵)	ہو حالانکہ ڈرنا خدا سے چاہیئے،

غرض آپ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا، اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتی ہے، مٹ گئی، اس پر منافقوں اور بدگویوں نے طعنے دیئے لیکن امر حق کے اجراء میں مطاعن کا آماجگاہ بننا لازمی ہے،

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتاپا کذب وافتراء ہے، لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے،

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، زید نہ تھے حضرت زینبؓ کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا، اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے،

سبحان اللّٰہ العظیم سبحان اللّٰہ	پاک ہے خدائے برتر، پاک ہے وہ خدا جو
مصرف القلوب[1]،	دلوں کو پھیر دیتا ہے،

حضرت زیدؓ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ زینبؓ اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں ان کو طلاق دیدوں،

---

[1] تاریخ طبری غزوات سنہ ۵ ہجری

ہیں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کرکے نقل کی ہے نقلِ کفر کفر نہ باشد یہی روایت ہے جو عیسائی مؤرخوں کا مایۂ استناد ہے، لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے، مورخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب، اور دروغ گو ہے، اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سندہات آئے،

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن محدثین نے اُن کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اُن سے تعرض کیا جائے، حافظ ابن حجر سخت روایت پرست ہیں، تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر میں) جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے کہتے ہیں،

وَرَدَتْ آثارٌ اُخرىٰ اخرجها	اور اور بہت سی روایتیں آتی ہیں جن کو
ابن ابی حاتم والطبری ونقلها	ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے
کثیرٌ مِّنَ المفسّرین لا ینبغی	اور اکثر مفسرین نے اُن کو نقل کر دیا ہے ان
التشاغل بها	روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے،

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں،

ذکر ابن ابی حاتم وابن جریر	ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع
ههنا آثاراً عن بعض السلف رضی الله عنهم	پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی
احببنا ان نضرب عنها صفحاً لعدم	ہیں جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے
صحتها فلا نوردها وقد روی	ہیں کہ وہ غلط ہیں، اور امام احمد نے بھی اس

الامام احمد ههنا ایضاً من روایۃ	واقعہ کے متعلق انس سے ایک روایت نقل
حماد بن زید عن ثابت عن انس	کی ہے، جو غریب ہے، ہم نے اس کا ذکر
رضی اللہ عنہ فیہ غرابۃ ترکنا سیاقہ (ایضاً)	بھی چھوڑ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقون کا بہت زور تھا، حضرت عائشہؓ پر لوگون نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے، منافقین ان خبرون کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتی تھین، یہان تک کہ حضرت عائشہؓ کی تہمت مین خود چند مسلمان بھی آلودہ ہوگئے جن کو شریعت کے موافق **قذف** کی سزا دی گئی، یہی روایتین ہین جو کچھ کچھ غیر محتاط کتابون مین باقی رہ گئین لیکن وہ محدثین جن کا معیار تحقیق بلند ہے، اور عدالت روایت کے حاکم ان مجاز ہین، مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ اُن کے ہان ان روایتون کا ذکر تک نہین آتا،

واقعات متفرقہ ۵ھ

اس سال کی تاریخ مذہبی مین سب سے اہم واقعات عورتون کے متعلق متعدد اصلاحی احکام کا نزول ہے، اب تک مسلمان عورتین عام جاہلانہ طریقہ سے چلتی پھرتی تھین، اور اس قسم کے لباس و زیور پہنتی تھین اب حکم ہوا کہ شریف عورتین گھر سے نکلین تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کرین جس سے منھ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلین، پانوٴن جھنک جھنک کر نہ چلین، پردہ کی اوٹ سے بولین، تصنع اور بناوٴ کی بولی نہ بولین، ازواج مطہراتؓ کے لئے غیر مردون کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا،

منھ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت مین بیاہ ناجائز تھا اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی، زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی، عفیف عورتون پر الزام لگانا جاہلیت

کا ایک معمولی فعل تھا، اور ان کمزورون کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر بھی اس سال "حدِ قذف" نازل ہوئی، جس کے رو سے بغیر شہادت کے تہمت لگانا جرم قرار دیا گیا، بصورت عدم وجود شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا، یعنی زن وشوہر دونون اپنی سچائی اور فریق ثانی کی دروغ گوئی کا بحلف اظہار کرین، اور اس کے بعد اُن مین تفرقہ کرادیا جائے[1]،

عرب مین ایک قسم کی طلاق جاری تھی جسکو ظہار کہتے ہین، اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی، اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا،

پانی نہ ملنے کی حالت مین تیمم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے بروایت صحیحہ نماز خوف کا حکم قرآن مجید مین اسی سال نازل ہوا جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی)

---

[1] بخاری جلد ۲ ص ۷۰۰ وسیرت گذر چکی ہے، ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۱۲ نیز فتح الباری جلد ۲ ص ۱۰۷ دیکھنا چاہئے،
یہ تمام احکام سورہ نور مین بتقریب واقعۂ افک سنہ ۵ھ مین نازل ہوئے،

سنہ ۶ھ

صلح حدیبیہ و بیعت رضوان

ذوقعدہ سنہ ۶ھ

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں گاؤں بھی اسی کوئیں کے نام سے مشہور ہوگیا، چونکہ معاہدہ صلح یہیں لکھا گیا، اس لئے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم ہے یعنی اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا، اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی، تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے؛

کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا، اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی تھی، اور یہ لقب اسلام بھی، انہی کی ایجاد ہے؛

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج-۱۰) — ابراہیم ہی نے تمہارا نام مسلمان رکھا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شریعت ملی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی؛

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (حج-۱۰) — تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب،

زمانہ کے امتداد سے گو اُنکی اولاد بت پرست بن گئی تھی، تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا عرب کا قبلہ گاہ عام تھا، تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثۂ آبائی سمجھتا تھا، نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے تھے، بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے الگ تھا، عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارتگریاں اُن کی بقائے زندگانی کا ذریعہ تھیں، کیونکہ اُن کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی، تاہم چار مہینے تک جو شہر حرم کہلاتے تھے تمام لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں قبائل عرب دور دور سے سفر کرکے آتے اور قبلہ گاہ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجالاتے تھے، وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اب یکجا جمع نظر آتے تھے اور شیر وشکر ہو کر ملتے تھے، گویا بھائی بھائی ہیں، مسلمان بجبر مکہ سے نکالے گئے تھے لیکن یہ خیال اُن کے دل سے نہیں گیا تھا، اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر اُن کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے جسقدر اور قبائل کا ہے، اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گونا گون تعلقات تھے، وہ اُن کا قدیم اور محبوب وطن تھا، مکہ کی یاد ایک پھانس تھی، جو ہر وقت اُن کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی حضرت بلالؓ مکہ میں اسقدر ستائے گئے تھے تاہم انکو جب مکہ یاد آتا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے[1]،

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ	آہ کیا پھر کبھی وہ دن آئیگا کہ میں مکہ کی
بواد وحولی اذخر وجلیل	وادی میں ایک رات بسر کرونگا اور میرے آس پاس
وھل اردن یوما میاہ مجنۃ	اذخر اور جلیل ہوں اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں
وھل یبدون لی شامۃ وطفیل	مجنہ کے چشموں پر اتروں اور شامہ و طفیل مجھکو دکھائی دیں

---

[1] یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں، باب [illegible]

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے تھے لیکن خاندان و اہل بچے وہیں رہ گئے تھے،
اسلام کے فرائض میں حج بھی ہے جو ایک رکن عظیم ہے، غرض مختلف اسباب تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی احتمال نہ ہو، عمرہ کا
احرام باندھا، اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف
تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے، اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام
میں بند ہو،

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے، ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں
ہمرکاب ہوئے، مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوگئیں یعنی قربانی کے
اونٹ ساتھ تھے ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر جوتے کے نعل لگا دیئے گئے،
حفظ ما تقدم کے لئے قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے
بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آکر خبر دی
کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو جمع کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد مکہ میں ہرگز نہیں آسکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلہ کی تیاری کی قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا،
وہ سب تیار ہو کر مکہ سے باہر ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں، خالد بن ولید جو اب تک
اسلام نہیں لائے تھے دو سو سواروں کے ساتھ جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر
آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے، جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے،

سلہ وساق محلہ [illegible] العمرۃ [illegible] الامشاھد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے، اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں، اس سے کترا کر داہنی طرف سے چلو، فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد نے گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے، اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا، یہاں پانی کی قلت تھی ایک کنواں تھا، وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا، اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلۂ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا، لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے، قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے، وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے، اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقا تھے، (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا معلوم ہوا، تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے، وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ[1] کی غرض سے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں، جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا، ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لئے معاہدۂ صلح کر لیں، اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑونگا کہ

---

[1] عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں، اس میں بھی حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے، اور بال منڈائے یا کتروائے جاتے ہیں (اس)

میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے، بدیل نے جا کر قریش کو کہا کہ میں محمد کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں، اجازت دو تو کہوں، چند شریر بولے کہ ہم کو محمد کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی، بدیل نے آنحضرت (ﷺ) کی شرطیں پیش کیں،

عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا، کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں، بولے ہاں! عروہ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں، عروہ نے کہا اچھا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں خود جا کر معاملہ طے کروں، محمد نے معقول شرطیں پیش کی ہیں، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، قریش کا پیغام سنایا اور کہا محمد! فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا، تو کیا اس کی بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو، اس کے سوا اگر دوسرا پہلو کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی، حضرت ابوبکر کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ کیا ہم محمد (ﷺ) کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، عروہ نے آنحضرت (ﷺ) سے پوچھا یہ کون ہیں، آپ نے فرمایا ابوبکر، عروہ نے کہا میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے جس کا بدلہ ابھی تک میں ادا نہیں کر سکا،

عروہ آنحضرت (ﷺ) سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں، وہ ریش مبارک کی طرف بار بار ہاتھ بڑھاتا تھا حضرت مغیرہ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت (ﷺ) کی پشت پر کھڑے تھے، اس جرأت کو گوارا نہ کر سکے، عروہ سے کہا اپنا ہاتھ ہٹا لے، ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا، عروہ نے

حضرت مغیرہؓ کو پہچانا، اور کہا، او دغاباز کیا میں تیری دغابازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں
حضرت مغیرہؓ نے چند آدمی قتل کر دیے تھے، جن کا خونبہا عروہ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا،

عروہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا، اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا، قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں[1]،

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت خراش بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا، لیکن قریش نے اُن کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سواری کا تھا مار ڈالا، اور خود اُن پر بھی یہی گذرنے والی تھی، لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا، اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے،

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے، گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا، آپ نے سب کو چھوڑ دیا، اور معافی دے دی، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،[2]

(۱) بخاری کتاب الشروط فی الجہاد و المصالحۃ مع اہل الحرب و کتابۃ الشروط) (۲) ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے۔

بیعتِ رضوان

وَهُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْکُمْ — اور وہی خدا ہے جس نے مکہ میں اُن لوگون

وَاَیْدِیَکُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَکَّةَ مِنْ — کا ہاتھ تم سے اور تمھارا ہاتھ اُن سے روک دیا،

بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْهِمْ (فتح ۳) — بعد اس کے کہ تم کو اُن پر قابو دیدیا تھا،

بالآخر آپ نے گفتگوے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا، لیکن انھون نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہین، اور مکہ مین میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہین کہ مجھ کو بچا سکے، آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت مین مکہ گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا، قریش نے اُن کو نظر بند کر لیا، لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے، یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے؛ یہ کہکر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھکر صحابہؓ سے جان نثاری کی بیعت لی، تمام صحابہؓ نے جن مین زن و مرد دونون شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جان نثاری کا عہد کیا، یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، اس بیعت کا نام بیعة الرضوان ہے، سورۂ فتح مین اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے؛

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ — خدا مسلمانون سے راضی ہوا جب وہ تیرے

اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ — ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو خدا نے

مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ عَلَیْهِمْ — جان لیا جو کچھ ان لوگون کے دلون مین تھا،

وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا — تو خدا نے اُن پر تسلی نازل کی، اور عاجلانہ

(فتح ۳) — فتح دی،

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی،

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو خطیب قریش کا خطاب دیا تھا، قریش نے ان سے کہدیا کہ صلح اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمد اس سال واپس چلے جائیں،

سہیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی، بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں، حضرت علیؓ نے عنوان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا،

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں باسمک اللھم لکھتے تھے، بسم اللہ الرحمن الرحیم سے وہ آشنا نہ تھے، اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے وہی قدیم عنوان لکھا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا، آگے کا فقرہ تھا، ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ یعنی یہ وہ معاہدہ ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا، سہیل نے کہا اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے، تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گو تم تکذیب کرتے ہو، لیکن خدا کی قسم میں خدا کا پیغمبر ہوں، یہ کہکر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو، حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گذار ہو سکتا تھا، لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبرداری سے انکار کرنا پڑتا ہے، حضرت علیؓ نے کہا، میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا، آپ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے، حضرت علیؓ نے وہ جگہ پر انگلی رکھدی، آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا،

یہ صحیح بخاری کی کتاب ... روایت میں حضرت علیؓ کا نام ... ہے ... بخاری کی کتاب ... میں ... کتاب المغازی ... باب عمرۃ القضاء میں ... صحیح مسلم ...

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہیں آتا تھا، اسی بنا پر آپ کو اُمّی کہتے ہین، یہ واقعہ مسلم مین جہان منقول ہے، لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابن عبد اللہ لکھ دیا، بخاری مین چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے، اس لئے ایک معرکۃ الآرا مباحثہ بن گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روز مرہ جب نظر سے گذرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا ہے، اس سے اُمیت مین فرق نہین آتا، بے شبہہ اُمّی ہونا آپ کا فخر ہے، اور خود قرآن مجید مین یہ وصف شرف وعزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے، اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (اعراف ۱۹)

شرائط صلح یہ تھے،[1]

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائین،

۲۔ اگلے سال آئین اور صرف تین دن قیام کرکے چلے جائین،

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئین، صرف تلوار ساتھ لائین، وہ بھی نیام مین اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) مین،

۴۔ مکہ مین جو مسلمان پہلے سے مقیم ہین، اُن مین سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لیجا ئین اور مسلمانون مین سے کوئی مکہ مین رہ جانا چاہے تو اُس کو نہ روکین،

۵۔ کافرون یا مسلمانون مین سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ مین جائے تو وہ واپس نہین کیا جائے گا،

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین مین سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ مین شریک ہو جائین

---

[1] یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم (صلح حدیبیہ) مین بھی ہین،

یہ شرطین بظاہر مسلمانون کے سخت خلاف تھین، اتفاق یہ کہ عین اُس وقت جب کہ معاہدہ
لکھا جا رہا تھا، سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابوجندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے، اور مدت سے کافرون
نے اُن کو قید کر رکھا تھا، اور طرح طرح کی اذیتین دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤن مین بیڑیان
پہنے ہوئے آئے، اور سب کے سامنے گر پڑے، سہیل نے کہا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم صلح کی تعمیل کا یہ پہلا
موقع ہے، اس (ابوجندلؓ) کو شرائطِ صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ابھی معاہدہ قلمبند نہین ہو چکا ہے، سہیل نے کہا تو ہم کو صلح بھی منظور نہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا اچھا ان کو نہین رہنے دو، سہیل نے نامنظور کیا، آپ نے چند دفعہ اصرار کیا، لیکن سہیل کسی طرح
راضی نہ ہوا، مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا پڑا، ابوجندلؓ کو کافرون نے اس قدر
مارا تھا کہ اُن کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے، اور کہا برادرانِ اسلام!
کیا پھر مجھ کو اسی حالت مین دیکھنا چاہتے ہو، ؟ مین اسلام لا چکا ہون، کیا پھر مجھ کو کافرون کے
ہاتھ مین دیتے ہو، تمام مسلمان تڑپ اُٹھے، حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت مین آئے اور کہا، یا رسول اللہ! کیا آپ پیغمبرِ برحق نہین ہین ؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہان
ہون، حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہین ؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہان ہم حق پر ہین، حضرت عمرؓ نے
کہا تو ہم دین مین یہ ذلت کیون گوارا کرین، آپ نے فرمایا مین خدا کا پیغمبر ہون، اور خدا کے حکم کی
نافرمانی نہین کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا، حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپ نے یہ نہین فرمایا تھا کہ ہم
لوگ کعبہ کا طواف کرین گے، آپ نے فرمایا لیکن یہ تو نہین کہا تھا کہ اسی سال کرین گے، حضرت
عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے، اور وہی گفتگو کی، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، وہ پیغمبرِ خدا ہین،

جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں؛

حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں اُن سے سرزد ہوئیں، تمام عمر سخت رنج رہا، اور اس کے کفارہ کے لیے انھوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کیے، بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے، لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں،

اس حالت کا گوارا کرنا گو صحابہؓ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا، ایک طرف (بظاہر میں) اسلام کی توہین ہے، حضرت ابوجندلؓ بیڑیاں پہنے چودہ سو جان نثاران اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرہ ایما ہو جائے، تو تلوار فیصلہ قاطع کے لیے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفاے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوجندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا،

یا اباجندل اصبرواحتسب فان اللہ	ابو جندل! صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمھارے
جاعل لک ولمن معک من المستضعفین	لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا،
فرجاو مخرجا انا قد عقدنا بیننا وبین	صلح اب ہو چکی، اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی
القوم صلحا وانا لانغدربہم (ابن ہشام)	نہیں کر سکتے،

غرض حضرت ابوجندلؓ کو اسی طرح پابزنجیر واپس جانا پڑا،

سلہ صحیح بخاری کتاب الشروط،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے، اور ام المومنین حضرت ام سلمہ سے شکایت کی، انھوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں، آپ نے باہر آکر خود قربانی کی، اور بال منڈوائے، اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا،

صلح کے بعد تین دن تک آپ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورہ اتری،

انا فتحنا لک فتحا مبینا (فتح-۱) ہم نے تجھکو کھلی ہوئی فتح عنایت کی،

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھے تھے خدا نے اس کو فتح کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، انھوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے ارشاد ہوا کہ ہاں، اس کے بعد سے حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی، وہ مطمئن ہو گئے، نتائج ابد نے اس نکتہ کی عقدہ کشائی کی،

اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے، اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے مہینوں قیام کرتے، اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آ جاتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان

---

(۱) کتب شروط ابن شہاب صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے

اخلاص، حسن عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاق کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے، اُن کی صورتیں یہی منظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لیکر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے، حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور حضرت عمروؓ بن العاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے،

معاہدہ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا جائے وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائیگا اس میں صرف مرد داخل تھے، عورتیں نہ تھیں، عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اُتری،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ
الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ
اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ
عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ
إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ
وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَآتُوهُمْ مَا
أَنْفَقُوا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ
تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ

مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت
کرکے آئیں تو اُن کو جانچ لو، خدا اُن کے
ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو
معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو اُن کو کافروں
کے پاس واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں
کے قابل ہیں، اور نہ کافر اُن عورتوں کے قابل
ہیں، اور ان عورتوں پر اُن لوگوں نے جو خرچ
کیا ہو، وہ تم اُن کو دیدو، اور تم اُن سے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۸) ذکر نہیں، بلکہ کتاب الشروط میں اس بنا پر باب سیر کی جگہ سے یہ واقعات رہ گئے، غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں، ہم نے اُن کو بھی لیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم و ابن ہشام سے ماخوذ ہیں،

أُجُورَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (ممتحنہ - ۲) | کر سکتے ہو، بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر دو، کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، اسلیے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے، سب سے پہلے حضرت عتبہ بن اُسید (ابوبصیر) بھاگ کر مدینہ آئے، قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ، عتبہ نے عرض کی کیا آپ مجھکو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھکو کفر پر مجبور کریں، آپنے ارشاد فرمایا خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا، حضرت عتبہؓ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے، لیکن مقام ذوالحلیفہ پہنچکر انھوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، دوسرا شخص جو بچ رہا اُس نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، ساتھ ہی ابوبصیر بھی پہنچے، اور عرض کی کہ آپنے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا، اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، یہ کہکر مدینہ سے چلے گئے، اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذوالمروہ کے پاس ہے، رہنا اختیار کیا، مکہ کے بیکس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے، چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی، اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروان تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا اس کو روک لیتے تھے، ان حملوں میں جو مال غنیمت مل جاتا تھا، وہ ان کی معاش کا سہارا تھا، قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں، اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا سکتا ہے، ہم مطلق تعرض نہ کریں گے، آپنے

آوارہ وطن مسلمانون کو لکھ بھیجا کہ یہان چلے آؤ، چنانچہ ابو جندل وغیرہ اُن کے ساتھی مدینہ مین آباد ہوگئے اور کاروانِ قریش کا راستہ[1] بدستور کھل گیا

مستورات مین سے حضرت اُم کلثوم جو رئیس مکہ عقبہ بن ابی معیط کی صاحبزادی تھین اور مسلمان ہو چکی تھین مدینہ ہجرت کرکے آئین لیکن اُن کے ساتھ اُن کے دونون بھائی عمارہ اور ولید بھی آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اُن کو واپس دیدیجئے، آپ نے منظور نہین فرمایا صحابہ مین سے جن لوگون کی ازواج مکہ مین رہ گئی تھین، اور اب تک کافرہ تھین صحابہ نے ان کو طلاق دے دی،

[1] تفصیل کتب مغازی کلاعی سے خمیس نے نقل کی ہے،

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر ۶ھ یا شروع ۷ھ)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا، اور خطبہ دیا، اَیُّھَا النَّاس! خُدا نے مجھکو تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حواریین عیسیٰؑ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو۔ اس کے بعد آپ نے قیصر روم، شہنشاہ عجم، عزیز مصر، اور رؤسائے عرب کے نام دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے، جو لوگ خطوط لے کر گئے، اور جن کے نام سے گئے، ان کی تفصیل یہ ہے۱؎

(حضرت) دحیہ کلبیؓ	قیصر روم
(حضرت) عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ	خسرو پرویز شاہ ایران
(حضرت) حاطب بن ابی بلتعہؓ	عزیز مصر
(حضرت) عمروؓ بن اُمیہ	نجاشی بادشاہ حبش

۱؎ طبری ج [illegible] ص [illegible] و ابن ہشام، باب خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الملوک، [illegible]

(حضرت) سلیط بن عمرو بن عبد شمس،	روساے یمامہ
(حضرت) شجاع بن وہب الاسدی	رئیس حدود شام، حارث غسانی،

ایرانیوں نے چند برس پہلے بیت المقدس پر حملہ کرکے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت غُلِبَتِ الرُّومُ میں ہے، ہرقل نے اس کے انتقام کے لیے بڑے بڑے سامان کرکے تیاریاں کیں، اور ایرانیوں پر حملہ کرکے ان کو سخت شکست دی تھی، اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا، اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں جاتا تھا، زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے۔[1]

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیر حکومت رہا کرتا تھا، وہ غسانی خاندان تھا، اس کا پایہ تخت بصریٰ تھا، جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے، اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک یہیں بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا، اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا، قیصر کو خط ملا، تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ، اتفاق یہ کہ ابوسفیان چند عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے، قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جا کر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاج شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا، تخت کے چاروں طرف بطارقہ، قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں، اہل عرب کی جماعت طلب ہوئی کہ ترجمان

۱؎ ہرقل کا پورا واقعہ صحیح بخاری (ج اول ص ۴ و ص [illegible]) شرح صحیح بخاری [illegible] بدء الوحی وکتاب الجہاد و دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام [illegible] تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں،

سے اُس مُدّعیِ نبوّت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا میں پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی،

قیصر	مدّعی نبوّت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان	شریف ہے،
قیصر	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوّت کا دعویٰ کیا تھا؟
ابوسفیان	نہیں
قیصر	اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے ؟
ابوسفیان	نہیں
قیصر	جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر ؟
ابوسفیان	کمزور لوگ ہیں،
قیصر	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان	بڑھتے جاتے ہیں،
قیصر	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟
ابوسفیان	نہیں
قیصر	وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان	ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں ؟

قیصر — تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان — ہاں، [illegible]

قیصر — نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان — کبھی ہم غالب آئے کبھی وہ

قیصر — وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان — کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعے کہا کہ تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ [illegible] کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، [illegible] باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے [illegible] لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی [illegible] کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم [illegible] تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے [illegible]

قبضہ ہو جائے گا، مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا،

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا جائے،[1]

فرمان رسالت کے یہ الفاظ تھے،

بسم الله الرحمن الرحيم من محمد	بسم اللہ الرحمن الرحیم، محمد کی طرف سے
عبد الله ورسوله الى هرقل	جو خدا کا بندہ اور رسول ہے یہ خط ہرقل
عظيم الروم سلام على من	کے نام ہے، جو روم کا رئیس اعظم ہے،
اتبع الهدى، اما بعد فاني	اس کو سلامتی ہو، جو ہدایت کا پیرو ہو،
ادعوك بدعاية الاسلام	اس کے بعد میں تجھکو اسلام کی دعوت
اسلم تسلم يؤتك الله اجرك	کی طرف بلاتا ہوں، اسلام لا، تو سلامت
مرتين فان توليت فان عليك	رہے گا، خدا تجھکو دگنا اجر دے گا،
اثم الاريسيين ويا اهل	اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے
الكتاب تعالوا الى كلمة سواء	اوپر ہوگا، اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی
بيننا وبينكم الا نعبد الا	طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے،
الله ولا نشرك به شيئا و	وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں
لا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من	اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کو چھوڑ کر

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب جہاد میں بھی

دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا	خدا نہ بنائے، اور تم نہیں مانتے تو گواہ
بانا مسلمون،	رہو کہ ہم مانتے ہیں،

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی، اُس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اُس کے دل میں نورِ اسلام آچکا تھا، لیکن تاج وتخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی،[1]

خسرو پرویز (شہنشاہِ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک حضرت عبداللہ بن حذافہ لے کر گئے تھے، یہ تھا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم من	خدا رحمن ورحیم کے نام سے محمد پیغمبر کی طرف
محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم	سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام سلام
فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ	ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہوا

[1] مسند ابن حنبل صفحہ ۴، جلد ۴ میں ہے کہ حضرت دحیہؓ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمتِ نبویؐ میں بھیجا تھا، اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیئے تھے، اُس نے سوالات پوچھے، آپ نے جوابات دیے، اور آخر بغیر اسلام لائے، وہ واپس گیا، لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو بلایا اور انھوں نے پڑھ کر سنایا، حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے،

(جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ ص ۹۰ مسند ثانی ج ۳ ص ۴۰۰ و ۴۵۸ یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے، اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک فتح مکہ کے بعد جب سنہ ۹ھ میں پیش آیا ہے، اور حضرت معاویہؓ اس سے ایک یا دو سال پہلے صدیبیہ یا فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے، مگر تبوک میں حضرت معاویہؓ کی شرکت کہیں مذکور نہیں، یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابو عبید القاسم ابن سلام ص ۲۵۵ مصر میں بھی موجود ہے) "س"

وَاٰمن باللّٰہ ورسولہ وشہد	خدا اور پیغمبر خدا پر ایمان لاؤ اور یہی گواہی دے
ان لا الہ الا اللّٰہ وانی رسول اللّٰہ	کہ خدا صرف ایک خدا ہی اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام
الی الناس کافۃ لینذر من کان	دنیا کا پیغمبر مقرر کرکے بھیجا ہی تاکہ وہ ہر زندہ شخص
حیا اسلم تسلم فان ابیت	کو خدا کا خوف دلائے تو اسلام قبول کر تو سلامت
فعلیک اثم المجوس،	رہیگا ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا

خسرو پرویز بڑی شوکت وشان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت مین دربار کو جو عظمت و جلال حاصل ہوا، کبھی نہین ہوا تھا، عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان مین عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا نامۂ مبارک مین پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا، اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یون لکھتا ہے" پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا، لیکن چند روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے،

نظامی نے شیرین خسرو مین یہ داستان مفصل لکھی ہے اور اسلامی جوش سے لکھی ہے ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہین،

دران دوران کہ گیتی رام او بود[1]	ز مشرق تا بہ مغرب نام او بود
رسول ما بہ حجت ہاے قاہر	نبوت در جہان می کرد ظاہر
گہے با سنگ خارا راز می گفت	گہے ریگش حکایت باز می گفت

[1] اس سے خسرو مراد ہے،

خلایق را ز دعوت جام در داد / به هر کشور صلای عام در داد

بفرمود از عطا عطرے سرشتند / بہ نام ہر یکے سطرے نوشتند

چو از نام نجاشی باز پرداخت / ز بہر نام خسرو نامہ ساخت

چو قاصد عرضہ کرد آن نامۂ نو / بجوشید از غضب اندام خسرو

ز تیزی گشت ہر موئیش سنانی / ز گرمی ہر رگش آتش فشانی

سواد دیدہ روشن ہیبت انگیز / نوشتہ از محمدؐ سوے پرویز

چو عنوان گاہ عالم تاب را دید / تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

غرور پادشاہی بردش از راہ / کہ گستاخی کرا یارد؟ با چو من شاہ

کہ از ہرہ کہ با این احترامم / نویسد نام خود بالاے نامم

رخ از گرمی چو آتشگاہ خود کرد / بجوش اندیشہ بد کرد و بد کرد

درید آن نامۂ گردن شکن را / نہ نامہ بلکہ نام خویشتن را

فرستادہ چو دید آن خشمناکی / بہ رجعت پاے خود را کرد خاکی

ازان آتش کہ آن دود تہی داشت / چراغ آگہان[۱] را آگہی داشت

ز گرمی آن چراغ گردن افراز / دعا را دود چون پروانہ پرواز

عجم ازان دعا کسری در افتاد / کلاہ از تارک کسری در افتاد

نہ ہر شاہنشہے کز بیم دامید / قلم راند او برا فریدون و جمشید

۱؎ آگہان یعنی ارباب علم، چراغ آگہان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، آگہی داشت یعنی خبر کی،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا، فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا، ان دونوں نے بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کی کہ شاہنشاہِ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیل حکم نہ کروگے، تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کردے گا، آپ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہدینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی،[1] یہ لوگ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا،

نجاشی (بادشاہِ حبش) کو آپ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے پیغمبر ہیں،[1] حضرت جعفر طیار جو ہجرت کرکے حبش چلے گئے تھے، یہیں موجود تھے، نجاشی نے اُن کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی، ابن اسحاق نے روایت کی ہے، کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں عرضِ نیاز کے لئے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا، اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی،[2]

عام اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے، اور یہ خبر سُن کر آپ نے غائبانہ اُس کے جنازہ کی نماز پڑھائی، لیکن یہ غلط ہے کہ صحیح مسلم میں تصریح کی ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپ نے

۱؎ طبری (جلد ۳) ص ۱۵۷۲، ۲؎ طبری جلد ۳ ص ۱۵۶۹،

پڑھی، وہ یہ نہ تھا، لیکن ابن قیم نے ارباب سیر کی روایت کی تائید کی ہے، اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑہ کو راوی کا وہم بتایا ہے۔[۱]

جو لوگ ہجرت کرکے حبش چلے گئے تھے، ان میں حضرت اُم حبیبہؓ حضرت امیر معاویہؓ کی بہن بھی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ اُم حبیبہ کو شادی کا پیغام سنا دو، اور میرے پاس بھیج دو، نجاشی نے خالد بن سعید ابن العاص کو مقرر کیا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایجاب و قبول ادا کیا، نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر ادا کیا، جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں نکاح کے بعد حضرت اُم حبیبہؓ جہاز میں بیٹھکر روانہ ہوئیں، اور مدینہ کے بندرگاہ میں اتریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نجاشی کے حالات حضرت اُم حبیبہؓ سے پوچھا کرتے تھے۔[۲]

عزیز مصر مقوقس کو آپ نے جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا

لمحمد بن عبد الله من المقوقس	محمد بن عبد اللہ کے نام مقوقس رئیس قبط
عظیم القبط سلام علیك اما	کی طرف سے سلام علیک کے بعد میں نے آپ کا خط
بعد فقد قرأت کتابك و	پڑھا، اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا
فهمت ما ذکرت فیه وما	مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر
تدعو الیه وقد علمت انّ	آنیوالے ہیں لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام

---

(۱) زاد المعاد، ص ۔ (۲) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۷۱

نبیا بقی وکنت اظن انہ یخرج	میں غور کروں گا میں نے آپ کے قاصد کی
بالشام وقد اکرمت رسولک	عزت کی، اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں جن
وبعثت الیک بجاریتین لھما مکان	کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت
من القبط عظیم وبکسوۃ واھدیت	کی جاتی ہے، اور میں آپ کے لئے کپڑا اور سواری
الیک بغلۃ لترکبھا والسلام علیک	(خچر) بھیجتا ہوں،

مقوقس نے جو تحائف بھیجے تھے حاطب لائے، دو لڑکیاں جو تحفہ میں آئی تھیں، ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں، دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسانؓ کے ملک میں آئیں، خچر کا نام دُلدُل تھا، اس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں ہے، تاریخ طبری میں ہے کہ آپ اسی پر سوار ہوتے تھے، ابن سعد میں لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں، اور حضرت حاطب بن ابی بلتعہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیر بنا کر مقوقس کے پاس بھیجا تھا، ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمت نبوی میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں، اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہئے کہ یہ خاتونیں مسلمان ہو چکی تھیں اور مذہب قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ سے نکاح کیا ہوگا، نہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ کے حرم میں آئیں،

دوسرے سلاطین عرب کو جو خطوط لکھے گئے تھے، ان کے بھی جواب مختلف آئے، ہوذہ بن علی والیِ یمامہ نے لکھا کہ تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں، اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں

لوگوں نے جاریہ کا ترجمہ لونڈی کیا ہے، عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی، ارباب سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی خیال کرتے ہیں لیکن مقوقس کے خط میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ "قبطیوں میں بڑی عزت ہے" یہ لونڈیوں کی نسبت نہیں کہا جا سکتا،

تمہاری اقتدار کے لئے تیار ہون، اسلام ہوسِ ملک کے لئے نہین آیا تھا، آپنے فرمایا زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو مین نہ دون گا"،

حارث غسانی جو حدودِ شام کا رئیس تھا، اور رومیون کے ماتحت اطراف کے عربون مین حکومت کرتا تھا خط پڑھ کر برہم ہوا، اور فوج کو تیاری کا حکم دیا، مسلمان اس جرم کی پاداش مین ہر وقت اس کے حملے کے منتظر رہتے تھے، اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیان پیش آئین)

واقعاتِ متفرقہ سنہ ۶ھ

حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص کا اسلام

(حدیبیہ کی صلح کو خدا نے فتح کہا ہے لیکن اجسام کی نہین قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا، اور وہ اس صلح سے حاصل ہوگیا، اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے، قریش اور مسلمانون مین اب تک جو معرکے ہوئے، فوجی حیثیت سے قریش کی صف مین ہر جگہ خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے، جاہلیت مین رسالہ کی افسری ان ہی کے سپرد تھی، احد مین قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤن انہی کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر قریش کا طلایہ انہی کی زیر افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالار اعظم بھی آخر اسلام کے حملۂ کاری سے نہ بچ سکا،

صلحِ حدیبیہ کے بعد حضرت خالدؓ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رخ کیا، راستہ مین حضرت عمرو بن العاص ملے، پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ بولے اسلام لانے جاتا ہون، آخر کب تک؟ حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا میرا بھی یہی ارادہ ہے، دونون صاحب ایک ساتھ بارگاہِ نبوی

(لہ ابتدائی دو سال تک تمام نہ ہوا مراسلے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی دعوت مین آئے گی) ش"

میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے، اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا،
اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا،

فتح مکہ میں حضرت خالدؓ جب ایک مسلمان دستے کے افسر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گذرے تو آپ نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا خالدؓ ہیں، آپ نے فرمایا خدا کی تلوار ہے،[1]

غزوۂ موتہ میں جب حضرت جعفرؓ، زیدؓ بن حارثہؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ کے بعد حضرت خالدؓ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے،

عہد خلافت میں ایک (خالدؓ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا، اور دوسرا (عمرو بن العاصؓ) مصر کا فاتح ہوا)

---

[1] اصابہ ابن حجر، روایت ابن اسحاق (ج اول ص ۴۱۳) ص ۲۵ ترمذی، مناقب،

سنہ ۷ھ

خیبر

آخر سنہ ۶ھ یا اوائل سنہ ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے[1] یورپین سیاحوں میں ڈاوٹی کی میعہ تک یہاں سنہ ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۱۰۰ میل لکھا ہے[2]، وہ نخلستان جس کے کنارہ پر خیبر ہے، نہایت زرخیز ہے، یہاں یہود نے مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے، جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں،

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤسائے بنو نضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے، تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا، جس کا پہلا ثمرہ احزاب کا معرکہ تھا، ان رؤسا میں سے حیی بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا، یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا، قبیلۂ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا، ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی، اور ہمیشہ سے یہود خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے[3]، سنہ ۵ھ میں سلام نے خود جا کر قبیلۂ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو

---

[1] وفاء الوفاء جلد ۲ ص ۳۸۳ سلہ ڈاوٹی سفر عرب جلد ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۶، سلہ ۵ م ۲ ابن خلدون جلد ۲ ذکر قبائل عرب [...] و تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۴۳ باب غزوہ خیبر س

اسلام کے مقابلے کے لئے آمادہ کیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عظیم الشان فوج لیکر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں[۱]
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپ کے ایماء سے رمضان سنہ ۶ھ میں حضرت عبداللہ
بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا، سلام کے بعد
یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا، اُس نے قبائل یہود کو جمع کر کے تقریر کی، اور
کہا کہ میرے پیشروؤں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں، صحیح
تدبیر یہ ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا[۲]
اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا، اور ایک فوج گراں تیار کی، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کو
بھیجا کہ خود خیبر جا کر اس واقعہ کی تحقیق کریں، چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے، اور چھپ کر خود
اُسیر کی زبانی اس کے مشورے اور تدبیریں سنیں، یہ حالات آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں
عرض کئے، آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر کو روانہ کیا، ان لوگوں نے اُسیر سے

۱؎ ابن سعد ص ۶۷ - اصل الفاظ یہ ہیں:

كان ابو رافع بن ابی الحقیق قد اجلب في غطفان ومن حوله من مشركي العرب وجعل لهم الجعل العظيم لحرب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

ابو رافع نے غطفان اور ان پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا اور ایک بہت بڑی اجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے تجویز کی،

صحیح بخاری باب قتل ابی رافع میں ہے کہ ابو رافع یؤذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویعین علیہ، یعنی ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتا تھا اور آپ کے دشمنوں کو آپ کے مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا، اس امداد و اعانت کی تفصیل بروایت عروہ فتح الباری ج ۷ ص ۲۶۰ میں مفصل مذکور ہے ۲؎ زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۱۹۶ مصر۔

کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ تم اگر چلو تو خیبر کی حکومت تم کو دیدی جائے،
چنانچہ وہ ۳۰۔ آدمی لے کر خیبر سے نکلا، اور احتیاط کی بنا پر یہ مقرر ہوا کہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص
ہم رکاب چلتے تھے جن میں ایک یہودی دوسرا مسلمان ہوتا تھا، قرقرہ پہنچ کر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا
ہوئی، اُس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبد اللہ بن انیس کی تلوار کھینچنی چاہی، انھوں نے کہا، او دشمن خدا!
بدعہدی کرنی چاہتا ہے، یہ کہکر سواری بڑھائی اور جب اُسیر زد پر آگیا تو تلوار ماری کہ اُس کی ران کٹ
گئی وہ گھوڑے سے گر پڑا، گرتے گرتے اُس نے حضرت عبد اللہ کو زخمی کیا، اب مسلمان پیش دستی کر کے
یہود پر ٹوٹ پڑے، نتیجہ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا، یہ خیبر ستہ یا محرم سنہ کا واقعہ ہے؟

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا، ان لوگوں
نے مکہ جا کر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی یک عالمگیر جنبش پیدا کر دی جس نے واقعہ
احزاب میں مرکز اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا، یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی لیکن جو دست
و بازو کام کر رہے تھے، اب بھی موجود تھے،

جن لوگوں نے جنگ احزاب برپا کرائی تھی، ان میں زیادہ تر ابن ابی الحقیق کا خاندان
تھا جو قبیلہ بنی نضیر سے تھا، جب مدینہ سے جلاوطن ہو کر آیا تھا اُس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر
قبضہ کیا تھا، سلام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے، اسی خاندان کا رئیس تھا، اس
کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا،

خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے، ادھر

1 یہ تمام واقعہ طبقات ابن سعد سے منقول ہے [illegible]

کہ منافقین اُن کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور اُن کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر بر نہیں ہو سکتے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے، اس بنا پر آپ نے حضرت عبد اللہ بن رواحہ کو بھیجا تھا، لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور بدگمان قوم تھی اُدھر منافقین اُن کو اُبھارتے تھے، اسی زمانہ میں رأس المنافقین عبد اللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تم اُن سے نڈرنا، اُن کی ہستی کیا ہے مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں، یہود نے یہ سن کر کنانہ اور ہودہ ابن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو، تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے، ایک روایت میں ہے کہ غطفان نے اس کو منظور کیا۔[1]

غطفان کا ایک قوی تر قبیلہ بنو فزارہ تھا اُن کو جب یہ معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آئے، کہ ہم تمہاری شریک ہو کر لڑیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائیگا، تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا۔[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۷) اُسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہوا، وہی اس معرکہ کی وجہ ہو سکتا ہے۔

[1] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۳، عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا، تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناطرفداری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، [2] یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جنفا کے ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے اصل الفاظ یہ ہیں،

ذکری موسی بن عقبۃ عن ابن شہاب قال کانت بنو فزارۃ ممن قدم علی اھل خیبر لیعینوھم فراسلھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا یعینوھم وسألھم ان یخرجوا عنھم الخ (جلد ۳ - ص ۱۵۲ مصر)

ذی قرد محرم سنہ ۷ھ

غطفان کی شرارت جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیوں کا چراگاہ تھا، (اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بسرداری عبد الرحمٰن بن عیینہ) چھاپا مارا، اور ۲۰ اونٹنیاں پکڑ کر لے گئے، حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے، قتل کر دیا، اور ان کی بیوی کو گرفتار کرکے لے گئے، مسلمانوں نے جب تعاقب کیا، تو وہ دفعۃً میں گھس گئے، وہاں عیینہ بن حصن جو قبائل غطفان کا سپہ سالار تھا، ان کی امداد کو موجود تھا، مسلمانوں میں حضرت سلمہ بن الاکوعؓ ایک مشہور قدر انداز صحابی تھے، سب سے پہلے ان کو اس غارتگری کی خبر معلوم ہوئی، انھوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا، اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جالیا، وہ لوگ پانی پلا رہے تھے، سلمہؓ نے تیر برسانے شروع کئے، حملہ آور بھاگ نکلے، انھوں نے تعاقب کیا، اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے، دربار نبوت میں آکر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ کر آیا ہوں، اگر ۱۰۰ آدمی مل جائیں، تو ایک ایک کو گرفتار کر لاتا ہوں آپ نے رحمت عام کے لحاظ سے فرمایا،[1]

ملکت فاسجح، قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو،

اس واقعہ کے تین دن بعد خیبر کی جنگ پیش آئی،

---

[1] یہ واقعہ بخاری ومسلم میں بھی مذکور ہے لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد وابن اسحاق سے لی گئی ہے[2] ارباب سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال قبل بیان کیا ہے لیکن (طبری نے بروایت سلمہ جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز) امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے، کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے، حافظ ابن حجر نے ارباب سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے:-

فعلی هذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوة ذی قرد اصح مما ذکره اهل السیر

تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوہ قرد کے متعلق مذکور ہے وہ ارباب سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیاز خاص رکھتا ہے اور اگرچہ ارباب سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے ؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور اُن کی زبان سے بھی بلاقصد نکل گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلان عام کر دیا کہ

لا یخرجن معنا الا راغب فی الجہاد (ابن سعد) ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ نکلیں جو طالب جہاد ہوں

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں، یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے، اور طرز حکومت کی بنیاد قائم ہوئی، اسلام کا اصلی مقصد تبلیغ دعوت ہے، اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدراہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے، صرف معاہدہ صلح کافی ہے، جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں، لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے، اور اس کو اپنے زیر اثر رکھنا پڑتا ہے، خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی، کہ ایک مدت تک لوگ جہاد[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۹) حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا، عام ارباب سیر جس کا ذکر کرتے ہیں، وہ پہلا حملہ تھا، اور یہ بالکل قرین قیاس ہے (فتح الباری صفحہ ۳۵۷ باب غزوۂ ذی قرد) نیز "عام ارباب سیر کو غزوۂ خیبر (بلکہ تمام غزوات) کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں، اس لئے اُن کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں، لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں (۱) یہاں لوگ سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مال غنیمت کے

کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے، اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی، یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد جہاد اور اعلاے کلمۃ اللہ ہو،

غرض آپ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم سنہ ۷ھ میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے، ازواج مطہرات میں سے حضرت ام سلمہؓ ساتھ تھیں، فوج کی ۱۶۰۰ تھی جن میں دو سو سوار اور باقی پیدل تھے اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلا غز تھا کہ آپ نے تین علم تیار کرائے، دو حضرت حباب بن منذر اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عنایت ہوئے اور خاص علم نبوی جس کا پھریرا حضرت عائشہؓ کی چادر سے تیار ہوا تھا جناب امیرؓ کو مرحمت ہوا، فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامرؓ بن الاکوع جو مشہور شاعر تھے، یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے:

اَللّٰھُمَّ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا	اے خدا اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا	نہ خیرات کرتے، نہ روزہ رکھتے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۰) نہ ملنے کا گمان ہوتا، وہاں غزوات کی شرکت سے گریز کرتے تھے، چنانچہ انہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے تھے اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اعلان فرما دیا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ ہو دنیاوی مال و متاع نہ ہو (زرقانی و ابن سعد) غزوۂ خیبر اس بنا پر ابن سعد جزء مغازی ص ۷۷ میں جمادی الاولیٰ ۷ھ ہے جو تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں (س)"

فاغفر فداءً لك ما اتقينا	ہم تجھ پر فدا ہوں ہم جو احکام نہیں بجا لائے
والقين سكينة علينا	اُن کو معاف کردے، اور ہم پر تسلی نازل کر
انا اذا صيح بنا اتينا	ہم جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
وثبت الاقدام ان لاقينا	جاتے ہیں، اور جب مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت
وبالصياح عولوا علينا	قدم رکھ، لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ چاہا ہے

یہ اشعار[۱] (صحیح مسلم و بخاری) میں نقل کئے ہیں، مسند ابن حنبل میں بعض اشعار زیادہ ہیں (پہلے دو مصرع کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (خیبر) میں بھی ہیں)

ان الذين قد بغوا علينا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے
اذا ارادوا فتنة ابينا	جب وہ کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان سے
ونحن عن فضلك ما استغنينا	دبتے نہیں، اور اے خدا ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہؓ نے تکبیر کے نعرے بلند کیے، چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا، اور بات بات میں نکاتِ شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی، ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیونکہ کسی بہرے اور دور از نظر کو نہیں پکارتے ہو، تم جس کو پکارتے ہو، وہ تمھارے پاس ہی ہے[۲]

اس غزوہ میں چند خاتونیں بھی اپنی خواہش سے فوج کیساتھ ہولی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

۱؎ ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملہ کی ابتداء دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایات کا اختلاف ہے ۲؎ صحیح بخاری غزوہ خیبر۔

کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کو بلا بھیجا، اور غضب کے لہجہ میں فرمایا تم کس کے ساتھ آئیں، اور کس کے حکم سے آئیں؟ بولیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں، اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کیا، تو ان کا بھی حصہ لگایا، لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہ تھے، مال و اسباب نہ تھا، درہم و دینار نہ تھے، بلکہ صرف کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا، اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا،

یہ واقعہ ابوداؤد (باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ) میں مذکور ہے، حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں، جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی، اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، جنگ احد میں حضرت عائشہؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا، اور زخمیوں کو پلانا، اوپر گذر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدان جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتی، اور مجاہدین کو دیتی تھیں، صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے، لیکن سند صحیح متصل سے ذکر کیا ہے، اس لئے شک کی گنجائش نہیں، یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے،

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہل خیبر کی مدد کو آئیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے، اسباب باربرداری خیمہ و خرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں[1]، اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں، غطفان یہ سن کر کہ اسلامی

---

[1] تفصیل معجم البلدان، یاقوت حموی ذکر رجیع میں ہے،

دیکھیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں ہتھیار سج کر نکلے لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود اُن کا گھر خطرہ میں ہے، تو واپس چلے گئے [۱]۔

خیبر میں چھ قلعے تھے، ساسلم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق، مربطہ، اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے، اُن میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، اسی قلعہ کا رئیس [۲] تھا، ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہوکر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی، یہیں رہتا تھا،

لشکرِ اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقامِ صہبا میں پہنچا تو نمازِ عصر کا وقت آ چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ٹھہر کر نمازِ عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا، وہی آپ نے بھی پانی میں گھولکر نوش فرمایا [۳]، رات ہوتے ہوتے، فوجِ اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی،

انا نسئلک خیر ھذہ القریۃ	اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور
وخیر اھلھا وخیر ما فیھا و	گاؤں والوں کی، اور گاؤں کی چیزوں
نعوذ بک من شرھا وشر اھلھا	کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے

[۱] طبری ج ۳ ص ۱۵۷۵، اصل عبارت یہ ہے فبلغنی ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خیبر جمعوا لہ ثم خرجوا لیظاھروا یھود علیہ حتی اذا ساروا [۲] تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۵۶، [۳] صحیح بخاری

وشر ما فیھا (ابن ہشام)　　　پناہ مانگتے ہیں،

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپ کا معمول عام تھا یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے، تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے، چونکہ سنت نبوی یہ تھی کہ رات کو کسی مقام پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا،[1] اس لئے یہ رات یہیں بسر کی، صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا، یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعۂ ناعم میں یکجا کیا، اور فوجیں قلعۂ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں، سلام بن مشکم نضیری بیمار تھا تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا، اور خود قلعہ نطاۃ میں آکر فوج کی شرکت کی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود جنگ نہ تھا لیکن جب یہود نے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا، اور جہاد کی ترغیب دی، تاریخ خمیس میں اس موقع پر لکھا ہے

ولما تیقن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	(اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین ہو گیا
ان الیہود تحارب وعظ اصحابہ	کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ نے صحابہ کو
ونصحہم وحرضہم علی الجہاد	نصیحت کی، اور جہاد کی ترغیب دی)

سب سے پہلے قلعۂ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمود بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا، دیر تک لڑتے رہے، لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ ان کے سر پر گرایا، جس کے صدمہ سے

[1] صحیح بخاری میں اصل عبارت یہ ہے:- اذا اتی قوما لیلا لم یغز بہم حتی یصبح (باب غزوۂ خیبر)

وفات پائی لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہوگیا۔[1]

ناعم کے بعد اور قلعے بآسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص جو مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے

طبری مین روایت ہے، کہ جب عمرؓ قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے یاران ہزیمت کھا کر بھگے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوکر شکایت کی، کہ فوج نے ساتھ نہ دیا، لیکن فوج نے اُن کی نسبت خود بھی شکایت کی،

اس روایت کو طبری نے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے، اس مین ایک راوی عوف ہین، اُن کو بہت سے لوگون نے ثقہ کہا ہے، لیکن بندار جب اُن کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے، کہ وہ رافضی اور شیطان تھا، یہ لفظ بہت سخت ہے، لیکن اُن کی شیعیت سب کو تسلیم ہے، اور گو شیعہ ہونا ناراستبازی کی دلیل نہین، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت مین حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے شیعہ کی زبان سے اس روایت کا مرتبہ کیا رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے راوی عبداللہ بن بریدہ ہین، جو اپنے والد سے روایت کرتے ہین، لیکن محدثین کو اس بات مین شبہ ہے کہ اُن کی جو روایتین باپ کے سلسلہ سے منقول ہین صحیح بھی ہین یا نہین،

تاہم اس قدر ضرور ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بزرگ بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت مین تھا، جب مہم مین زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت

---

[1] [illegible]

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا، اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے، اور خدا اور خدا کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔ یہ رات بہت امید اور انتظار کی رات تھی، صحابہ نے تمام رات اس بیقراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاج فخر کس کے ہاتھ آتا ہے، حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت و سروری کی تمنا نہیں کی، لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علیؓ میں مذکور ہے، ان کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔

صبح کو دفعتہً یہ آواز کانوں میں آئی کہ علیؓ کہاں ہیں؟ یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا، اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں، غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا، اور دعا فرمائی، جب ان کو علم عنایت ہوا تو انھوں نے عرض کی کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں، ارشاد ہوا کہ نرمی سے ان پر اسلام کو پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔[1]

لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، مرحب قلعہ سے رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا،

قد علمت خیبر انی مرحب	خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں
شاکی السلاح بطل مجرب	دلیر ہوں، تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں،

[1] یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں ۔۔۔ تو یہ تفصیل مذکورہ صحیح بخاری میں منقول ہے۔

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا، قدیم زمانہ میں لوگ پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے، یہی خود کہلاتا تھا،

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا،

انا الذی سمتنی امی حیدرہ — میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا

کلیث غابات کریہ المنظرہ — میں شیر نیستاں کی طرح مہیب منظر ہوں

مرحب بڑے طمطراق سے آیا، لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، اور ضرب کی آواز فوج تک پہنچی، پہلوانوں کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا، اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں، معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا، لیکن ذوالفقار خود اور سپر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، آپ نے قلعہ کا دروازہ جو سراپا پارۂ سنگ تھا، اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے ہل نہ سکا، یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں، لیکن [illegible]، علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کہ

کلھا واھیۃ، — سب کمزور روایتیں ہیں

۱؎ طبری ص ۱۵۷۹، یہ اشعار مع مختصر حالات صحیح مسلم غزوۂ خیبر میں بھی ہیں)

علامۂ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ "یہ روایت منکر ہے" ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں جن کو امام بخاری اور ابو داؤد اور دارقطنی قابل احتجاج نہیں[1] سمجھتے۔

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۲ ص ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہیں

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا، ان معرکوں میں ۹۳ یہود مارے گئے جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر زیادہ مشہور ہیں، صحابہ میں ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بتفصیل لکھے ہیں:۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے، یہ درخواست منظور ہوئی بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن رواحہ کو بھیجتے تھے، وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو لے لو، یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں[2]۔ خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر

---

[1] میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان [2] فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۷) فتح خیبر و طبری ص

جو اس جنگ میں شریک تھے تقسیم کر دی گئی، اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس بھی تھا،

عام روایت ہے کہ مالِ غنیمت میں سے خمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص طور پر کر لیا جاتا تھا جس کو "صفی" کہتے ہیں، اس بنا پر حضرت صفیہؓ (زوجہ کنانہ ابن الربیع) کو آپ نے لے لیا، اور آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا،

حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق | حضرت صفیہؓ کی نسبت بعض کتب حدیث و سیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اُن کو دحیہ کلبیؓ کو دیا تھا، پھر کسی نے ان کے حُسن کی تعریف کی تو اُن سے مانگ لیا، اور اس کے معاوضہ میں اُن کو سات لونڈیاں دیں، مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے، اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے، تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا یہ واقعہ حضرت انسؓ سے منقول ہے لیکن خود حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں، اور وہ باہم مختلف ہیں، بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعہ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپ کے سامنے حضرت صفیہؓ کے حسن کا ذکر کیا، آپ نے اُن کو اپنے لئے لے لیا، اصلی الفاظ یہ ہیں،

فلما فتح الله عليهما الحصن | (جب خدا نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۸۹) اس روایت ابو داؤد باب المساقات میں موجود ہے۔

ذکر لہ جمال صفیۃ بنت حیی	آپ سے صفیہ بنت حُیَی کے حُسن وجمال
بن اخطب وقد قتل زوجھا	کی تعریف کی، اس کا شوہر اس جنگ
وکانت عروسًا فاصطفاھا	میں مارا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
النبی صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہٖ	کو اپنے لئے پسند کر لیا)

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب مایذکر فی الفخذ) میں و مسلم باب فضل عتق الامۃ میں خود حضرت انسؓ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے، تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اُن میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپؐ نے اُن کو اختیار دیا کہ خود جاکر کوئی لونڈی لے لو، انہوں نے حضرت صفیہؓ کو انتخاب کیا لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا، ایک شخص نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا :

یا نبی اللہ اعطیت دحیۃ صفیۃ	اے پیغمبر خدا! آپ نے صفیہ کو دحیہ کے
بنت حُیی سیدۃ قریظۃ والنضیر	حوالہ کیا، وہ قریظہ و نضیر کی رئیسہ ہے
لا تصلح الا لک	آپ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں،

اس کے بعد آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کرکے اُن سے نکاح کر لیا،[1] ابوداؤد میں یہ دونوں روایتیں ہیں، اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۱، ص ۲۶۰ باب فضل عتق الامۃ ثم تزوجہا۔ (۲) ابوداؤد باب ماجاء فی سہم الصفی)

اس لئے حضرت دحیہؓ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ

لما فیه من انتهاك مرتبتها | چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی
وكونها بنت سید هم | صاحبزادی تھیں، اس لئے ان کا کسی
| کے پاس رہنا ان کی توہین تھی،

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے:

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہ سکتی تھیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کئے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاس خاطر، عفت و مراتب اور رفع غم کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے عقد میں لے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا (جامع مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپ کے نکاح میں آنا قبول کریں، انہوں نے دوسری صورت پسند کی یعنی یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ جائیں)، حسن خلق، رحم اور مصلحت کے پہلو نکلنے کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ نکاح نہایت موزوں تھا، یہ بھی تھی کہ اس قسم کے عزیزانہ تعلقات سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں سے بھی درجے کے مطابق اس قسم کا محسنانہ اور مجمعدانہ سلوک کرتا ہے۔

---

۱ مسند ابن حنبل ج ۳ ص [illegible] مطبوعہ مصر

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گذر چکا ہے،

فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز خیبر میں قیام کیا، اگرچہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا، اور اُن کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم اُن کا طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا، پہلا دیباچہ یہ تھا، کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صحابہ کے ساتھ دعوت کی، آپ نے فرطِ کرم سے قبول فرمایا، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا، لیکن حضرت بشرؓ بن براء نے پیٹ بھر کر کھایا، اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بلا کر پوچھا، اُس نے جرم کا اقبال کیا، یہود نے کہا، ہم نے اس لئے زہر دیا کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا، اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ کے ہاتھ سے نجات مل جائیگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے، اس بنا پر آپ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا، لیکن جب دو تین دن کے بعد حضرت بشرؓ زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی،

ایک دفعہ صحابہ میں سے حضرت عبد اللہ بن سہیل، و حضرت محیصہؓ قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے یہود نے حضرت عبد اللہؓ کو دھوکہ سے قتل کرکے ایک نہر میں ڈال دیا، حضرت محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟ عرض کیا کہ حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کرکے بھی جھوٹی قسم کھا سکتے ہیں

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں کیا، اور بیت المال سے مقتولوں کا خون بہا دلا دیا،

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں یہود نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ اُن کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا، اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے، مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے اُن کو شام کے اضلاع میں جلا وطن کر دیا،[۱] (یہ جملۂ معترضہ سلسلۂ کلام میں آ گیا تھا)

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ اوّل آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز چھپائیں گے نہیں لیکن جب کنانہ بن الربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کرنے سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے یہاں تک کہ اُس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی[۲] بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کرا دیا، اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لیے گئے،[۳]

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا لیکن اُس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتانے سے انکار کرتا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۰، اور صحیح بخاری مطبوعہ مصطفائی جلد اول ص ۳۷۷ (باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک) [۲] یہ پوری تفصیل تاریخ طبری میں مذکور ہے، ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے۔ [۳] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۴

طبری مین تصریح ہی:-

ثم دفعہ رسول اللہ الی محمد	پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ کو محمد
بن مسلمۃ فضرب عنقہ باخیہ	ابن مسلمہ کے حوالہ کیا، انھون نے اپنے بھائی
محمود بن مسلمہ (صفحہ ۱۵۸۲)	محمود بن مسلمہ کے قصاص مین، اسکو قتل کردیا،

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونون نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہین بتایا محدثین نے رجال کی کتابون مین تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیون سے مغازی نبوی کے واقعات روایت کرتے تھے، اس روایت کو بھی انہی روایتون مین سمجھنا چاہیے، اور یہی وجہ ہو کہ ابن اسحاق ان راویون کا نام نہین لیتے،

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے، رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہی،

وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہین کرتا، کیا چند سکون کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دیسکتا ہی؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کریگا (بلکہ ایک روایت مین ہی کہ) اُس نے یہ بھی منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اُس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا،[۱]

---

[۱] ابوداؤد باب حکم ارض خیبر، طبقات ابن سعد غزوہ خیبر ص ۱۰۱ سطر ۲۲،

کنانہ نے بدعہدی کی اور جوامن اس کو دیا گیا تھا، ٹوٹ گیا، کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، اب اُس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت نقل کیا ہے،

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے،

(۱) قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا، محمود ابن مسلمہ کو اُسی نے قتل کیا تھا، اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا، اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے، اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے یعنی دونوں قتل کئے گئے،

فضرب اعناقھما وسبی	تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو قتل کرا دیا
اھلیھما[1]،	اُن کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا

(۲) یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار ہو کر لونڈی غلام بنائے گئے،

فلما وجد المال الذی	تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انہوں نے اونٹ
غیبوہ فی مسلك الجمل سبی	کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو اُن کی عورتیں
نساءھم[2]،	گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصول تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اُترتے جاتے

[1] طبقات ابن سعد غزوہ خیبر ص ۱۸ سطر ۲۰، [2] طبقات ابن سعد غزوہ خیبر ص ۲۰،

ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے، یہود کا قتل، و زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف، خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا، وہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت تک موجود تھا،

صحیح بخاری میں ہے،

فلما اجمع عمر علی ذلک اتاہ	پھر جب حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ کر لیا تو
احد بنی ابی الحقیق فقال	ابو الحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا
یا امیر المؤمنین اتخرجنا	اور کہا کہ امیر المؤمنین آپ ہم کو نکالتے
وقد اقرنا محمد و عاملنا	ہیں حالانکہ ہم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنے
علی الاموال؟[1]	دیا تھا، اور خرچ پر معاملہ کیا تھا،

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا،

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچا دیا ہے

ولم یقتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے
بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق	بعد ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا
(ذکر غزوۂ خیبر)	اور کسی کو قتل نہیں کیا

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارت مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی،

[1] صحیح بخاری جلد اول مطبع مصطفائی ص ۳۰۷، باب اذا شرط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک

ابوداؤد مین جہان ارض خیبر کا عنوان باندھا ہے صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے

یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابوداؤد مین لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیون مین صرف ہو گیا، باوجود اسکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا، یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص مین ہوا تھا، ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے،

مورخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفاے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم مین اور لوگ بھی شریک تھے، اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہو گئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا،

ایک دقیقہ نکتہ

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم مین پیش آیا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی آخر تاریخین تھین، محرم مین لڑائی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے محدثین اور فقہا مین اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، بہت سے فقہا کا یہ مذہب ہے کہ اول مین البتہ ان مہینون مین لڑائی شرعاً ممنوع تھی، لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا، علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کے رو سے تھا،

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ	کہدو کہ اس مہینہ مین لڑنا بڑا گناہ ہے
سَبِيلِ اللّٰهِ (بقرہ - ۲۷)	اور خدا کی راہ سے روکنا ہے،

پھر سورہ مائدہ مین یہ آیت اُتری :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ	مسلمانو خدا کی حدبندیون کی اور ماہ حرام

اللہِ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ (مائدہ) — کی بے حرمتی نہ کرو،

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی، اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا، اب وہ کونسی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہوگیا،

وَلَیْسَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ وَلَا سُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ نَاسِخٌ حُکْمَھَا، — اور خدا کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں،

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعتہ رضوان، یہ سب ماہ حرام میں ہوئے تھے، اس لئے اگر ماہ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیونکر جائز رکھتے، حافظ ابن القیم نے جواب دیا ہے کہ ماہ حرام میں ابتداءً جنگ کرنا حرام ہے لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے، وہ سب واقعات دفاعی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش دستی نہیں کی تھی، بلکہ دفاع کیا گیا تھا، بیعت رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا، طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی بلکہ غزوہ حنین کا بقیہ تھا جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے فتح حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا جس کی ابتداء قریش نے کی تھی،[1]

حافظ ابن قیم نے نہایت صحیح جواب دیا، لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے، اور بحث نامنفصل رہ گئی، حافظ ابن القیم کے استاد علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا، انھوں نے الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں

۱؎ زاد المعاد ذکر غزوہ خیبر

صرف بدر و خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن اگر علامہ موصوف زیادہ استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں، بدر کا بیان اوپر گذر چکا ہے، خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیم زمین

خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی، اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لیے خاص کر دیا گیا، باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی، دو سو سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا، اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو کے برابر تھی، اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے، اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا، جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا[1]۔

ولرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل سهم احدهم[2]	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عام لوگوں کے برابر ایک حصہ تھا،

[illegible]

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور [illegible] کا نیا دور شروع ہوا، اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے، مشرکین اور یہود، [illegible] عرب میں موجود تھے لیکن [illegible] اثر نہیں رکھتے تھے، مشرکین اور یہود اگرچہ مذہباً مختلف تھے، لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر ان میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا، مدینہ کے یہود [illegible] تھے، اسی طرح خیبر کے [illegible] ان کے حلیف تھے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] مکہ اور مدینہ کے مشرکین

---

[1] [illegible] ذکر غزوۂ خیبر [illegible]
[2] ایضاً

اور منافقین سب مل کر بھی بے وقت حادثہ ہو گئے، خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی، اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا،

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا، اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادات کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا، شریعت کے ارکان جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے، حالات کے اقتضا سے بتدریج آئے ہیں، چنانچہ ان کی تفصیل آگے آئے گی، خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی، ادھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا، اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے،

ارباب سیر نے غزوہ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے، کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل[1] ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تبلیغ کی، اُن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) پنجہ دار پرند حرام ہو گئے،

(۲) درندہ جانور حرام کر دیئے گئے،

(۳) گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا،

(۴) اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا اب استبراء کی قید ہو گئی یعنی، اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک، ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں،

(۵) چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا،

[1] یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے

(۹) بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا،

وادی القری، اور فدک تیما اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں، قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے، یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثار اب بھی باقی ہیں، اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آکر آباد ہوئے، اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی، اور اب یہ یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا[1]

خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی القری کا رُخ کیا لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انھوں نے فوراً تیراندازی شروع کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محل آپ کے غلام (حضرت مدعمؓ) اُتار رہے تھے، کہ ایک تیر آیا، اور وہ جاں بحق ہوئے، عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے،

وقد استقبلتنا یهود بالرمی ولم نکن علی تعبیة[2]

یہود ہمارے مقابلہ کو تیر چلاتے ہوئے نکلے، اور ہم تیار نہ تھے،

بہرحال جنگ شروع ہوگئی لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی، اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہوگئی،

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آکر عمرہ ادا کریں گے، اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] معجم البلدان لفظ قریٰ (جلد ۷ ص ۲۰) [2] زرقانی بر موطا بحوالہ بیہقی باب بجاد ذکر غلول (ص ۳۱۳) ص

نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ واقعی حدیبیہ میں شریک تھے اُن میں سے کوئی رہ نہ جائے، چنانچہ بجز اُن لوگوں کے جو اس اثنا میں مرچکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی، معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں، اس لئے اسلحہ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے، چھوڑ دیئے گئے، اور دو سو سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے حضرت عبداللہ بن رواحہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے[1]

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ	کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ،
الیوم نضربکم علی تنزیلہ	آج جو تم نے اُترنے نہ دیا تو ہم تلوار کا فیصلہ کریں گے
ضربا یزیل الھام عن مقیلہ	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذھل الخلیل عن خلیلہ	اور دوست کے دل سے دوست کو بھلا دے

صحابہ کا جم غفیر ساتھ تھا، اور برسوں کی دیرینہ تمنا، اور فرض مذہبی بڑے جوش کیساتھ ادا کر رہا تھا، اہل مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں، عربی زبان میں اس کو "رمل" کہتے ہیں چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے،

اہل مکہ نے اگرچہ چار و ناچار عمرہ کی اجازت دیدی تھی، تاہم اُن کی آنکھیں اس منظر کے

[1] یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے،

دیکھنے کی تاب نہ لا سکتی تھیں، اس بنا پر قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے
تین دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے، اور کہا محمد سے کہدو کہ شرط پوری ہو چکی اب مکہ سے
نکل جائیں، حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی آپ اسی وقت روانہ ہو گئے،
چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر سن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
چچا چچا کہتی دوڑی آئیں، حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا، لیکن حضرت جعفر (حضرت علیؓ کے
بھائی) اور زید بن حارثہؓ نے اپنے دعوے پیش کئے، حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی
ہے، زیدؓ کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے، اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے، حضرت علیؓ کو
دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب
کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماءؓ کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ خالہ
ماں کے برابر ہوتی ہے"[2]

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت نسب اُن کے بھائی تھے، لیکن، انھوں نے چچا کہا، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اور حضرت حمزہؓ دونوں رضاعی بھائی تھے، [2] اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے بعض زائد تفصیلیں
زرقانی سے لی گئی ہیں جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں،

سنہ ۸ھ

غزوہ موتہ

جمادی الاولیٰ سنہ ۸ھ

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاء سے اس طرف ہے، عرب میں جو مشرفی تلواریں مشہور ہیں وہ یہیں بنتی تھیں[1]، کثیر مشہور شاعر کہتا ہے،

صوارد یجلوھا بموتۃ صیقل (وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ بصریٰ یا قیصر روم کے نام ایک خط لکھا تھا، عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے، اُن میں ایک شرحبیل بن عمرو غسانی تھا جو اسی علاقہ بلقاء کا رئیس، اور قیصر کا ماتحت تھا، یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا، اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا، یہ خط حارث بن عمیر لے کر گئے تھے، شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا، اس کے قصاص کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی، زید بن حارثہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، سپہ سالاری ملی، اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیار، اور وہ بھی شہید ہو جائیں، تو عبداللہ بن رواحہ فوج کے

---

[1] معجم البلدان لفظ موتہ ج ۸ ص ۱۹۰

سردار ہوں، حضرت زیدؓ غلام تھے، گو آزاد ہو چکے تھے، حضرت جعفرؓ طیار، حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ معزز انصاری، اور مشہور شاعر تھے، اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے ہوتے ہوئے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بنا پر ہے، چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے۱؎ لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا، اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا، حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اُسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا، اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے اُن کی باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا، حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے" چنانچہ صحیح بخاری بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ (باب المغازی) میں بہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے،

گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا اُس لئے حکم ہوا کہ پہلے اُن کو دعوتِ اسلام دی جائے،۲؎ اگر وہ اسلام قبول کریں تو جنگ کی ضرورت نہیں، یہ بھی حکم ہوا کہ اظہارِ ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارث بن عمیرؓ نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فوج کی مشایعت کے لئے تشریف لے گئے صحابہ نے پکار کر دعا کی کہ خدا سلامت اور کامیاب لائے،

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرجیل کو خبر دی، جس نے مقابلہ کے لئے کم و بیش

۱؎ صحیح بخاری غزوۂ موتہ ۲؎ فتح الباری جلد ۷ ص ۳۰۰ ۳؎ طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۹۲ ق ۲

ایک لاکھ فوج تیار کی، ادھر خود قیصر روم (ہرقل) قبائل عرب کی بیشمار فوج لیکر مآب میں خیمہ زن ہوا جو بلقا کے اضلاع میں ہے حضرت زیدؓ نے یہ حالات سُن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربار رسالت کو اطلاع دیجائے اور حکم کا انتظار کیا جائے لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت ہے جو ہر وقت حاصل ہوسکتی ہے غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا، اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا، حضرت زیدؓ برچھیاں کھاکر شہید ہوئے، اُن کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہوکر گر پڑے، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں نے اُن کی لاش دیکھی تھی، تلواروں، اور برچھیوں کے نوے زخم تھے، لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے، پشت پر ایک داغ نہیں، تھا[1] حضرت جعفرؓ کے بعد عبداللہ بن رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا، اور وہ بھی داد شجاعت دیکر شہید ہوئے اب حضرت خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے، صحیح بخاری میں ہے کہ ۹ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں[2] لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا کیا مقابلہ تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچالائے جب یہ شکست[3] خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی، اور اہل شہر ان کی مشایعت کو نکلے تو لوگ غمخواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ وفرارو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے![4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا، حضرت جعفرؓ سے آپ کو خاص

(۱) ابن ہشام غزوۂ موتہ ص (۲) صحیح بخاری (۳) صحیح بخاری غزوۂ موتہ باب (۴) مصنف نے ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کرکے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور اس کی واپسی پر اہل مدینہ کا طعنہ زنی کرنے کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ صحیح بخاری غزوۂ موتہ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دے، وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ

محبت تھی، اُن کی شہادت کا نہایت قلق تھا، آپ مسجد مین جا کر غمزدہ بیٹھے، اسی حالت مین ایک شخص نے آکر کہا کہ جعفرؓ کی مستورات رو رہی ہین اور ماتم کر رہی ہین آپ نے منع کرا بھیجا، وہ گئے، اور واپس آکر کہا کہ مین نے منع کیا لیکن وہ باز نہین آتین، آپ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے، اور واپس آکر عرض کی کہ ہم لوگون کی نہین چلتی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ "تو اُن کے منہ مین خاک بھر دو" یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری مین منقول ہی صحیح بخاری مین یہ بھی ہی کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ خدا کی قسم تم یہ نہ کرو گے (منہ مین خاک ڈالنا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے نجات نہ ملیگی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۵۰۷) نے مسلمانون کے علم کو اپنے ہاتھ مین لیا، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا، (فتح اللہ علیہم) ارباب سیر اور اہل روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح مین مختلف ہین، ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانون کو پوری فتح حاصل ہوئی، دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانون کا غلبہ، اور فتح یہ ہو کہ مسلمان اس قلتِ تعداد اور کفار کی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت مین ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے، تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانون کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ مین حاصل ہوئی، اور اس سے مال غنیمت بھی حاصل کیا، چوتھا بیان یہ ہو کہ مسلمانون کا غلبہ یہ ہو کہ حضرت خالدؓ کی قیادت مین اتنے بڑے لشکر کے حملون کو روک دیا، اور بسلامت پیچھے ہٹ آئے، اس مقام پر فتح الباری روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنا چاہئے اسی طرح مسلمانون کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانون نے اُن کو فراری کہا، درحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو تسلی دی کہ تم فراری نہین، بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اُس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہین، بلکہ اُن کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا، جو جلدی کرکے پہلے مدینہ چلا آیا تھا، تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری و روض الانف سہیلی و البدایہ ابن کثیر باب غزدۂ موتہ)" س"

فتح مکہ

رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا

جانشین ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض توحید خالص کا احیاء اور حرم کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا، لیکن قریش نے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا، صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن وامان قائم ہو گیا، اور دلدادگان حرم ایک دفعہ یادگار ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے، لیکن معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا، حلم وعفو وتحمل کی حد ہو چکی، اب وقت آگیا کہ آفتاب حق حجابہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے،

صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائل عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے اور اُن کے حریف بنو بکر نے قریش سے محالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں، اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا،

صلح حدیبیہ نے لوگون کو مطمئن کیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا، دفعۃً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے، اور رؤسائے قریش نے علانیہ اُن کو مدد دی، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتون کو صورتین [1] بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلوارین چلائین، خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم مین پناہ لی، بنو بکر رُک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے، لیکن اُن کے رئیس اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہین آسکتا، غرض عین حدود حرم مین خزاعہ کا خون بہایا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد مین تشریف فرما تھے کہ دفعۃً یہ صدا بلند ہوئی،

لاھم انی ناشد محمدا	اے خدا! مین محمد کو وہ معاہدہ یاد دلاؤنگا
حلف ابینا وابیہ الاتلدا	جو ہمارے اور اُن کے قدیم خاندان مین ہوا ہے
فانصر رسول اللہ نصرا عتدا	اے پیغمبر خدا! ہماری اعانت کر، اور خدا کے
وادع عباد اللہ یاتوا مددا	بندون کو بلا، سب اعانت کے لئے حاضر ہو جائینگے

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار جن کا سردار عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سُنے تو آپ کو سخت رنج ہوا، تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطین پیش کین کہ اُن مین سے کوئی منظور کی جائے،

۱- مقتولون کا خونبہا دیا جائے،

۲- قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائین،

---

[1] طبری ص ۱۶۲۰ (ج ۳) (ابن سعد جزء مغازی ص ۹۷ مین کچھ اور نام بھی ہین) ص ۲ طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۹۷

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے،[۱] لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی، انھوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرالائیں، ابوسفیان نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پہ ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہ زہراؓ کے پاس آیا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے، ابوسفیان نے اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا، تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا" جناب سیدہ نے فرمایا "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل"، بالآخر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایما سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کر دی[۲]۔

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا کہ یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے،

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے، انھوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا،

---

[۱] زرقانی (ج ۲ ص ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے، تعجب ہے کہ دوسرے مؤرخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے [۲] زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۲۰۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثد غنویؓ کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں، خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطبؓ کے افشاے راز پر حیرت ہوئی حضرت عمرؓ بیتاب ہوگئے، اور عرض کی کہ حکم ہو تو اُن کی گردن اڑا دوں؟ لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی، ارشاد ہوا، عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہل بدر کو مخاطب کرکے کہدیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے،

حضرت حاطبؓ کے عزیز واقارب اب تک مکہ میں تھے، اور اُن کا کوئی حامی نہ تھا، اسلئے انھوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں اُن کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا،

غرض ۱۰ رمضان سنہ ۸ھ کو کوکبہ نبوی نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائل عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے، مرالظہران پہنچکر لشکر نے پڑاؤ ڈالا، اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی، جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا، فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق

(۱؎ زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۲۹)" س"

کے لیے انھوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)، ابوسفیان، اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا، خیمۂ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا، اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا، حضرت عمرؓ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کرسکے، تیز قدمی سے آگے بڑھے، دربارِ رسالت میں آکر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آگیا، لیکن حضرت عباسؓ نے جان بخشی کی درخواست کی، حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا، حضرت عباسؓ نے کہا عمرؓ! اگر یہ شخص تمھارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے، حضرت عمرؓ نے کہا آپ یہ فرمائیں، آپ جس دن اسلام لائے تھے، مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے، اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعویدار تھی، اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائلِ عرب کا اشتعال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہوسکتی تھی، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفوِ نبوی) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ "خوف کا مقام نہیں"۔

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا، لیکن طبری وغیرہ میں اس جواب کی تفصیل میں حسبِ ذیل مکالمہ لکھا ہے۔

۱؎ اصل واقعہ صحیح بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے، لیکن مزید تفصیل و جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں، ہم نے ان کو بھی لے لیا ہے، بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں (دیکھو طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲) ش

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) — کیون ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہین، آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہین؟

ابوسفیان — کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا،

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) — کیا اس مین کچھ شک ہی کہ مین خدا کا پیغمبر ہون،

ابوسفیان — اس مین تو ذرا شبہ ہی،

بہرحال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا، اوراس وقت گو اُن کا ایمان متزلزل تھا، لیکن مورخین لکھتے ہین کہ بالآخرہ سچے مسلمان بن گئے، چنانچہ غزوۂ طائف مین اُن کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک مین وہ بھی جاتی رہی،

لشکرِ اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھون سے دیکھین، کچھ دیر کے بعد دریاے اسلام مین تلاطم شروع ہوا، قبائل عرب کی موجین جوش مارتی ہوئی بڑھین، سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ (سعد بن) ہذیم سُلیم ہتیارون مین ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے، ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھین خیرہ ہو گئین، ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباسؓ نے نام بتایا، دفعۃً سردار فوج حضرت سعد بن عبادہؓ ہاتھ مین علم لیے ہوئے برابر سے گذرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اُٹھے،

الیوم یوم الملحمۃ الیوم — آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال

تستحل الکعبۃ[1] کر دیا جائے گا،

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطحِ خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا، حضرت زبیر بن عوام علمبردار تھے، ابوسفیان کی نظر جمالِ مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے؟ ارشاد ہوا کہ عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے، یہ کہکر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لیکر ان کے بیٹے کو دیدیا جائے،

مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علمِ نبوی مقامِ حجون پر نصب کیا جائے، حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ فوجون کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں[2]،

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابوسفیان کے ہان پناہ لیگا، یا دروازہ بند کر لیگا (یا خانہ کعبہ مین داخل ہو جائے گا) اس کو امن دیا جائے گا تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا، اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب (یعنی کرزؓ بن جابر فہری، حضرت خنیس بن خالد اور حضرت سلمہؓ بن المیلاء[3] نے شہادت پائی، حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا، یہ لوگ ۱۲ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوارون کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے بازپرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"

---

[1] یہ خاص صحیح بخاری کی روایت ہے۔ [2] مصنف نے یہاں حضرت عروہؓ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے، صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالدؓ مکہ کے زیرین حصہ سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، (فتح الباری جلد ۸ ص ۸)

[3] ان کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے،

لوگون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہان فرمائین گے؟ کیا اپنے قدیم مکان مین؟ شریعت مین مسلمان کافر کا وارث نہین ہو سکتا، ابو طالب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو اُن کے صاحبزادے عقیل اُس وقت کافر تھے اس لئے وہی وارث ہوئے، انھون نے یہ مکانات ابو سفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہان چھوڑا کہ اس مین اُترون اس لئے مقام خیف مین ٹھہرون گا، جہان قریش نے ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا)

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیل بُت شکن کی یادگار تھا، اُس کے آغوش مین ۳۶۰ بُت جاگزین تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، جَآءَ الْحَقُّ وَمَا	حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل
يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا	مٹنے ہی کی چیز تھی۔

(۱) صحیح بخاری فتح مکہ مین حضرت اُسامہؓ بن زید سے جو روایت ہے اس مین تصریح ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس مین خیف کے قیام کا ذکر نہین لیکن جو روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ہے اس مین یہ تصریح ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس مین خیف کی تصریح ہے، ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونون موقعون پر لوگون کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو، (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۰ و جلد ۳ ص ۳۰۰) (۲) اس موقع پر اس پوری آیت کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ مین ہے صحیح بخاری فتح مکہ مین اتنا آئے ہین جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل پھر نہ آئیگا

میں کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے، جن کو قریش خدا مانتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں، حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں، حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے کنجی لی اور دروازہ کھلوایا، آپ حضرت بلالؓ اور حضرت طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی، بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں، لیکن نماز نہیں ادا کی،[1]

خطبۂ فتح شہنشاہی اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا خطبہ سلطنت یعنی بارگاہ واحدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں، بلکہ تمام عالم سے تھا،

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک	ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اس کا
لہٗ صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ	کوئی شریک نہیں ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا،
وھزم الاحزاب وحدہٗ الا کل	اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو
ماثرۃ او دم او مال یدعی	تنہا توڑ دیا، ہاں تمام مفاخر، تمام انتقامات
فھو تحت قدمی ھاتین الا	خونبہائے قدیم تمام خونبہا، سب میرے قدموں
سدانۃ البیت وسقایۃ	کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور
الحاج	حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہے،

[1] صحیح بخاری فتح مکہ۔

يا معشر قريش ان الله قد اذهب	اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور،
عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها	نسبت کا فخر، خدا نے مٹا دیا، تمام
بالآباء الناس من آدم وآدم	لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی
من تراب،	سے بنے ہیں،

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر	لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے
وانثى وجعلناكم شعوبا وقبائل	پیدا کیا، اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے
لتعارفوا ان اكرمكم عند الله	کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکے
اتقاكم ان الله عليم خبير (الحجرات)	جاؤ، لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو
هذا مختصراً،	پرہیزگار ہو، خدا دانا اور واقف کار ہے،
ان الله ورسوله حرم بيع الخمر (بخاری)	خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوتِ اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی،

خون کا اصولی مطالبہ عرب میں دستور تھا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پا جاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آسکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھ جاتا، اور سیکڑوں برس گذرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا، قاتل اگر مر چکا ہے، تو اس کے خاندان یا قبیلہ کے آدمی کو قتل کر دیتے

سی طرح خونبہا کا مطالبہ بھی اَباً عن جدٍّ چلا آتا تھا، یہ خون کا انتقام عرب مین سب سے بڑے فخر کی بات تھی، اس طرح اور اور بہت سی لغو باتین مفاخر قومی مین داخل ہو گئی تھین اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا، اور اس بنا پر آپ نے (اس طریق) انتقام، اور خونبہا اور نیز دیگر تمام مفاخر کی نسبت فرمایا کہ مین نے اُن کو پاؤن سے کچل دیا؛

عرب اور تمام دنیا مین نسل اور قوم وخاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم مین فرق مراتب قائم کئے گئے تھے، جس طرح ہندوؤن نے چار ذاتین قائم کین اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانور کا درجہ ہے، اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائے،

اسلام کا سب سے بڑا احسان، جو اُس نے تمام دنیا پر کیا، مساوات عام کا قائم کرنا تھا، یعنی عرب وعجم، شریف ورذیل، شاہ وگدا سب برابر ہین، ہر شخص ترقی کر کے انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت پڑھی، اور پھر توضیح فرمائی کہ "تم سب اولاد آدم ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے"

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان مین وہ حوصلہ مند بھی تھے، جو اسلام کے مٹانے مین سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیون کے بادل برسایا کرتی تھین، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکر قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیان کی تھین، وہ بھی تھے جنھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ مین کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و

کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے، جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر اُن کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے،

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟"

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اُٹھے کہ

اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ — تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے؛

ارشاد ہوا۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ، تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو؛

کفارِ مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت آگیا تھا کہ اُن کو اُن کے حقوق دلائے جاتے لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں،

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے، اُن کی آتشِ غیرت ابھی مشتعل تھی، عتاب بن اسید نے کہا "خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا"[1]

---

[1] ابن ہشام (حضرت عتابؓ بعد کو مسلمان ہوئے) ۳ س

ایک اور سردارِ قریش نے کہا اب جینا بیکار ہے[1]؛

مقامِ صفا میں آپ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے، آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہوچکی، تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ اُن سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے[2]، آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں، اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہوجاتا تھا،

ان مستورات میں ہند بھی تھیں، یہ وہی ہند ہے، جو مشہور عرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ کی ماں تھی، حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا، اور ان کا سینہ چاک کرکے کلیجہ چبا گئی تھی، وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں نقاب پہنتی تھیں، لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے، بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری اور گستاخی) سے باتیں کیں جو حسبِ ذیل ہیں[3]،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا،
ہند	یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا، لیکن بہرحال ہم کو منظور ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	چوری نہ کرنا،
ہند	میں نے اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں

۱؎ اصابہ تذکرہ عتاب بن اسید (جلد ۴ صفحہ ۲۱۱) ۲؎ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۴۳ ۳؎ طبری ج ۳ ص ۱۶۴۳، [illegible]

	ت، اگرچہ آپ نے کبھی لے لیا کرتی ہوں،
	معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اولاد کو قتل نہ کرنا،
ہند	ربیناھم صغارا وقتلتھم کبارا فانت وھم اعلم،
	ہم نے تو بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو جنگ بدر میں
	آپ نے ان کو مار ڈالا، اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں،

دو ساتھ عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ رئیس عرب قسمت جلاوطن ہوا جاتا ہے، آپ نے علامت امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا، عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے، حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے[2] بعد کو مسلمان ہو گئے، عبداللہ بن الزبعری عرب کے مشہور شاعر جو پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کہا کرتے تھے، اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گئے، لیکن پھر آکر اسلام لائے[3]،

ابوجہل کے بیٹے عکرمہ یمن چلے گئے، لیکن ان کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امان لی، اور جا کر یمن سے لائیں[4]، یہ واقعہ بوجہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آگیا، اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہ کہتے ہیں،

---

[1] جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے تھے، اور مارے گئے تھے [2] طبری جلد ۳ ص ۱۶۴۵، اصابہ ذکر صفوان بن امیہ، ج ۲ ص ۱۰۲، [3] ابن ہشام، [4] طبری جلد ۳ ص ۱۶۴۲)

اشتہار قتل

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو تمام مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس شخصوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں، ان میں سے چار شخص عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، خونی مجرم تھے، اور قصاص میں قتل کئے گئے، لیکن بعض روایتیں ہیں کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ستایا کرتے تھے اور آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اسی جرم میں قتل کی گئی کہ وہ آپ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی،

(۱) حافظ مغلطائی نے چند رواۃ مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں، جو خود محدثین کے نزدیک غیر معتبر ہیں، عام ارباب سیر نے دس شخصوں کے نام لئے ہیں، ابن اسحاق نے نو نام گنائے ہیں، ابوداؤد اور دارقطنی کی روایت میں صرف چھ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے [illegible] تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے،

عام روایت کے رو سے ان دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا ان کا حال یہ ہے کہ [illegible] مجرم تھے [illegible] اور ان کو معافی [illegible] شخص قتل ہوئے تین مرد اور ایک عورت عبداللہ بن خطل مقیس بن صبابہ حویرث بن نقیذ اور ابن خطل کی ایک لونڈی، ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل پہلے اسلام لا چکا تھا، [illegible] ایک مسلمان کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت دلوا دی تھی [illegible] مقیس [illegible] اس انصاری کو قتل کر دیا اور حویرث نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ [illegible] کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اونٹ سے گرا دینا چاہا تھا حضرت علی بن ابی طالب نے اس کو قتل کر دیا، ذبیحہ جو ابن خطل کی لونڈی تھی، مکہ کی ایک مغنیہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی

(دیکھو زرقانی اور ابن ہشام ذکر فتح مکہ)

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفار قریش میں سے (بجز دو چار کے)، کون تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں؟ بااینہمہ ان ہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ انتم الطلقاء، جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے، وہ تو نسبتہً کم درجہ کے مجرم تھے، حضرت عائشہ صدیقہ کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا، اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا ارشاد ہوا کہ نہیں، خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے جانبر ہو سکتی ہے تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں،

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے، صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے[1] اور یہ عموماً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا، مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا، باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا کرتے تھے، وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں، یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے، جو قابل اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فی نفسہ جو درجہ ہے، وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں،

[1] بخاری فتح مکہ، "س"

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارے میں پیش کی جاسکتی ہے وہ ابوداؤد کی روایت ہے[1] جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جاسکتا، لیکن ابو داؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے کہا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہئے مجھ کو نہیں ملی، پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے، (اور شروع میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے، اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ قوی نہیں ہے، اگرچہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں لیکن واقعہ جس درجہ اہم ہے، اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

---

[1] ابوداؤد باب قتل الاسیر۔ ابوداؤد نے باب قتل [illegible] میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں، پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے (یہ روایت احمد بن مفضل سے ہے) [illegible] سدی [illegible] مصعب ابن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مردوں اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے بغیر آپ کی خدمت میں لا کر پیش کیا، اور اس کو کچھ دیر کے قتل کے [illegible] اس روایت میں احمد بن مفضل، اور اسباط بن نصر، اور سدی یہ تینوں [illegible] ہیں، اور خصوصاً اسباط ابن نصر پر زیادہ جرح کی گئی ہے [illegible] یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب [illegible] اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ تینوں [illegible] بہو سے اپنا خیال کر دیا ہے۔ ابوداؤد کی دوسری روایت عمرو بن عثمان بن عبدالرحمن بن سعید مخزومی سے ہے کہ انھوں نے اپنے دادا سے اور انھوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جاسکتی [illegible] مغنیہ لونڈیاں تھیں، ایک مسلمان ہوگئی، اور ایک قتل کی گئی، اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ [illegible]

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سرداران قریش جو مخالفین اسلام کے پیشرو تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے لیکن یہ صرف ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، ان اشتہاری مفروروں میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے جو ابوجہل کے فرزند تھے لیکن موطا سے امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے، قرآن کے علاوہ، کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں یہ واقعہ بہ طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

"حارث بن ہشام کی صاحبزادی، ام حکیم، عکرمہ بن ابوجہل کی زوجہ تھیں وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ام حکیم یمن گئیں، اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگئے، اور مکہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، پھر ان سے بیعت لی (کتاب النکاح)

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱۵) پہلے شیخ ابوالسعد [illegible] کی نسبت بھی طرح کچھ نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سند (تلقیح) اور آخر کتاب میں ہیں، اس میں سند کے آخر میں [illegible] عثمان سے [illegible] اور انہوں نے سعید سے یہ روایت سنی، اس سے ظاہر ہے کہ سند کے یہی حصہ میں ابوداؤد [illegible] ابوداؤد کی [illegible] روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری وغیرہ کی روایت ہے [illegible] قتادہ [illegible] حضرت انس بن مالک سے ایک روایت کی ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی ان [illegible] شخصوں کے قتل کا حکم دیا [illegible] ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، اور عورت [illegible] تھا عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی، مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہوئی، اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے [illegible] چاہا تھی، اس روایت میں [illegible] متفقاً ناقابل اعتبار ہے، ان بھی اس روایت کی [illegible] کسی سے نہیں کی ہے (تہذیب ابو [illegible]

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا، وہ اسلام پر مجبور نہیں کئے جاتے تھے تمام مورخین و ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی، لشکر اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے، اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے، اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے،

خزائن حرم

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا، وہ محفوظ رکھا گیا، لیکن مجسمے جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں، اُن میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی، جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہو گیا تھا، رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں، مٹانے پر بھی اُن کے دھندلے نشان رہ گئے تھے، اور حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ کی تعمیر تک باقی رہے،[1]

مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام پندرہ دن تک رہا، جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذ بن جبلؓ کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں،

فتح مکہ اور بت شکنی

فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعت توحید اور عظمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سیکڑوں بُت تھے، جن میں ہبل بھی تھا، جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا،

---

[1] فتح الباری ذکر فتح مکہ ایضاً اخبار مکہ ازرقی میں تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں،

اور یاقوت احمر سے بنا تھا، سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لا کر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا اور عدنان کا پرپوتا تھا، ہبل کے سامنے سات تیر رکھے تھے، جن پر "لا" و "نعم" لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے، تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے، اور "ہاں" یا "نا" جو کچھ نکلتا اُس پر عمل کرتے۔ جنگ احد میں ابوسفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری تھی، وہ عین کعبہ کے اندر رکھا تھا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو اور بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کیا گیا[1]۔

مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بت تھے جن کے سامنے نذر کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، ان میں سب سے بڑے لات، مناۃ اور عزّیٰ تھے، عزّیٰ قریش کا اور لات اہل طائف کا معبود تھا، مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزّیٰ یہیں منصوب تھا، بنو شیبان اس کے متولی تھے، اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ خدا جاڑوں میں لات کے ہاں اور گرمیوں میں عزّیٰ کے ہاں بسر کرتا ہے، عزّیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک ادا کرتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے[2]۔

مناۃ کا تھان مشلل تھا، جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے، وہ ایک بڑا گھڑا پتھر تھا، ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو بت قائم کئے تھے، یہ ان سب میں بالاتر تھا، اوس اور خزرج جب

---

[1] معجم البلدان ذکر ہبل بحوالہ ہشام بن محمد کلبی [2] یہ تمام تفصیل زرقانی جلد دوم ص ۲۴۰ میں ہے۔

کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آ کر ادا کرتے تھے،[1]

قبیلۂ ہذیل کا بُت سُواع تھا، جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اُس کے متولی بنو لحیان تھے،

بُت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے، جن میں سارا عرب گرفتار تھا، اب اُن کی بربادی کا وقت آچکا تھا، اور دفعۃً ہر جگہ خاک اُڑنے لگی،

---

[1] معجم البلدان ذکر مناۃ،

ہوازن وثقیف

غزوۂ حنین، واوطاس، وطائف

شوال ۸ھ

وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ

حنین حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے، ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے[1] یہ اس کے دامن میں ہے، اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں[2]

ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں،

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا، لیکن اہل عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ اُن کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے، اُن کا خیال تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر قریش پر غالب آگئے، اور مکہ فتح ہوگیا، تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود بخود بیعت کی، اور اسلام قبول کرنا شروع کیا،[3] لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا، یہ قبیلے نہایت

(۱) یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے، ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے، ص ۱۵۰ قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے، فتح الباری (۲) زرقانی ذکر غزوۂ ہوازن واوطاس ۳ ص ۳ (۳) صحیح بخاری ذکر فتح مکہ (بعد) باب مقام النبی بمکہ،

جنگجو اور فنونِ جنگ سے واقف تھے، اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے کہ اُن کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے، اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن (اور ثقیف) کے رؤسا نے (یہ سمجھ لیا کہ اب اُن کی باری ہے، اس لئے انھون نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا، اور آپس مین) قرارداد ہوگئی کہ (مسلمانون کے خلاف جو اس وقت مکہ مین جمع ہین) ایک عام حملہ کر دیا جائے،

(اس قرارداد کے مطابق یہ قبائل) بڑے زور شور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنا تمام اہل و عیال لے کر آیا تھا، کہ بچے اور عورتین ساتھ ہون گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانین دے دین گے،

اس معرکہ مین اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخین شریک تھین، تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، فوج کی سرداری کے لئے انتخاب (تو) مالکؓ بن عوف (کا کیا گیا جو) قبیلۂ ہوازن کا رئیس اعظم تھا، لیکن مُشیر کی حیثیت سے) دُرید بن الصمہ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو) عرب کا مشہور شاعر اور قبیلۂ جُشم کا سردار تھا، اُس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ مین یادگار ہین، لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈی کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، تاہم چونکہ عرب اُس کو مانتا تھا اور اُس کی رائے و تدبیر پر تمام عرب کو اعتماد تھا، خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی، پلنگ پر بٹھا کر اس کو میدانِ جنگ

۱؎ مارگولیوس صاحب لکھتے ہین، حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی سب سے عزیز تھی، نہایت خائف تھے (۲؎ مالکؓ بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہوگئے تھے، اور حضرت عمرؓ کے زمانہ مین جنگِ قادسیہ مین شریک اور دمشق کے حاکم بنے [illegible]

مین لائے، اُس نے پوچھا کہ یہ کونسا مقام ہے؟ لوگون نے کہا "اوطاس" بولا کہ ہان یہ مقام جنگ کے لئے موزون ہی، اُس کی زمین نہ بہت سخت ہے، نہ اس قدر نرم کہ پاؤن دھنس جائین" پھر پوچھا کہ "بچّون کے رونے کی آوازین کیسی آرہی ہین"، لوگون نے کہا کہ بچے اور عورتین ساتھ آئی ہین کہ کوئی شخص پاؤن پیچھے نہ ہٹائے"، بولا کہ "جب پاؤن اکھڑ جاتے ہین تو کوئی چیز روک نہین سکتی، میدان جنگ مین صرف تلوار کام دیتی ہے، بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتون کی وجہ سے، اور بھی ذلّت ہوگی"۔

پھر پوچھا کہ کعب اور کلاب بھی شریک ہین یا نہین؟ اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلون کا ایک شخص بھی میدانِ جنگ مین نہین تو کہا اگر آج کا دن عزّت و شرف کا دن ہوتا تو کعب وکلاب غیر حاضر نہ ہوتے" اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام مین فوجین جمع کی جائین، اور وہین اعلانِ جنگ کیا جائے، لیکن مالک بن عوف نے جو تیس سالہ نوجوان تھا جوشِ شباب مین اس راے کے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بیکار ہو چکی[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مین ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپ نے تصدیق کے لئے حضرت عبد اللہ بن ابی حدرد کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین مین آئے، اور کئی دن تک فوج مین رہ کر تمام حالات تحقیق کئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریان کین، رسد اور سامان جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی، عبد اللہ بن ربیعہ جو ابوجہل کے سوتیلے بھائی تھے، نہایت دولتمند تھے، اُن سے تیس ہزار درہم قرض لئے[2]، صفوان بن

---

[1] یہ تمام تفصیل طبری مین ہے، (ج ۳ ص ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷) ص ۳[2] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۳۶

امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک مسلمان نہیں ہوا تھا، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کیے[1]،

شوال ۸ھ مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سروسامان سے حنین پر بڑھیں کہ بعض صحابہ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے، لیکن بارگاہ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی،

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ	اور حنین کا دن یاد کرو، جب تم اپنی
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ	کثرت پر نازاں تھے لیکن وہ کچھ کام نہ
عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ	آئی، اور زمین باوجود وسعت کے تنگی
ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ	کرنے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے،
اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى	پھر اللہ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر
الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ	تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں، جو
تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا	تم نے نہیں دیکھیں، اور کافروں کو عذاب دیا،
وَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ، (توبہ)	اور کافروں کی یہی سزا ہے،

(بقیہ ص ۵۳۲) اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے [1] موطا میں ہے کہ جب آپ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا خوشی سے، یعنی جبراً لیتے ہو، ورنہ میں نہیں دیتا، آپ نے فرمایا جبراً نہیں لوں گا، ابوداؤد (باب الضمان) میں بھی اسی قسم کی روایت ہے،

فتح کے بجائے دبۂ اول میں مطلع صاف تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا، تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا، حضرت ابو قتادہؓ جو شریک جنگ تھے، ان کا بیان ہے کہ جب لوگ بھاگ نکلے، تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینہ

۱؎ لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے، ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ مختلف وقتوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی، مصنف نے جس تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا ہے، اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابل تشریح ہیں،

(۱) پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے، لیکن حدیث صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پا کر تیر اندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہو گئی، بخاری میں حضرت براءؓ کے الفاظ یہ ہیں،

وانا لما حملنا علیهم انکشفوا	اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست
فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا	کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مال غنیمت
بالسهام،	پر ٹوٹ پڑے تو انہوں نے ہم کو تیروں
(بخاری غزوۂ حنین)	پر دھر لیا،

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض سے شریک ہی ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ ان طلقاء کو قتل کر دیجئے، انہی کی وجہ سے شکست ہوئی، الفاظ یہ ہیں:-

اقتل من بعدنا من الطلقاء انهزموا	ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے،
بك (غزوة النساء مع الرجال)	انہی نے آپ کو شکست دلوائی،

پر سوار ہے، میں نے عقب سے پہنچ کے شانہ پر تلوار ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی، اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی، لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا، اسی اثنا میں میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا، پوچھا کہ مسلمانوں کا حال ہے بولے کہ قضائے الٰہی یہی[1] تھی،

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳۴) امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں،

لم يحصل الفرار من جميعهم وانما فتحه عليهم من في قلبه مرض من مسلمة اهل مكة المؤلفة ومشركيها الذين لم يكونوا اسلموا وانما كانت هزيمتهم فجاءة لانصبابهم عليهم دفعة واحدة ورشقهم بالسهام ولاختلاط اهل مكة معهم ممن لم يستقر الايمان في قلبه وممن يتربص بالمسلمين الدوائر وفيهم نساء وصبيان خرجوا للغنيمة (غزوہ حنین)

سب لوگ نہیں بھاگے تھے، بلکہ مکہ کے مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے، اور مکہ کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) انھوں نے بھاگنا شروع کیا تھا، اور یہ بھاگنا تیز اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی، اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے، جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا، اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے، اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے، جو غنیمت کیلئے آئے تھے

مؤرخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقا کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہل مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے، (ج ۳ ص ۱۶۰۰ لائیڈن)

متقدم مفسرین میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے ان الطلقاء انجفلوا يومئذ بالناس وجلوا عن النبي صلى الله عليه وسلم (ابن جریر طبری جلد ۱۰ ص ۶۲)

عہد متوسط کے مفسرین میں سے ابو حیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں،

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین (ج ۲ ص ۶۱۸، ۶۱۹)

شکست کے مختلف اسباب تھے، مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالدؓ کی افسری میں تھا زیادہ تر فتح مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے، وہ جوانی کے غرور میں، اسلحۂ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے[1] فوج میں دو ہزار طلقاء بھی وہ لوگ تھے، جو اب تک اسلام نہیں لائے؛

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳۵)

یقال ان الطلقاء من اھل مکۃ	کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگے تھے، ان
فروا وقصدوا القاء الھزیمۃ فی	کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست
المسلمین (بحر المحیط ج ۵ ص ۲۴)	ہو جائے،

متاخر مفسرین میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں،

وکان اول من انھزم الطلقاء مکرا	سب سے پہلے طلقاء مکر و فریب شکست
منھم وکان ذلک سببا لوقوع	کھا کر پیچھے ہٹ گئے، اس سے مسلمانوں
الخلل وھزیمۃ غیرھم (ج ۱۰ ص ۷۵)	میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی،

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انسؓ والی روایت ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ:- (لوگ پیچھے ہٹ گئے، یہاں تک کہ آپ تنہا رہ گئے) مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہاں کوئی نہ تھا، اسی لیے اس روایت میں حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے لبیک یا رسول اللہ ابشر نحن معک! (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ آپ خوش ہوں کہ ہم آپ کے پاس ہیں) اسی باب میں حضرت انسؓ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں، لبیک یا رسول اللہ وسعدیک نحن بین یدیک (بخاری غزوۂ طائف) ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ! ہم آپ کے سامنے ہیں

علامہ ابن حجر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے،

[1] بخاری، باب الجہاد، باب من صف اصحابہ عند الہزیمۃ ونزول عن دابتہ

تھے، تیراندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، میدانِ جنگ میں
اُن کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا، کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات
پر قبضہ کر لیا تھا، اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوہوں، اور دروں میں جا بجا

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳۷)

وفیہ جمع بین قول من قال بقی وحدہ وبین الاخبار الدالۃ علی انہ بقی معہ جماعۃ بان المراد بقی وحدہ متقدما مقبلا علی العدو والذین ثبتوا معہ کانوا وراءہ (فتح ص ... مصر)

اور اس قول میں کہ حضور تنہا رہ گئے، اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضور کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت تھی تطبیق یہ ہے کہ حضور دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام میں تھے اور جو آپ کے ساتھ ثابت قدم تھے، وہ آپ کے پیچھے تھے،

دوسری یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براءؓ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براءؓ تصریح کرتے ہیں کہ ابوسفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے (غزوۂ حنین بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے یہ الفاظ ہیں کہ میں نے اور ابوسفیان بن حارث نے حضور سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔

فلزمت انا وابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم نفارقہ

(مسلم غزوۂ حنین) صحیحین کی ان روایات کے سوا روایات ذیل بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے کہ ... سو آدمیوں کا حضور کی حمایت پر باقی رہنا بتایا گیا ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۲۳)

(۲) ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو آدمی بھی نہیں رہ گئے تھے۔ (ترمذی ابواب الجہاد باب ما جاء فی الثبات عند القتال)

ل مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ گو وہ تیر اندازی میں مشہور تھے ... [illegible] ... (فتح الباری جلد ۸ ص ۲۵ مصر) اور شرح مسلم نووی ... [illegible] ... صحیح ... [illegible]

جما دیئے تھے، فوجِ اسلام نے تڑکے کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا، حملہ کیا، میدانِ جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے، حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں، ادھر کمینگاہوں سے تیراندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینھ برسا دیا، مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا، اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، صحیح بخاری میں ہے، فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ[۵] یعنی سب لوگ ٹل گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے،

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳۷) (۳) مسند احمد جلد اوّل ص ۴۵۳) وحاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اسی آدمی باقی رہ گئے تھے (فتح الباری جلد ۸ ص ۲۳)

(۴) بیہقی نے حارثہ بن نعمان کی روایت کی ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۲۲)

ابونعیم نے دلائل میں ان کی تفصیل بتلائی ہے کہ تینتیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے اور بقیہ انصار تھے (فتح الباری جلد ۸ ص ۲۳)

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت مہاجرین، انصار اور اہل بیت میں سے حسب ذیل اصحاب موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباس ابن عبدالمطلب، حضرت ابوسفیان بن حارثؓ، حضرت جعفرؓ ابن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت ربیعہؓ بن حارث، حضرت اسامہؓ بن زید، حضرت ایمن بن ام ایمن

اس تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت انسؓ کے الفاظ بقی وحدہ اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے، علامہ ابن حجر نے اسکی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے، لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا اظہار مقصود ہے، نہ کہ تعداد کی نفی،

دوسری روایات میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں، (ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۲۴) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس تھے، اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضورؐ کے پاس پہنچتے گئے، یہاں تک کہ ایک اچھی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہو گئی، اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے، (ابن سعد مغازی غزوہ طائف)

تیرون کا مینھ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجین ہوا ہو گئی تھین لیکن ایک پیکر مقدس پا برجا تھا جو تنہا ایک فوج ایک ملک ایک اقلیم ایک عالم بلکہ مجموعۂ کائنات تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یا معشر الانصار! آواز کے ساتھ صدا آئی، ہم حاضر ہین، پھر آپ نے بائین جانب مڑکر پکارا، اب بھی وہی آواز آئی، آپ سواری سے اتر پڑے، اور جلال نبوت کے لہجہ مین فرمایا مین خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہون[1]

بخاری کی دوسری روایت مین ہے،

انا النبی لاکذب	مین پیغمبر ہون، یہ جھوٹ نہین ہے،
انا ابن عبد المطلب	مین عبد المطلب کا بیٹا ہون،

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے، آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین وانصار کو آواز دو، انھون نے نعرہ مارا،

یا معشر الانصار	اے گروہ انصار،
یا اصحاب الشجرہ،	اے اصحاب الشجرۃ (بیعت رضوان)،

اس پر اثر آواز کا کانون مین پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعۃً پلٹ پڑی، جن لوگون کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے، انھون نے زرہین پھینک دین، اور گھوڑون سے کود پڑے، دفعۃً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے، اور جو رہ گئے، ان کے ہاتھون مین ہتھکڑیان تھین، بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی،) جم کر لڑے لیکن ان کے ستر

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص ۶۲۳ غزوۂ طائف،

آدمی مارے گئے، اور جب اُن کا علمبردار عثمان بن عبداللہ، مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے،
شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر (کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ) طائف میں
جا کر پناہ گزین ہوئی جس کے ساتھ سپہ سالار لشکر (مالک بن عوف) بھی تھا،

اوطاس

درید بن الصمہ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عامر اشعریؓ کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی، (حضرت ابو عامرؓ درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا) یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا، درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا، ربیعہ بن رفیعؓ نے اُس پر تلوار کا وار کیا، لیکن اچٹ کر رہ گئی، اُس نے کہا تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے، پھر کہا کہ میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو، اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا، ربیعہؓ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اُس نے کہا خدا کی قسم درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا۔[۱]

اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، ان میں حضرت شیماءؓ بھی تھیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب اُن کو گرفتار کیا تو انھوں نے کہا میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں، لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، انھوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپ نے دانت سے کاٹا تھا،

(۱) [illegible] ابن ہشام، جلد ۲ ص [illegible] طبری ج ۳ ص ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ۔

یہ اس کا نشان ہے۔ فرطِ محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اُن کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں، اور ارشاد کیا کہ جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو، اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے[1] انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت و احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں،

محاصرۂ طائف

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی، اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، طائف نہایت محفوظ مقام تھا، طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی، یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا، نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا، عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابوسفیان (حضرت امیر معاویہؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی، کفارِ مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا، تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا، یہاں کے لوگ فنِ جنگ سے بھی واقف تھے، طبری، اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود، اور غیلان بن سلمہ نے جُرَش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ، ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا،[2]

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہلِ شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کی رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں، اور جابجا قدر انداز متعین کئے۔[3]

---

[1] طبقات ابن سعد و اصابہ و طبری (جلد ۳ ص ۱۶۶۸) [2] طبری (ج ۳، ص ۱۶۶۹، مطبوعہ یورپ [3] تاریخ خمیس جلد دوم ص ۱۲۲، و ابن سعد،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا، حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے، غرض محاصرہ ہوا، اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبّابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے، دبابہ پر اہلِ قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں، اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا، لیکن شہر فتح نہ ہو سکا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفلؓ بن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے، انھوں نے کہا کہ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے، اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں،

چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے، صحابہ نے عرض کی آپ اُن کو بددعا دیں، آپ نے یہ دعا دی[1]

اَللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا وَائْتِ بِھِمْ،	اے خدا ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں،

تقسیم غنائم محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی،[2] اسیرانِ جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا، کہ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو اُن سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گذرنے پر کوئی نہ آیا، مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے

[1] ابن سعد جزء مغازی ص ۱۰۵ [2] طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۰

حسب قاعدہ اہلِ فوج کو تقسیم کیے گئے خمس بیت المال اور غربا و مساکین کے لیے رکھا گیا۔
مکہ کے اکثر رؤسا جنھون نے ابھی اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے، انہی کو قرآن مجید مین مؤلفۃ القلوب کہا ہے، قرآن مجید مین جہان زکوٰۃ کے مصارف بیان کیے ہین، ان لوگون کا نام بھی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگون کو نہایت فیاضانہ انعامات دیے جن کی تفصیل یہ ہے؛

ابوسفیان، مع اولاد	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نُضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمرو	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالعزی	۱۰۰ اونٹ
(ان کے علاوہ تین غیر کی نومسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)	
اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ
عیینہ بن حصن فزاری	۱۰۰ اونٹ
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ

ان کے سوا بہت سے لوگون کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے، عام تقسیم کی رو سے

فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ، اور چالیس بکریاں تھیں، لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا، اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں[۱]،

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی، عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں[۲] بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے[۳]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے، آپ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ حضور، ہمارے سربرآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے، صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انس رضی سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا آپ نے جو سنا صحیح ہے"

آپ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم

(۱) طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۱۰۱ و زرقانی علی المواہب ج ۳ ص ۳۰ و شرح صحیح بخاری ...

(۲) صحیح بخاری مطبوعہ مجمع نظامی ص ۱۰۶۲ (۳) صحیح بخاری ص ۶۲۰ باب ...

منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا[1]

آپ یہ فرماتے جاتے تھے، اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے[2]

آپ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی،

یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر اپنے گھر آؤ[3]

انصار بے اختیار چیخ اٹھے، کہ ہم کو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں، اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں، آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں میں نے اُن کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیفِ قلب کے لئے دیا،

حنین کے میدانِ جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، کہ اسیرانِ جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ اسی قبیلہ کی تھیں، رئیس قبیلہ (زہیر بن صرد) نے

۱؎ صحیح بخاری صفحہ ۶۲۱ (باب غزوۂ طائف) و فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۴۰ ۔ ۲؎ صحیح بخاری کتاب المغازی ۔ ۳؎ اس کی تفصیل فتح الباری میں ہے

کھڑے ہو کر تقریر کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، یعنی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں خدا کی قسم اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو اُن سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خاندان عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے لیکن عام، ہاں اس کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو، نماز ظہر کے بعد اُن لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپ نے فرمایا مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کی سفارش کرتا ہوں مہاجرین اور انصار بول اٹھے ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعۃً آزاد کئے گئے

واقعات متفرقہ (حضرت ماریہؓ کے بطن سے، اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم رکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی، ڈیڑھ سال (سترہ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا جس دن ابراہیم نے وفات پائی، سورج گرہن ہوا عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے، لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ سورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا، اس کے بعد آپ نے کسوف کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا)

(تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۰۰۲) ص ۱۴۵ بخاری باب کسوف

٩ھ

واقعۂ ایلاء، وتخییر وغزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر ٩ھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زاہدانہ اور تمام زخارفِ دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے، دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدۃ العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا،

ازواجِ مطہرات ؓ اس جنسِ لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب وزینت اور ناز ونعمت ہے، اور گو شرفِ صحبت نے اُن کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا، تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی، خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحاتِ اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے، کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی اُن کی راحت وآرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے ان واقعات کا اقتضا تھا کہ اُن کے صبر وقناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا

(۱) بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذی الحجہ ۵ھ کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے، لیکن آگے چل کر حضرت عمر ؓ کی روایت میں یہ مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم سبب ذہن میں، اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا، جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی، غسان کا حملہ ٩ھ میں ہونے والا تھا، حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی نے یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل ٩ھ کا واقعہ ہے (دیکھو فتح [illegible] جلد ٩ ص ۲۵۰، ش

ازواج مطہرات میں بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں حضرت ام حبیبہؓ تھیں جو رئیس قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہؓ تھیں جو قبیلۂ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں حضرت صفیہؓ تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیسِ اعظم تھا حضرت عائشہؓ تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں حضرت حفصہؓ تھیں جن کے والد فاروق اعظمؓ تھے، بشریت کے اقتضا سے ان میں منافست بھی تھی، اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ ع باسایہ ترانمی پسندم کی حد تک تھی،

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آگیا تھا، انھوں نے آپ کے سامنے پیش کیا، آپ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپ نے نوش فرمایا، اس میں وقتِ مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا، حضرت حفصہؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے یا تمھارے گھر آئیں تو کہنا چاہئے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے، (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا لی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ	اے پیغمبر اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم خدا کی
لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ (تحریم-۱)	حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو

۱؎ صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم، اس واقعہ کو بخاری کتاب الطلاق میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے جس میں ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواج مطہرات بھی شریک کر لی گئیں اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہؓ تھیں

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے۔

فان قلت كيف جاز لعائشة وحفصة الكذب والمواطاة التي فيها ايذاء رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت كانت عائشة صغيرة مع انهما وقعت منها من غير قصد الايذاء بل على ما هو من جبلة النساء في الغيرة على الضرائر۔

(تفسیر سورہ تحریم)

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کرنا کیونکر جائز تھا تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کمسن تھیں اس کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں اس طرح کی ایک تدبیر تھی،

لیکن علامہ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے اول تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا اس وقت حضرت عائشہؓ سترہ برس کی ہو چکی تھیں دوسرے حضرت عائشہؓ کمسن تھیں، لیکن اور ازواج مطہرات جو اس میں شریک تھیں وہ بڑی عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت ۳۵ کی تھی،

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی۔ تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لطیف المزاج تھے، اور بو کی ذرا سی ناگواری کو

برداشت نہین فرما سکتے تھے،[۱] ازواج کے پہلوؤن مین اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہین البتہ ازواجِ مطہراتؓ کا ایکا کرنا بظاہر محلِ اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہین کہ ازواجِ مطہراتؓ معصوم تھین، یا اپنے نجائز مقصد کے لئے جائز وسائل نہین اختیار کرتی تھین، اسی زمانہ مین یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہؓ سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا، لیکن انھون نے حضرت عائشہؓ سے کہدیا اس پر یہ آیت اتری،

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ	اور جب کہ پیغمبرؐ نے اپنی بعض بیویون سے
حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ	راز کی بات کہی اور انھون نے فاش کر دی
اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ	اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی، تو پیغمبر
عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ	نے اس کا کچھ حصہ اُن سے کہا اور کچھ چھوڑ
مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ	دیا، پھر جب اُن سے کہا تو انھون نے کہا
الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ۔	کہ آپ کو کس نے خبر دی، پیغمبرؐ نے کہا
(تحریم-۱)	مجھکو خدائے علیم خبیر نے خبر دی ہے!

شکر رنجیان بڑھتی گئین، اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ نے باہم تظاہر کیا یعنی دونون نے اس پر اتفاق کیا کہ دونون مل کر زور ڈالین، اس پر حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کے شان مین یہ آیتین اترین،

(۱؎ مسند احمد ج ۶ ص ۲۲۹، ۲ ص ۵؎ عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۲۶ اس،

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ	اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو
قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ	تمہارے دل مائل ہیں اور اگر پیغمبر کے
اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ	(یعنی رسول اللہ کے مقابلہ میں ایکا کرو
الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ	تو خدا اور جبرئیل اور نیک مسلمان اور سب کے
ظَهِيرٌ (سورۂ تحریم)	بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں)

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے، لیکن توسیعِ نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواج مطہراتؓ شریک تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہراتؓ سے نہ ملیں گے۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں آپ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا، آپ نے بالاخانہ[۱] پر تنہا نشینی اختیار کی، واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپ نے تمام ازواج کو طلاق دی، اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو ہم حضرت عمرؓ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے دلچسپ اور پُراثر تفصیل کیساتھ

(۱) بالاخانہ کیلئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربہ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور تھا اسی لئے بعض لوگوں کو شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالاخانہ تھا لیکن یہ قطعی غلط ہے، مشربہ ام ابراہیم مدینہ سے باہر تھا، حضرت عمرؓ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہؓ کے گھر اور مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا، کہ حضرت عمرؓ دوڑ دوڑ کر جلدی جلدی کبھی ادھر کبھی ادھر جاتے تھے، ابوداؤد میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا بالاخانہ تھا جو مسجد نبوی سے متصل دیگر ازواج مطہرات کے حجروں کے برابر تھا، (ابوداؤد باب الامام یصلی من قعود) س

اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس بیان میں کچھ زائد واقعات بھی ہیں جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔[۱]

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، کہ میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے، اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے،

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے تھے اور ان پر غالب رہتے تھے لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی اُن کی تقلید شروع کی، ایک دن میں نے کسی بات پر اپنی بیوی کو ڈانٹا، انہوں نے الٹ کر جواب دیا، میں نے کہا تم میری بات کا جواب دیتی ہو، بولیں، تم کیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اُن کو برابر کا جواب دیتی ہیں، یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روٹھی رہتی ہیں، میں نے دل میں کہا غضب ہو گیا، اٹھ کر حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رات بھر روٹھی رہتی ہے حفصہؓ نے اقرار کیا میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسولؐ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے، بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا خیال فرماتے ہیں، ورنہ تجھکو طلاق دے چکے ہوتے پھر حضرت ام سلمہؓ

---

[۱] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، طلاق، کتاب العلم میں باختلاف عبارت منقول ہے، صحیح مسلم، باب النکاح میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے، ان روایتوں میں باہم جزئیات میں، خلاف ہے، ہم نے التقاط سب روایتوں کو جمع کیا ہے،

گے پاس گیا اور اُن سے بھی یہی شکایت کی. بولیں کہ عمر! تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے یہانتک کہ اب رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ اور اُن کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ ہو گیا اور اٹھ کر چلا آیا؟

کچھ رات گئی، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا، اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انھوں نے کہا غضب ہو گیا، میں نے کہا کیا غسانی[1] مدینہ پر چڑھ آئے، بولے کہ نہیں، اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ آیا، آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کے ساتھ نماز فجر ادا کی، آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نماز سے فارغ ہو کر بالاخانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے، میں حفصہؓ کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے، میں نے کہا، میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا، حفصہؓ کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبوی میں آیا، دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں اُن کے پاس بیٹھ گیا، لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا، اٹھ کر بالاخانہ کے پاس آیا، اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے کچھ جواب نہیں دیا، میں اٹھ کر پھر مسجد میں چلا آیا،" پھر تھوڑی دیر کے بعد بیتاب ہو کر بالاخانہ کے نیچے آیا، اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا رباح! میرے لئے اذن مانگ شاید رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے آیا ہوں، خدا کی

---

[1] غسانی عرب کا ایک خاندان تھا جو شام میں رومیوں کے ماتحت بادشاہی کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا.

قسم رسول اللہ فرمائیں، تو حفصہ کی گردن اڑا دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپ کھری چارپائی[1] پر لیٹے ہیں، جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھی تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے، ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب پوچھا میں نے عرض کی، اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا، قیصر وکسریٰ باغ وبہار کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور آپ پیغمبر ہوکر آپ کی یہ حالت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر وکسریٰ دنیا لیں، اور ہم آخرت"

میں نے عرض کی کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی، آپ نے فرمایا نہیں" میں اللہ اکبر پکار اٹھا، پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں، اجازت ہو تو جاکر خبر کردوں کہ یہ خبر غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا تھا، آپ بالاخانہ سے اتر آئے[2]، اور عام باریابی کی اجازت ہوگئی، اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی،

---

(۱) بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی لیکن چٹائی جس سے بنی جاتی ہے، اس سے بنی ہوئی تھی (فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۱)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق ۲۹ روز بالاخانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمرؓ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے، یا آخر روز کا، اس روایت کے جتنے طرق ہیں، ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے، مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے، اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے، لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ	اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہدے کہ اگر
إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا	تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَ	آرایش مطلوب ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی
أُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا وَإِنْ	جوڑے دیکر بطریق احسن رخصت کردوں
كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ	اور اگر خدا، خدا کا رسول اور آخرت مطلوب
الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ	ہے، تو خدا نے تم میں سے نیکوکاروں کیلئے
مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا (احزاب ۴)	بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے

اس آیت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہراتؓ کو مطلع فرمادیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں دنیا اور آخرت اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دیکر عزت واحترام کے ساتھ رخصت کردوں ۔ اور اگر تم خدا اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلبگار ہو تو خدا نے نکوکاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے ،

مہینہ ختم ہوچکا تھا آپ بالاخانہ سے اترے اور چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہؓ پیش پیش تھیں ان کے پاس تشریف لے گئے، اور مطلع فرمایا، انھوں نے کہا میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۱) ۲۰ دن تک گویا حضرت عمرؓ ودیگر صحابہ کو واقعہ ایلا کی اطلاع ہی نہ تھی، حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کرسکتا، اسی بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا، بخاری کی اس روایت کو جو کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجہا، اور کتاب المظالم باب الغرفۃ میں ہے صلی اللہ علیہ وسلم من ابن عباس میں مذکور ہے صاف تصریح موجود ہے اس بنا پر اس فقرہ کو یوں پڑھنا چاہئے جب ایلا کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا، (س)

جب پھر حضور نے پوچھا اور رسول کو یقینی ہوں تو حضرت نے بھی یہی جواب دیا،

ایلاء تخییر مظاہرہ حفصہؓ عائشہؓ، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں، اور ان سے ایک ظاہر بین یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہراتؓ کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، صحیح بخاری باب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ) میں حضرت ابن عباسؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے، اس میں تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواج مطہراتؓ سے نزول، افشائے راز، آیت تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں،

حافظ ابن حجر نزول کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں:-

وھذا ھو اللائق بمکارم	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق
اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم وسعۃ	کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب
صدرہ وکثرۃ صفحہ وان	ہے کہ آپ نے اس وقت تک ایسا
ذلک لم یقع منہ حتی تکرر موجبہ	نہیں کیا ہوگا جب تک ان سے اس قسم
منھن (فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۵)	کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئی ہوں،

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی خطرناک سازش تھی جس کا اثر بہت پر خطر تھا، آیت مذکور یہ ہے،

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ	اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہؓ و

هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ	وحضرت حفصہؓ) رسول کے برخلاف ایکا
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ	کروتو خدا اس کا مولا ہے اور جبرئیل اور نیک
ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۱	مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی
(تحریم۔۱)	مددگار ہیں،

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو خدا اور جبرئیل اور نیک مسلمان موجود ہیں، اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کیلئے تیار ہیں روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ کہ اس کے ذریعہ سے نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں، اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کردی جائیں لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں، اور حضرت عائشہؓ وحضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پرخطر ہوسکتی ہے، جس کی مدافعت کے لئے ملاء اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو،

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد ۰۰ ۴ تک بیان کی گئی ہے، یہ شرارت النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے، کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوا دیں، ابن جبیر نے ساریہ بنت ام جندح کے حال میں لکھا ہے، وکانت تحرش بین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ ازواج مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی [illegible] آچکی تھی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسانؓ افک میں شریک ہو گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ جو حضرت زینبؓ کی بہن تھیں، سازش میں آگئی تھیں، چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریک تہمت تھے، مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی برأت پر وحی نہ آجاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا،

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہراتؓ کی کشیدگیٔ خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دیکر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکانِ اعظم حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ تھیں، اُن کو خیال ہوا ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے اُن کے والدین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے لیکن اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو رسول کی خاک پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو اذن نہ ملا، تو انھوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہؓ کا سر لے کر آؤں،

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے یعنی اگر عائشہؓ و حفصہؓ سازش بھی کریں گی، اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبرؐ کی اعانت کے لئے موجود ہے، اور خدا کے ساتھ جبریلؑ و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے،

ت، اور خدا عیان ... ان واقعات میں کتنے

کی ہیں کہ بڑے بڑے مؤرخین وارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں اسناداً درج کردیں،
اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں،

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی خاطر سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرلی تھی، خلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا، ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے، جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز جو حضرت حفصہؓ نے فاش کردیا تھا ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا،

اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مؤرخوں نے آنحضرت صلعم کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں، ان کا گل سرسبد یہی ہیں اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے،

ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے لیکن اس قدر سب کا قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موطوءہ کنیزوں میں تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا،

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں

ووقع عند سعيد بن منصور | (سعید) بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ

ہے اور

باسناد صحیح الی مسروق قال حلف	جو مسروق تک صحیح سند سے روایت کی ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحفصۃ	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے
لایقرب امتہ الخ (صفحہ ج ۸)	سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کرینگے

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند ہیثم بن کلیب، اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے؛

والطبرانی من طریق الضحاک	اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت
عن ابن عباس قال دخلت	ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ
حفصۃ بیتھا فوجدتہ یطاء	اپنے گھر میں گئیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو
ماریۃ فعاتبتہ (فتح الباری مطبوعہ	حضرت ماریہؓ کے ساتھ ہم بستر دیکھا، اس پر
مصر جلد ۸ ص ۵۰۳)	انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاتبت کی

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام روایتیں محض غلط اور بہتان ہیں؛

علامہ عینی شرح بخاری باب النکاح جلد ۹ ص ۲۰۸ میں لکھتے ہیں۔

والصحیح فی سبب نزول الآیۃ	روایات کی شان نزول کے باب میں
انہ فی قصۃ العسل لا فی قصۃ	صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ
ماریۃ المروی فی غیر الصحیحین	میں ہے ماریہؓ کے قصہ کے باب میں نہیں
وقال النووی ولم تات قصۃ	جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں

مارية من طريق صحيح	مذکور ہے نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے،

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں، اس کے لحاظ سے جب تک اُن کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ موجود ہو، قابل التفات نہیں، حافظ ابن حجر نے اُن میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے یعنی وہ روایت جس کے راوی، غیر مسروق ہیں[1]،

لیکن، اوّل تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ "میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا، وہ مجھ پر حرام ہے"، اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا، اس لئے یہ روایت اصول حدیث کی رو سے منقطع ہے یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا،

اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دارقطنی نے لکھا ہے،

كثير الخطأ في الأسانيد و المتون يحدث عن حفظه،	سند و متن دونوں میں، زبانی حدیث بیان کرتے ہیں، بہت خطا کرتے ہیں،

یہ مسلّم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں مذکور نہیں ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ

[1] فتح الباری تفسیر سورۂ تحریم [illegible] یعنی ماریہ کے بارے میں [illegible]

سورۂ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ہے (یعنی شہد کا واقعہ) تحقیقی طریقہ سے ثابت ہے، امام نووی نے جو ائمۂ محدثین میں سے ہیں صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسری کا راوی کثیر الخطا ہے، ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے،

یہ بحث اصول روایت کی بنا پر تھی درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدوکاوش کی حاجت نہیں، جو ہنگامہ اور واقعات بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کئے جا سکتے، نہ کہ اس ذات پاک کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

(بقیہ حاشیہ ص ٥٦٢) نسائی باب الغیرۃ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے اصرار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے، انتہی۔

غزوۂ تبوک

رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۵ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے،

جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس نے قیصر روم نے کی کو اس مہم پر متعین کیا، مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبان بن مالک نے دفعۃً آکر یہ کہا کہ غضب ہو گیا، تو انھوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آگئے،

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکر گران جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں تقسیم کر دی ہیں، ان کے ساتھ قبائل لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں، اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آگیا ہے، زرقانی نے طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد

(۱) ... (۲) ... ج ۳ ص ...

صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا، اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں، اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں،

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں، اور قرائن اس قدر قوی تھے، کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا، سو، اتفاق یہ کہ سخت قحط، اور شدت کی گرمیاں تھیں، ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا، منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے، اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ

لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ گرمی میں نہ نکلو،

سویلم ایک یہودی تھا اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے، اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے، چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائل عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی، صحابہ میں سے حضرت عثمان ؓ نے دو سو اوقیہ چاندی، اور دو سو، اونٹ پیش کئے،[1] اکثر صحابہ نے بڑی بڑی رقمیں لاکر حاضر کیں، تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا،

---

[1] مارگولیس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حنین میں انصار، مال غنیمت سے محروم رہے تھے، اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں، جب فائدہ جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے لیکن یہ مارگولیس صاحب کا حسن ظن ہے (قرآن نے خود بتایا کہ توقیہ سے کیا حاجت تھی) [2] ابن ہشام ۵۳ ابن سعد جزء المغازی ص ۱۱۹ [3] زرقانی ج ۳ ص ۷۲)

تاہم اُن کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہو سکا، انہی کی شان مین سورۂ توبہ کی یہ آیتین اُتری ہین،

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ	اور نہ اُن لوگون پر کچھ اعتراض ہے کہ جب
لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ	تمھارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے
أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ	اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کی ن
تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوْا	ہی جس پر تم کو سوار کر سکون تو وہ واپس
مَا يُنْفِقُوْنَ ۝	گئے، اور اُن کی آنکھون سے آنسو جاری تھے
(توبہ ۱۲)	کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہین ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب آپ مدینہ سے تشریف لیجاتے، تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے، چونکہ اس غزوہ مین بخلاف، ور معرکون کے ازواج مطہرات ساتھ نہین گئی تھین، اہل حرم کی حفاظت کے لیے کسی عزیز خاص کا رہنا ضرور تھا، اس لئے یہ منصب جناب امیرؓ کو ملا، لیکن انھون نے شکایت کی کہ آپ مجھ کو بچون اور عورتون مین چھوڑے جاتے ہین؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہین ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی،[۱]

غرض آپ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے جس مین دس ہزار گھوڑے تھے،[۲] راہ مین وہ عبرتناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید مین آیا ہے یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑون مین تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الہی نازل

[۱] صحیح بخاری غزوہ تبوک ص ۶۳۳
[۲] طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۹)

ہوچکا تھا، آپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پئے، اور نہ کسی کام میں لائے، تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی لیکن، اصلیت سے خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا، صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے، لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیس غسان کا ایک خط دیا، جس میں لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ محمدؐ نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا، حضرت کعبؓ کو جذب نبوی تھے لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا،

تبوک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن تک قیام کیا، ایلہ[1] کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضر خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا، ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا، جس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی، جربا اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے، اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی، دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل ہے، وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا، قیصر کے زیر اثر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا، اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربار رسالت میں حاضر ہو کر شرط صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا، آپ نے اس کو امان دی،

تبوک سے جب آپ واپس پھرے، اور مدینہ کے قریب پہنچے، تو لوگ عالم شوق میں

---

[1] یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے (مارگولیس، سنہ ...) تاریخ بخاری ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۸۶) میں

استقبال کو نکلے، یہان تک کہ پردہ نشینان حرم بھی جوش مین گھرون سے نکل پڑین اور لڑکیان یہ اشعار گاتی نکلین[1]

طلع البدر علینا　　　　من ثنیات الوداع

وداع کی گھاٹیون سے ہم پر چاند طلوع ہوا

وجب الشکر علینا　　　　ما دعا للہ داع

جب تک خدا کا پکارنے والا دنیا مین کوئی باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے

مسجد ضرار

منافقین ہمیشہ اس فکر مین رہتے تھے کہ مسلمانون مین کسی طرح پھوٹ ڈال دین، ایک مدت سے وہ اس خیال مین تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہین ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائین کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبوی مین نہ پہنچ سکین، یہان آکر نماز ادا کر لیا کرین، ابو عامر جو انصار مین سے عیسائی ہو گیا تھا، اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو مین قیصر کے پاس جا کر وہان سے فوجین لاتا ہون کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کر دون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک تشریف لیجانے لگے، تو منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آکر عرض کی کہ ہم نے بیمارون اور معذورون کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپ چل کر اس مین ایک دفعہ نماز پڑھا دین، تو مقبول ہو جائے، آپ نے فرمایا اس وقت ہم باہر جا رہے ہون جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد مین آگ لگا دین اسی مسجد کی شان مین یہ آیتین اتری ہین۔

---

[1] زرقانی ج ۳ ص ۹۲) س [2] زرقانی بحوالہ ابن جریر، ج ۳ ص ۹۰) س"

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا
وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ
وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَ
رَسُولَهُ مِن قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ
أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ
إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَا تَقُمْ فِيهِ
أَبَدًا لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ
مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ
فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ
أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ
الْمُطَّهِّرِينَ ۝

(توبہ - ۱۳)

مسجد ضرار کا انہدام

اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار (ضرر پہنچانے)
پھوٹ ڈالنے، اور کفر کی غرض سے بنایا
کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے
خدا اور رسول سے لڑتے ہیں، ان کو کمین
گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے
صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا، اور خدا
گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں (محمد!)
تم کبھی اس مسجد میں جا کر کھڑا ہونا، وہ
مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری
پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق
ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے
لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے، اور خدا صفائی

حج اسلام اور اعلان برات

مکہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن و امان نہیں قائم ہوا تھا، اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکان حج انجام پائے، مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اسید کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوئے تھے، فریضہ حج ادا کیا، اب ضرورت پیدا ہوئی کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر ملت ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے، غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ذی قعدہ یا ذی الحجہ ۹ھ

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابوبکرؓ قافلہ سالار، حضرت علیؓ نقیب اسلام، اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ معلم تھے، قربانی کے لیے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے،

قرآن نے اس حج کو حجِ اکبر کہا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ سبھی حج اصل ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی، اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہد جاہلیت کے اختتام اور حکومت اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے، مناسک و رسوم حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے، زمانہ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے، سورہ برأت کی چالیس آیتیں پڑھ کر سنائیں، اور اعلان کردیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل ہو سکے گا، نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقض عہد کے سبب آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ گیا۔[1]

(۱) بخاری کتاب المناسک باب لا یطوف بالبیت عریان و باب حج ابی بکر بالناس و تفسیر سورۂ برأۃ [illegible] سورۂ توبہ میں ہے یوم الحج الاکبر، مصنف نے اس حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے، اس [illegible] نے نقل کی ہے، لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حج اکبر ہے اور عمرہ حج اصغر ہے، ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۲۴۰، مسند ابن حنبل ص ۲۹۹ جلد ۲، عام تفصیل زرقانی جلد ۳

سورہ برات کی ابتدائی آیتیں جس میں خدا نے اس اعلان کا حکم فرمایا یہ ہیں:-

بَرَاۤءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى	اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے
الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	معاہدہ کیا تھا، (اور انھوں نے اس کو توڑ دیا)
فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ	توڑ دیا، ان کی خدا اور خدا کے رسول
وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ	کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے
وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ وَ	اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار
اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى	مہینے کی تم کو مہلت ہے، اس میں تم ملک
النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ	میں چلو، پھرو، اور جان لو کہ تم خدا کو
اللّٰهَ بَرِىۤءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ	عاجز نہ کر سکو گے، حج اکبر کے دن لوگوں
فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ	کو اعلان عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول
تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ	ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں اگر
مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	(تم نے اے مشرکین) توبہ کر لی تو یہ

(بقیہ حاشیہ ص ۵۶۹) ص ۱۱۲، وغیرہ میں موجود ہی۔ حالات ملفوظات میں یہ بیان ہو کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے، وہ ٹوٹ گئے لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے، اور اس کے بعد کفار مکہ کو کوئی معاہدہ نہیں ہوا، مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب (۲۰۰) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہونگی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیئے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہو کہ ممکن ہو کہ معاہدے کے متعلق یہ آیتیں گذشتہ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان [illegible] جیسا کہ صحاح ستہ کے مستند روایات میں مذکور ہے ۹ھ کے موسم حج میں ہوا ہو (س)۔

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (ع ۱)

تمھارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے، اے پیغمبر تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے، لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا، اور انھوں نے اس کے ایفا میں تمھارے ساتھ کچھ کمی نہ کی، اور نہ تمھارے مقابلہ میں انھوں نے تمھارے دشمنوں کی مدد کی، تو زمانۂ معاہدہ کو تم پورا کرو، خدا پرہیزگاروں کو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ (رکوع ۴)

اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں، اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں،

طبری نے بواسطۂ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہو گئے[1]

واقعاتِ متفرقہ | نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا، اب حصولِ دولت کے مواقع حاصل تھے، اس بنا پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا، اور تحصیلِ زکوٰۃ کے لئے عمال قبائل میں مقرر ہوئے،[2]

---

[1] طبری جلد ص ۱۷۲، [2] طبری جلد ۴ ص ۱۷۲۲ (س)

اسلام کے سایہ مین بعض غیر مسلم قومین بھی داخل ہو چکی تھین اُن کیلئے جزیہ کی یہ آیت اُتری،

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ، (توبہ) تاآنکہ نیچے بن کر وہ جزیہ ادا کرین،

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اُس کے ایک سال بعد سنہ مین حجۃ الوداع مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان عام فرمایا،

نجاشی جس کے ظل حمایت مین مسلمانون نے چند سال حبشہ مین بسر کئے، اُس نے اسی سال انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ مسلمانو! آج تمھارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اُس کے لئے دعاے مغفرت مانگو" اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی)

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانح زندگی پر محدود ہے بحث و تدقیقات اور رفعِ شکوک کیلئے دوسرے حصے ہیں، اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں، انہی حصوں میں لکھے جاتے لیکن کتبِ سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں (۱) ہیں، صرف غزوات ہیں، اگر صرف تصانیفِ سیرت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے، چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں مثلاً مغازی، بن عقبہ مغازی ابن اسحاق مغازی واقدی، یہ اندازِ تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دیا جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا، وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے،

ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا، لیکن غزوات کو پڑھ کر جو شبہات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، اُن کو دوسرے موقع کے لئے، اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا،

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں، نہ صرف بدنیتوں نے، بلکہ نیک دلوں نے بھی، لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں،

عرب اور جنگ وغارتگری

اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو جنگ وغارتگری سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق وعادات، رسوم ومعاملات، محاسن واوصاف، معائب ومثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اُسی سے منتج اور اسی سے نشو ونما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ وغارت گری تھی، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا، کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی، لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے، خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں، اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے، اور بالوں کو بُن کر کمل بناتے تھے، لیکن یہ جائداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی، یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی، اس لئے حملہ اور غارتگری شروع ہوئی، اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارتگری قرار پایا، ابوعلی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے،

(وذلك انهم كانوا يكرهون	(یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ
ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر	ان پر تین ماہ متواتر اس طرح گذر
لا تمكنهم الاغارة فيها لان	جائیں کہ ان پر وہ غارتگری نہ کرسکیں
معاشهم كان من الاغارة)[1]	کیونکہ ان کی معاش کا ذریعہ یہی تھا)

(1) کتاب الامالی جلد اول ص ۹۰ مطبوعۂ مصر)

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم" کہتے ہیں، اس لئے لوٹ کے مال کو عربی میں غنیمت کہنے لگے[1]۔ اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا، تو اسی نام سے پکارا گیا،

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان، عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا، آج بھی ایک سلطان، ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کرتے وقت رخصت کرتا ہے، تو کہتا ہے "سالماً غانماً" یعنی "سلامت آنا، اور لوٹ کر لانا" ہماری زبان میں جس عزیز چیز کو "غنیمت" کہتے ہیں، (مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت ہی غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے، اور عربی زبان سے آیا ہے،

ضرورتِ معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارتگری، اور جنگ عام ہو گئی تھی، تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے، اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیئے تھے جن کو "شہر حرم" کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، لیکن مسلسل تین تین مہینے تک جنگ کا معطل رہنا سخت ناگوار تھا، اس لئے نسئی ایک رسم ایجاد کر لی تھی یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے،

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں:-

---

[1] مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے نہیں ہوتی۔ ن ۔ س

كانوا يحلون المحرم صفراً ويحرمون صفراً المحرم لئلا يتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا يتعاطون فيها القتال۔

وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے، تاکہ پے درپے تین مہینے تک لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں،

ثار کا عقیدہ

لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا، لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اسباب بھی پیدا ہو گئے، اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے، ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اُس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا، گو سینکڑوں برس گذر جاتے تھے، اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا، تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل نہیں کر لیتا تھا، قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اسی کو ثار کہتے ہیں، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں، اسی طریقہ کے ابطال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا، اور اپنے قبیلہ کے مقتولوں کا خون معاف کر دیا تھا، لیکن صحرانشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور اُن کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے،

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اُس کی روح پرند بن جاتی ہے، اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا، مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھکو پلاؤ میں پیاسی ہوں"، اس پرند کو

یا ہار کہتے تھے،

ابو دؤاد ایادی کہتا ہے:

سلط الموت والمنون علیہم [illegible]

ان پر موت مسلط ہو گئی [illegible]

ذو الاصبع العدوانی کا شعر ہے:

یا عمرو ان لا تدع شتمی ومنقصتی [illegible]

اے عمرو اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تنقیص نہ چھوڑے گا [illegible]

ایک یہ خیال تھا کہ جس [illegible]

عمرو بن معدی کرب کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

وتخوا بآذان النعام المصلم [illegible]

غیرت اور حمیت کی بنا پر [illegible] کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے۔

ولا ترقعہ دون جنب مضجعہ [illegible] علی من مات یبکینا

گر کشتہ [illegible] پر رونا [illegible] دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم

معاذ اللہ ان ینوح نساءنا [illegible] علی ہالک او ان نضج من القتل

ندا کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں، یا رونے سے مجبور ہیں،
مقتول پر نوحہ کرتے تھے، تو کہتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے،

من کان مسرورا بمقتل مالک	فلیأت نسوتنا بوجه نهار
جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا	وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے
یجد النساء حواسرا یندبنه	یلطمن اوجههن بالاسحار
وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں	اور صبح کو اپنے چہرے پر دو ہتڑ مار رہی ہیں

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے
[illegible] سے نکلتی ہے، اور یہ نہایت عیب تھی [illegible]
[illegible] سمجھتے تھے،

وما مات منا سید حتف انفه	ولا طل منا حيث كان قتيل
ہمارا کوئی سردار کبھی اپنی موت نہیں مرا	اور نہ ہم سے کسی مقتول کا خون رائیگاں گیا

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا
تھا، ان کے اوصاف داخلی میں جب [illegible] کیا جائے [illegible]
[illegible] تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو امن و سکون سے باز رکھا، حضرت
[illegible] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے [illegible]
[illegible]
[illegible]

خود حضرت عمرو بن مالک نے اس میں شرکت کی، گو حضرت کو بہت ندامت ہوئی کہ ان کے باتھ ایک مسلمان مارا گیا۔

غنیمت کا مال | چونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورتِ معاش سے شروع ہوئی تھی، اس لئے عرب کے نزدیک مالِ غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی، اور ذرائع معاش میں سب سے زیادہ حلال و طیب اسی کو سمجھتے تھے، یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ ہو کر عرب میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا، اور جس طرح شارع نے ممنوعاتِ شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا، غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور نرمی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری۔

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل	لوگ تجھ سے [illegible]
فیهما اثم کبیر (بقرہ ۵-۲۷)	[illegible]

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا

اللهم بین لنا فی الخمر بیانا	[illegible]
شافیا	[illegible]

پھر یہ آیت اتری۔

لا تقربوا الصلوٰة و انتم سکاریٰ [illegible]

---

(۱) ابن ہشام [illegible] ص ۱۳

چنانچہ نماز کا وقت آتا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک شخص منادی پکارتا کہ کوئی شخص نشے میں نماز کو نہ آئے، پھر یہ آیت اتری،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ	مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال
وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ	کے تیر، یہ سب ناپاک، اور شیطان کے
مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ	کام ہیں، تو ان سے بچو کہ شاید تم فلاح
تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ	پاؤ گے، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے
يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ	کہ شراب اور قمار کے ذریعہ سے تم
فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ	لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے
ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ	اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روکے
مُنْتَهُونَ ۝ (مائدہ - ۱۲)	تو تم باز آؤ گے؟

باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید و تصریح کی، اور شدت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے، تڑوا دیئے، لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنا لیں، اس سے بھی منع فرمایا، ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں، اور جب ان سے بازپرس کی گئی تو انھوں نے نیک نیتی سے کہا کہ [illegible] شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت [illegible]

سے مسند ابن حنبل [illegible] کتاب الاشربہ باب تحریم الخمر [illegible]

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے
جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا ۝	انھوں نے جو کچھ پہلے کھایا پیا شراب پیا
(مائدہ ع ۱۲)	اُن پر کچھ الزام نہیں،

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ اُن صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے، حضرت عمرؓ نے تصدیق کی، اور ان لوگوں کو سزا دی، چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے،

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم و عادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں، اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے، سب سے پہلے جنگ بدر میں قبل اس کے کہ مال غنیمت یکجا جمع کیا جاتا، لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے، اس پر یہ آیت اتری،

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ	(انفال ع ۹)	اگر خدا کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا
فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝		تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا،

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بتصریح مذکور ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا، اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا، اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعوی کیا، جو صحابہ خود لڑے نہ تھے، بلکہ علمدار اور رایت کے محافظ تھے، اُن کا دعوی تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے، اس پر یہ آیت اتری،

یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ	لوگ تجھ سے مال غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں
الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ (انفال)	کہہ دو کہ یہ خدا اور رسول کے لئے ہے

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مال غنیمت کو خود خود نہیں کر سکتے، اس کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے جس طرح آپ چاہیں تقسیم فرمائیں، اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا لیتا تھا، بند ہو گیا، لیکن میدان جنگ کے علاوہ [illegible] موقوف نہیں ہوا، سنن ابی داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، اُن کو لوٹ لائے، اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے، اور کمان جو ہاتھ میں تھی، اُس سے دیگچیاں اُلٹ دیں، اور فرمایا کہ لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں؎

خیبر کی لڑائی سنہ ۷ھ میں ہوئی، اس وقت تک یہ حال تھا کہ اس کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت غصہ آیا، آپ نے تمام صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا،

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوا	خدا نے تم لوگوں کے لئے یہ نہیں جائز کیا کہ
بُيُوتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِإِذْنٍ	اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ مگر (بہ
وَلَا ضَرْبَ نِسَائِهِمْ وَلَا أَكْلَ ثِمَارِهِمْ إِذَا أَعْطَوْا	اجازت) اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو،

؎ کتاب الجہاد باب فی النہی عن النہبی،

تنہ کہ عنیمت ... سنن ابی داؤد باب ... نیز گرون کے پیچھے گیا ... جب ... تو ترو

نغیر اللہ ... ذالفنوی لخوا ...) وہ ادا کرین جوان پر فرض ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا بنتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگون کا جوشن شوق ہے کم ہو جائے لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور دلدادگی زنگئی، غزوہ احد مین صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ تیراندازون کو سخت تاکید فرمادی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ مین مصروف ہو گئے ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے دفعتہ پشت کی طرف سے حملہ کر دیا حنین مین بھی شکست کی اصل وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگون نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی،

غنیمت اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبون کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا، سنن ابی داؤد مین ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ مین حملہ کرنا چاہا، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انھون نے کہا لا الہ الا اللہ کہو تو تم بچ جاؤ گے اور مال بچ جائیگا، سب نے لا الہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دیدیا گیا، جب یہ اپنے ساتھیون مین آئے تو لوگون نے ان کو ملامت کی کہ

احرمتنا الغنیمۃ ... تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ نے ان کی بڑی تحسین کی، اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے جسکو تم نے چھوڑ دیا، اس اس قدر ثواب ملیگا۔

سلہ ابوداؤد باب القول ... کتاب الادب،

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک رنگ [illegible] رغبت [illegible] حاصل کرنا ثواب
کا کام [illegible]۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا
رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے [illegible] ہاتھ آئے، آپ نے فرمایا کہ
اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا [illegible] بیان کی تو لوگوں کو بہت تعجب
ہوا، ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت [illegible] جا کر پوچھو، انھوں نے دوبارہ
پوچھا [illegible] ثواب [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ
[illegible] نہیں ہوگا۔

[illegible] اقتباسات [illegible]

وحشیانہ اور سفا[illegible] — عرب میں از بسکہ [illegible] نہایت وحشیانہ رسمیں قائم
ہو گئی تھیں جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے۔

۱ [illegible] جب [illegible] تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی
قتل کر [illegible] ڈالتے تھے۔

۲ [illegible] کی حالت میں دفعۃً دشمن پر جا پڑتے تھے، اور قتل و غارتگری شروع
کر دیتے تھے، یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا، بہت سے بہادر اس خاص طریقہ
میں زیادہ ممتاز تھے، عادت کو [illegible] کہتے تھے، تابط شرا اور سلیک بن السلکہ
اسی قسم کے لوگ تھے۔

۱؎ سنن ابی داؤد کتاب الجہاد فی من یغزو و یلتمس الدنیا ۲؎ عجم [illegible] کرمانی مطبوعہ ایران ص ۱۳۴۲

(۳) زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے، عمرو بن ہند عرب کا ایک بادشاہ تھا، اس کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا، تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا، چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے، صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمراء تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا، اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا، آنکلا، عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا، اس نے کہا میں کئی دن کا بھوکا تھا، دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا، عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی، جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے،

وَاَخزاكم عمرو كما قد خزيتم   وادرك عمارًا شقيّ البراجم

(۴) بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا، ان بچوں کو لیجا کر ایک وادی میں کھڑا کیا، اور ان کو نشانہ بنا کر قدر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا، تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا، چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی تھی، اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے،

(۵) قتل کا ایک طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے، کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا، غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا، جیسا کہ خود شعر میں تفصیل مذکور ہے،

---

[۱] مجمع الامثال ص ۷۷۴،

[illegible] عرینہ کے لوگ جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اسلام لائے [illegible] آنحضرت صلی اللہ

[illegible] تو اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر اُن کی آنکھوں اور زبان

میں کانٹے چبھو دیے، وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے[1]

(۶) [illegible] انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مُردوں کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہؓ اور دیگر شہدا کے اعضا کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا،

(۷) منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے، سلافہ کے دو بیٹے جنگ اُحد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیے گی، یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ جو نکال کر چبا لیا تھا، اس کا حال اوپر گذر چکا ہے،

(۸) حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے، اور اس پر فخر کرتے تھے، عامر بن طفیل جو عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہے، فخر کرتا ہے،

بقرنا [illegible]   [illegible] الرمح [illegible]

---

[1] یہ واقعہ [illegible] مذکور ہے لیکن تفصیل ابن سعد [illegible] ماخوذ ہے، مسلم میں صرف [illegible] بنی مرثد [illegible]"

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مال غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا اس کی ممانعت میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا، جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی، تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے، ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا،

رجل یرید الجهاد فی سبیل الله	ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے،
وهو یبتغی عرضا من عرض الدنیا	لیکن دنیوی فائدہ بھی چاہتا ہے؟
فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا اجر له	آپ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا
فاعظم ذالک الناس وقالوا للرجل	لوگوں کو بہت تعجب معلوم ہوا،
عد لرسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک	لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر
لم تفهمه (ابوداؤد جلد ۱ ص ۳۴۲)	پوچھ غالباً تو نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا)	کا مطلب نہیں سمجھا،

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کیلئے بھیجتے تھے، لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا، بالآخر جب آپ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ لا اجر له یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا تب لوگوں کو یقین آیا،

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] ایک قبیلہ کے [illegible] ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے انھوں نے کہا کہ لا الہ الا اللہ کہو تو بچ جاؤ گے، لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور حملہ سے بچ گئے، اس پر ساتھیوں نے ان کو

ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا، ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے،

فلامنی اصحابی وقالوا حرمتنا	مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت
الغنیمۃ (ابوداؤد باب ما یقول	کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم
اذا اصبح کتاب الادب،	کر دیا،

جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی شکایت کی تو آپ نے اُن کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیئے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملیگا (ابوداؤد)
قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت "متاعِ دنیوی" کا لفظ آتا تھا، اور اس کی طرف انہماک ورد وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی، جنگِ اُحد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے، تو یہ آیت اُتری،

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ	تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلبگار تھے
مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (آل عمران)	اور کچھ آخرت کے،

جنگِ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا، تو یہ آیت اُتری،

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ	تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو اور خدا
يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (انفال-۹)	آخرت چاہتا ہے

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تنبیہ کے غزوہ حنین میں جو شکست میں واقع ہوا تھا

اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے،

فاقبل المسلمون علی الغنائم	تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے، اور
واستقبلونا بالسھام،	کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا،

اس بناء پر موقع بہ موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کو زیادہ تر تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے کوئی نام کے لئے کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا"؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

من قاتل لتکون کلمة اللہ	جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول
ھی العلیاء[1]	بالا ہو،

بالآخر آپ نے یہ فرما دیا کہ گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے لیکن اگر مجاہد مال غنیمت قبول کرتا ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے، صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں،

ما من غازیة تغزو فی سبیل اللہ	جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے، اور
فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا	مال غنیمت لیتا ہے، وہ آخرت کے ثواب
ثلثی اجرھم من الآخرة ویبقی	کا دو ثلث حصہ لے لیتا ہے، اور آخرت میں

[1] بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمة اللہ ھی العلیا وصحیح مسلم کتاب الامارة۔ (س)

لهم الثلث وان لم يصيبوا غنيمة تم لهم اجرهم[1]

اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا،

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلون سے اُتر گئی اور جہاد سے صرف اعلاے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا، واقعۂ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا،

حضرت واثلہ بن الاسقع ایک صحابی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے، تو اُن کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ کوئی ہے، جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا، اس میں وہ برابر کا شریک ہوگا" ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے، حضرت واثلہ ان سب کو لے کر انصاری کے پاس سب اونٹ لے گئے، اور کہا "یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہون گے۔ انھون نے کہا کہ ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا" (یعنی اونٹ میں نہیں بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی[2])

دوران جنگ میں دشمن کے مال اور جائداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا خصوصاً جب کہ رسد ٹھہر جاتی تھی، اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا، تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی، اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابوداؤد میں

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب بیان قدر ثواب من غزا فغنم و ابوداؤد باب فی السریۃ ص ۳۴۳ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی، باب الرجل یکری دابتہ علی النصف او السہم ص ۳۳۴

ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ کہیں سفر میں گئے، اور نہایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا سب ٹوٹ پڑے، اور بکریاں لوٹ لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی آپ موقع پر تشریف لائے۔ تو گوشت پک رہا تھا، اور ہانڈیاں اُبال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اُس سے ہانڈیاں الٹ دیں، اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے[1]۔

لڑائی عبادت بن گئی اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے، اس قدر پاک اور منزہ کر دیا، کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے جابر اور ظالم، کمزور آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں،

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ	جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں ان
ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ	کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان
لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن	پر ظلم کیا گیا، اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے،
دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا	وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس
رَبُّنَا اللَّهُ (حج-۶)	بنا پر نکال دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا خدا

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا، اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے،

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (انفال ۵)	اور اُن سے لڑو تاکہ فتنہ نہ رہے،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی باب فی النہی عن النہبی اذا کان فی الطعام قلۃ،

جو لوگ خدا پر اور جزا و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے، اور اُن کو جائز و ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی، جہاد سے اُن کا زیر کرنا اور اُن لوگوں کو اُن کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا،

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے
وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ	ہیں، نہ قیامت پر، اور جن کاموں کو
مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ،	خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اس
(توبہ۔۴)	کو حرام نہیں سمجھتے،

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح دولت و مال اور حکومت کا لطف اٹھائیں، بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت و ریاضت اور فقراء کی دستگیری کی تلقین کریں، اور اچھی باتیں پھیلائیں، اور بری کاموں سے لوگوں کو روکیں،

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ	وہ لوگ کہ اگر ہم انکو زمین پر قبضہ دیں تو
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ	وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوٰۃ ادا
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا	کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے،
عَنِ الْمُنْكَرِ (حج۔۶)	اور بُری باتوں سے روکیں گے،

کسی ملک کی فتح سے جو دولت و مال ہاتھ آتا تھا، وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا، جس کو وہ اپنے مصارفِ عیش میں استعمال کرتا تھا، اور دربار کے امراء درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے، لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا،

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ — اور جان رکھو کہ جو کچھ مال غنیمت ہے تو
فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَ — اس کا پانچواں حصہ خدا کا اور رسول کا
لِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ — اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا، اور غریبوں
وَابْنِ السَّبِيلِ ۝ (انفال-۵) — کا اور مسافروں کا،

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورۃً بھی عبادت بنا دیا گیا مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً — مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈ بھیڑ ہو جائے
فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ — تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے
تُفْلِحُونَ ۝ (انفال-۶) — جاؤ تم کامیاب ہوگے،

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تو اللہ اکبر کہتے تھے، اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تھے، تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد پر جا رہے تھے، صحابہ زور زور سے تہلیل و تکبیر کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہئے کیونکہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرا نہیں ہے، بعید [illegible] طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھتے [illegible] فرمایا [illegible] کلمۃ [illegible] حضرت عقبہؓ بن عمرؓ سے روایت [illegible]

[illegible] تکبیر عند [illegible] ابوداؤد

[illegible] تکبیر کہتے تھے، [illegible] تو تسبیح پڑھتے تھے نماز کی [illegible]

[illegible] جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں، [illegible] روایت میں [illegible]

[illegible] جہاد کے [illegible] نماز [illegible] کی گئی، بعد جہاد میں نماز کا طریقہ [illegible]

[illegible] ابتدائے اسلام سے وجود میں [illegible] اور جہاد کی [illegible] ہجرت کے

[illegible] روایت سے [illegible] تعلق ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں

[illegible] ایک [illegible] دوسرے [illegible] سمجھتے تھے۔

غرض [illegible] جنگ جو ہر طرح کے ظلم و ستم اور [illegible] وحشت کا نمونہ تھی [illegible] کی تعلیم

[illegible] حضرت [illegible] تسبیح و تہلیل کی صورت

[illegible] تھا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] جنگ [illegible]

[illegible]

[illegible]

معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ تین دفعہ جنگ میں سے خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس [illegible]
خاک پر ہے، [illegible] دن کا مینہ برس رہی ہیں، اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، نماز [illegible]
زمین سے مٹھی بھر خاک [illegible] ہے، اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعۃً فوج [illegible]
مطلع صاف ہو جاتا ہے،

حنین میں دشمن نے دفعۃً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں [illegible]
آدمیوں میں سے ایک[1] بھی پہلو میں نہیں، سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر [illegible]
لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے، اور ایک پُرجلال آواز آ رہی ہے،

انا النبی لا کذب — میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں

عین اُس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، [illegible]
کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں موت کی تصویریں ہر طرف نظر آ رہی ہیں، [illegible]
کا وقت آ جاتا ہے دفعۃً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امام [illegible]
ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدا، ین بند میں جوش و خروش شور [illegible]
عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں [illegible]
پر چلی جاتی ہیں، اُن کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں [illegible]
اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں، اور مشغول جنگ ہو کر بقیہ نماز پوری کر لیتے ہیں یہ
یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسولؐ) اول سے آخر تک عبادت الٰہی میں مصروف [illegible]

---

[1] چند خاص رفقا کے سوا اشخاص

تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں، اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں "یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے" (اوقیہ دس روپے کے برابر ہوتا ہے) آپ فرماتے ہیں کہ "میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟" وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے "نماز فرض کے بعد دو رکعتیں"[1]

---

[1] ابو داؤد باب التجارۃ فی الغزو،

تمّ المجلد الاوّل من السیرۃ النبویۃ علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ

غزوات نبوی کے اسباب اور نوع

[illegible] کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ [illegible] غزوات نبوی کن اسباب سے وجود میں آئے، اور شارع علیہ السلام نے [illegible] فرمائیں۔

[illegible] نے غزوہ [illegible] قدر وسعت دی ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیے گئے، تو اس کو بھی انھون نے غزوہ مین شمار کر دیا،

غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی سریہ، غزوہ اور سریہ مین لوگون کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ مین کم سے کم [illegible] آدمیون کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ مین کوئی قید نہین، ایک آدمی بھی کہین لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا، تو یہ بھی سریہ ہے، بعضون کے نزدیک غزوہ [illegible] ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس مین شرکت کی ہو،

حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورخین سریہ کہتے ہین وہ چند قسمون پر منقسم [illegible]

[illegible] محکمہ تفتیش یعنی دشمنون کی نقل وحرکت کی خبر رسانی،

(۲) دشمنون کے حملہ کی خبر سن کر [illegible] کے لئے پیش قدمی کرنا،

(۳) قریش کی تجارت کی روک ٹوک [illegible] مسلمانون کو حج وعمرہ کی اجازت دین،

[illegible] کہنا چاہتے [illegible] تاریخی حیثیت سے [illegible] یہ بحث کتاب کی [illegible] حصون مین آئے گی،

(۴) امن وامان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجین بھیجنا،

(۵) اشاعت اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے، اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی، اس صورت مین تاکید کردی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے،

غزوہ کی صرف دو صورتین تھین،

(۱) دشمنون نے دارالاسلام پر حملہ کیا، اور ان کا مقابلہ کیا گیا،

(۲) یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہین، اور پیشقدمی کی گئی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین جولڑائیان واقع ہوئین، یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے انہی مختلف اغراض سے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف اُن کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا، دوسری طرف تمام عرب مین اُن کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیتِ عام ہے، سب جاتا رہے گا، اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریان شروع کین، دوسری طرف تمام قبائلِ عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہوگیا تو تمھاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی،

بیعت عقبہ مین جب انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا "برادرانِ من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو،؟ یہ عرب و عجم سے اعلانِ جنگ ہے" اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالے سے نقل کر آئے ہین،

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے، تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا
نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین و انصار رات کو سوتے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے اور جاگ جاگ کر رکھوالی
[1] ابوداؤد، قریش نے عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ محمد کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا
اور محمد دونوں کا فیصلہ کر دیں گے۔

محکمۂ تفتیش | ان واقعات کی بنا پر ضرور تھا کہ اسلام اور دار الاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں، اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے، چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انتظام پر توجہ کی، وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے، یہ ٹکڑیاں گو خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں یہی وہ وقائع ہیں جن کو مورخین "سرایا" سے تعبیر کرتے ہیں، اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا، کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جا پڑنا ہوتا تھا،

ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔ سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا، اور ایک مہر بہ مہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا۔ دو دن کے بعد انہوں نے کھولا، تو اس میں

سریۂ ابن جحشؓ

[1] ابو داؤد باب فی خبر النضیر

بہ الفاظ تھی،

فسر حتى تنزل نخلة بين مكة و الطائف فترصد بها قريشا و تعلم لنا من اخبارهم،

(طبری ص ۱۳۰۲)

برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جاکر ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے، اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور اُن کی خبریں دریافت کرو،

مدافعت | اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا، تو فوراً خبر ہو جاتی، اور پیش دستی کرکے فوجیں بھیج دی جاتیں، اکثر سرایا اسی قسم کے تھے، اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کرآئے ہیں، اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں، اور قدماے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمیں مدافعت کی غرض سے تھیں،

سریۂ غطفان سنہ ۳ھ

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان جمعاً من بني ثعلبة و محارب بذي امر قد تجمعوا يريدون ان يصيبوا من اطراف رسول الله صلى الله عليه وسلم جمعهم رجل منهم يقال له دعثور

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ و بنو محارب کی ایک فوج ذوامر میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حملہ کرے، اس فوج کو ایک شخص نے

بن الحارث (طبقات ص ۳۲)

خزاعی تھے جن کا نام ... تھا

سریۂ ابوسلمہ

سریۂ ابوسلمہ سنہ ۴ھ

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان طليحة وسلمة ابني خويلد قد سارا في قومهما ومن اطاعهما يدعونهم الى حرب رسول الله صلى الله عليه وسلم (ابن سعد صفحہ ۳۵)

اس سریہ کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ طلیحہ و سلمہ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیرووں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے آمادہ ہوئے ہیں۔

سریۂ عبداللہ بن انیس

سریۂ عبداللہ بن انیس بغرض قتل سفین بن خالد سنہ ۴ھ

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان سفيان بن خالد الهذلي ثم اللحياني وكان ينزل عرنة وما والاها في اناس من قومه وغيرهم قد جمع الجموع لرسول الله صلى الله عليه وسلم

ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور دوسرے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع

غزوۂ ذات الرقاع سنہ ۵ھ

[illegible] رسول الله صلى الله عليه وسلم [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لهم الجموع ..... فمضى)

کے لئے فوجیں جمع کر رہی ہیں آپ چل کھڑے ہوئے

غزوۂ دومۃ الجندل

غزوۂ دومۃ الجندل ۵ھ

قالوا بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان بدومة الجندل جمعا كثيرا ..... وانهم يريدون ان يدنوا من المدينة (ابن سعد ص [illegible])

رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر چڑھنا چاہتا ہے،

غزوۂ مریسیع

غزوۂ مریسیع ۵ھ،

ان بلمصطلق من خزاعة وهم من حلفاء بني مدلج وكان رأسهم وسيدهم الحارث بن ابي ضرار فسار في قومه ومن قدر عليه من العرب فدعاهم الى حرب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجابوه (ابن سعد ص ۴۵)

قبیلہ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے، وہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں، وہاں کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، وہ اپنی قوم کو اور نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے لے کر چلا، اور لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کی دعوت دی، اور لوگوں نے منظور کی،

سریۂ فدک

سریۂ علی بن ابی طالب، بطرف فدک ۶ھ،

بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لهم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ

جمعًا يريدون ان يمدّوا	جو سعد فدک میں یہود خیبر کی کمک کے لئے
يهود خيبر،	فوج جمع کر رہے ہیں،

سریۂ بشیر بن

سریۂ بشیر بن سعد، شوال سنہ ۷ھ،

بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ غطفان
ان جمعًا من غطفان بالجناب	کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے،
قد واعدهم عيينة بن حصن	ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے
ليكون معهم ليزحفوا الى	کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ
رسول الله صلى الله عليه وسلم،	علیہ وسلم پر حملہ آور ہوگا،

سریۂ عمرو بن ا

سریۂ عمرو بن العاص، ذات السلاسل سنہ ۸ھ یہ مقام مدینہ سے ۱۰ منزل ہے

بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم	[illegible]	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قضاعہ
ان جمعًا من قضاعة قد تجمعوا		کا ایک گروہ جمع ہو رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
يريدون ان يدنوا الى اطراف		علیہ وسلم کی طرف بڑھے،

قریش کی تجارت کی روک ٹوک

بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ قریش و مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے، ابوجہل نے حضرت سعد بن معاذ انصاری سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ اگر تم لوگ محمد کو پناہ نہ دو گے، تو تم حج کا طواف نہیں کر سکتے، انہوں نے جواب دیا تھا کہ تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت بند کر دیں گے (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا مدینہ کی راہ سے ہو کر جاتا تھا، [illegible]

کی خاص چیز تھی، کیونکہ کعبہ جس نے تعمیر کیا تھا، مسلمانوں ہی کے دین ابراہیمی کے پیرو
تھے، باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج و عمرہ سے روک دیا، اور اس
کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں
کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دیدیں،

بعض سرایا قبل حدیبیہ

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ "یتعرض لعیر قریش" یعنی اس لئے
فوجیں بھیجی گئیں، یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے کہ کاروانِ قریش کی
روک ٹوک کی جائے، یہ تمام مہمات اسی غرض سے تھیں، لیکن چونکہ قریش تجارت
کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے، اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے
اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آجاتا تھا، اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ
جاتے تھے، تو مالِ تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا، اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو
اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصل مقصد تھا،

یہی روک ٹوک تھی جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کرلی، جس کی رو
سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی، قریش پر کاروانِ
تجارت کی روک ٹوک کا کس قدر اثر پڑتا تھا کہ حضرت ابوذر غفاری نے مکہ میں جب
اپنے اسلام کا اعلان کیا، اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا، ادھر حضرت
عباسؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروانِ تجارت کے سرراہ واقع ہے، تمہاری
[illegible] رستہ روک دے تو تجارت [illegible] کا کیا ہوگا، اور انہوں نے

ڈر کر حضرت ابوذرؓ کو چھوڑ دیا) صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نومسلمون کو واپس دیدین گے، اور ان نومسلمون نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ مین اپنا ایک مستقر قائم کر لیا، (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی، (پھر آیندہ سال انھون نے مسلمانون کو حج وعمرہ کی بھی اجازت دیدی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانون نے قریش کے کاروان تجارت سے تعرض نہین کیا بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجے تھے[1])

امن و امان قائم کرنا اوپر گذر چکا ہے کہ عرب مین اس سرے سے اس سرے تک مطلق امن و امان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہان تک کہ محترم مہینون مین بھی بہانے نکال کر مہینون کے نام بدل دیتے تھے، اور لڑتے تھے، تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلون کا لوٹ لینا عام بات تھی، جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدوقافلون کو لوٹتے رہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند، بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا مین امن و امان قائم کرین، کیونکہ خونریزی، اور قتل سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہین،

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا

اس لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ

---

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۲۸۰

بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ	یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا، تو اس نے
فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (مائدہ ۵)	تمام عالم کو قتل کر دیا،
وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ	اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش
فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَ	کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے
اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ	اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے، اور اللہ
(بقرہ ۲۵)	فساد کو پسند نہیں کرتا،
اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ	جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہیں
وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ	اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ان کی
فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ	سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں، یا پھانسی
تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ	دے دیئے جائیں، یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسری طرف
اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ ۵)	کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے، یا جلاوطن کر دیئے جائیں

حدیث میں ہے کہ جب حضرت عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعاء سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا، اور اس کو خدا کے سوا یا بھیڑیے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اٹھا لیجائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا، یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ

سنن ابی داؤد ج ۲ باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ ص ... باب علامات النبوۃ

سے چلے گی اور آکر کعبہ کی زیارت کرے گی، اور اُس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا، حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے، اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا،

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہل سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں، وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن قائم کرنے کی غرض سے تھے، ہم دو تین مثالیں درج کرتے ہیں،

سریۂ زید بن حارثہ

سنہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ مال تجارت لے کر شام گئے، واپس آتے ہوئے جب وادی القریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے اُن کو مارا پیٹا، اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی جس نے ان لوگوں کو سزا دی،[1]

اسی سنہ میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آرہے تھے، جب حسمی پہنچے تو ہُنَید نے چند آدمیوں کے ساتھ اُن پر ڈاکہ ڈالا، اور جو کچھ اُن کے پاس تھا سب چھین لیا، صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے تدارک کے لئے حضرت زیدؓ کو بھیجا،

سریۂ دومۃ الجندل

سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے، ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے، جو آتا جاتا ہر دن کو ستاتا ہے، اس کے

[1] طبقات ابن سعد ص ۶۵ جلد غزوات۔ [2] ابن سعد ص ۱۹۳

تدارک کے لئے آپ خود تشریف لے گئے مجمع منتشر ہو چکا تھا، لیکن آپ نے چند روز تک وہاں قیام کیا، اور انتظام کے لئے تمام اطراف مین فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دین،

(یہ حالت کچھ مسلمان تاجرون کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کفار قریش کے کاروان تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی، سنہ ۸ھ مین قریش کا کاروان تجارت شام سے واپس آرہا تھا، قبیلہ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سرداری مین تین سو مسلمانون کی جمعیت جس مین حضرت عمرؓ بھی داخل تھے مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا، مسلمانون نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا، تو ایک ایک چھوہارے پر دن دن بھر گذار دیا، [1] — سریۂ خبط یا سیف البحر

صحیح مسلم مین یہ واقعہ مفصل مذکور ہے لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویون نے مختلف بیان کی ہے، اصل راوی حضرت جابرؓ ہین، جو اس واقعہ مین شریک تھے، ایک روایت مین ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی، کتب مغازی مین بھی یہی مذکور ہے، دوسری روایتون کے الفاظ یہ ہین،

(۱) تلقی عیر قریش، قافلۂ قریش سے ملنے کیلئے (۲) نرصد عیر قریش، قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کیلئے

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ صریح غلطی ہے کیونکہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہین کہ یہ مہم قافلۂ قریش

---

[1] ابن سعد ص ۹۴، جلد غزوات [2] ابن سعد جزء مغازی سریۂ خبط [3] صحیح مسلم باب اباحۃ میتۃ البحر صحیح بخاری باب غزوۂ سیف البحر مین بھی یہ روایتین ہین)

کی حفاظت اور جینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی، حافظ ابن حجر کی بھی یہی تحقیق ہے[1]،

عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ گرچہ ہر دفعہ اُن کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے، یہان تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، ڈاکے ڈالتے تھے، ۶ھ؁ مین قبیلۂ فزارہ کی آبادی مین قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہان کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود مین جو سیراب تھے، مویشی چرائے لیکن ۶ھ؁ مین اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا حملہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس اونٹنیان لوٹ لین، حضرت ابو ذرؓ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے، اُن کو قتل کر دیا، چنانچہ ارباب سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہین، **غزوۂ غابہ**

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا، اور خیبر فتح مکہ تک کفار سے جو لڑائیان جاری رہین، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی، قطاع الطریقی اور قتل و تاراج تھا، اسلام ان چیزون کو مٹاتا تھا، اس لیے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے،

بے خبری مین حملہ کرنے کا سبب

عرب کے قبائل دو قسم کے تھے، ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، اُن کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہان چشمہ یا سبزہ زار دیکھا، خیمے ڈال دیئے، جب وہان بھی پانی نہ رہا، تو خبر رسان

---

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۶۱ و ۳۶۲،

کسی وقت ان کی خبر پاتے، اور وہان پہنچ جاتے، ان قبائل کو عربی مین اعراب و بدو کہتے ہین زیادہ تر جو قافلے ڈاکے ڈالا کرتے، اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، اسی قسم کے قبائل تھے، ان کا انتظام اُن کی روک تھام نہایت مشکل تھی، اُن کی تعزیر کے لئے فوجین بھیجی جاتی تھین تو یہ پہاڑون پر بھاگ جاتے تھے، اور وہین پناہ لیتے تھے، اس لئے مجبوراً جو فوجین اُن پر بھیجی جاتی تھین، غفلت مین بھیجی جاتی تھین کہ وہ بھاگ نہ جانے پائین،

اندرین حالات ایک بیان مین اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فوجین بھیجین جو راتون کو چلتی تھین، اور بے خبری کی حالت مین موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھین، اور قبائل کو لوٹ لیتی تھین، اس قسم کے واقعات تمام کتابون مین کثرت سے منقول ہین، اور ان ہی واقعات سے یورپ کے لوگون نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا، اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے، اسی بنا پر **مارگولیوس** نے یہ استدلال کیا ہے کہ "چونکہ بہت دنون تک مسلمانون کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری مین حملہ کرکے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے"

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرا، اور کد و کاوش سے تمام واقعات بہم پہونچائے جائین تو ثابت ہوگا کہ اچانک حملہ انہی قومون پر کیا جاتا تھا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ اُن کو خبر ہوگی تو پہاڑون کی چوٹیون پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائین گے چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ اُن لوگون کو خبر ہوگئی اور وہ کسی طرف چل دیئے اس قسم کے چند واقعات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہین اُن مین سے بعض مین آپ خود تشریف لے گئے اور بعض مین کچھ دستے بھیجے،

غزوۂ بنو سُلیم

غزوۂ ذات الرقاع

سریۂ عکاشہ

سریۂ علی بن ابی طالب

غزوۂ بنو سُلیم ۳ھ (ابن سعد صفحہ ۲۴)

وَاَغذَّ السیر.... فوجدھم قد تفرقوا فی میاھھم فرجع،	اور بہت تیزی سے بڑھ کر گئے لیکن وہ لوگ پہلے چشموں کی طرف چل دیے تھے (الٹے لوٹ آئے)

غزوۂ ذات الرقاع، ۳ھ،

وھربت الاعراب الی رؤس الجبال	اور عرب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے،

سریۂ عکاشہ ۳ھ

وجّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاشۃ بن محصن الی الغمر فی اربعین رجلا فخرج سریعا یغذ السیر... فھربوا. (ص ۶۱)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ بھیجا وہ بڑھ کر گئے، .... لیکن وہ لوگ بھاگ گئے،

سریۂ علی بن ابی طالب الی بنی سعد ۳ھ،

فبعث الیھم علی ابن ابی طالب فی مائۃ رجل فسار اللیل وکمن النھار حتی انتھی الی الھمج فاغار واعلیھم فاخذ وا خمس مائۃ بعیر و الفی شاۃ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ راتوں کو چلتے تھے، اور دن کو چھپ رہتے تھے یہاں تک کہ مقام ہمج پہنچ گئے، پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچسو اونٹ اور

وهربت بنو سعد بالظعن	دوسرے بھیان لوٹیں اور بنو سعد مستورات
(ص ۶۵۰)	کو لے کر بھاگ گئے۔

غزوۂ بنو لحیان

(غزوۂ بنو لحیان ۶ھ

فسمعت بهم بنو لحیان فهربوا	بنو لحیان نے ان کی آمد سنی تو پہاڑوں کی
فی رؤس الجبال	چوٹیوں پر بھاگ گئے،

سریۂ عمر بن خطاب

سریۂ عمر بن خطاب بطرف تربہ ۷ھ،

فكان يسير الليل ويكمن النهار	راتوں کو چلتے تھے، اور دن کو چھپ جاتے
فاتى الخبر هوازن فهربوا	تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار
جاء عمر بن الخطاب محالهم	ہو گئے، حضرت عمرؓ ان کے پڑاؤ پر پہنچے
فلم يلق منهم احدا)	تو کسی کو نہ پایا)

سریۂ کعب بن عمیر

سریۂ کعب بن عمیر ربیع الاول ۸ھ،

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ شخصوں کو شام کی طرف بھیجا، ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی، ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے انکار کیا، اور ان پر تیر اندازی شروع کی، مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے، اور بالآخر سب شہید ہوئے، صرف ایک صاحب بچے، انھوں نے آکر خبر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے انتقام لینا چاہا، لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے، ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں،

وهم بالبعث اليهم فبلغه | ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر معلوم ہوا
انهم قد ساروا الی موضع اخر | کہ وہ اور کہین چلے گئے .

اشاعتِ اسلام | (ان اغراض کے علاوہ، اور جو سرایا بھیجے گئے، اُن کی غرض اشاعتِ اسلام ہوتی تھی، لیکن چونکہ ملک مین امن وامان نہ تھا، اور نیز دشمنون نے، ہر طرف سے اُس تحریک کی آگ لگا رکھی تھی لیکن دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے، اُن کی زندگی ہمیشہ معرضِ خطر مین رہتی تھی ،

سریۂ بیر معونہ | صفر ۴ھ مین ستر داعیانِ اسلام کی جماعت قبیلۂ کلاب مین رئیسِ قبیلہ کی دعوت پر اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجی گئی لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل وذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی، صرف ایک صاحب بچ گئے تھے جنھون نے مدینہ آکر خبر کی ،

سریۂ مرثد | اسی زمانہ مین یعنی صفر ۴ھ مین قبیلۂ عضل وقارہ نے تعلیم وارشاد کے لئے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عاصمؓ، حضرت خبیبؓ، حضرت مرثد بن ابی مرثد وغیرہ دس صاحبون کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع مین پہنچ

غزوۂ بنو لحیان | کر بنو لحیان نے اُن پر حملہ کیا، اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کردیئے گئے، ۶ھ مین بنو لحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی، وہ سُن گن پاکر بھاگ گئے تھے ،)

سریۂ ابن ابی العوجا | ۷ھ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داعیون کی ایک جماعت جس مین پچاس آدمی شامل تھے، قبیلۂ بنی سلیم کے پاس بھیجی، اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجا تھے، انھون نے بنو سلیم کو دعوت دی لیکن ان لوگون نے انکار کیا، اور تیر اندازی شروع کی یہ لوگ بھی لڑے لیکن پچاس آدمی

قبیلے کے قبیلے کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ تمیں فوج یعنی ابن ابی العوجار کے سوا سب شہید ہوئے۔

سریۂ کعب بن عمیر

ربیع الاول سنہ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عمیر غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوت اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے، ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی لیکن جواب میں تیغ و سنان تھا، یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوگئی، صرف ایک صاحب بچ گئے جنھوں نے آکر مدینہ میں خبر کی،

اس بنا پر اکثر دعوت اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے، اُن کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی لیکن اس صورت میں بہ تصریح افسروں کو کہدیا جاتا تھا کہ صرف اشاعت اسلام مقصود ہے، لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں مثلاً فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، اور ۳۰۰ آدمیوں کی جمعیت ساتھ کر دی تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوت اسلام مقصود ہے لڑائی مقصود نہیں، چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:۔

بعثه الی بنی جذیمة داعیا الی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو بنو جذیمہ کی
الاسلام ولم یبعثه مقاتلاً	طرف بھیجا دعوت اسلام کیلئے، نہ کہ لڑنے کیلئے

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں:۔

وبعث رسول الله صلی الله علیه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں

بعثہم فیما حول مکۃ السرایا تدعوا الی اللہ عزوجل ولم یامرھم بقتال[1]

آپ نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے دعوتِ اسلام کے لئے، اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو آپ کھڑے ہو گئے، اور قبلہ رُخ ہو کر کہا اے خدا خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں، تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا انہوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا خون بہا ادا کیا، اور اس پر مزید رقم دی، یہ واقعہ باختلافِ الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے،

اسی طرح سنہ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا، تو آپ نے فرمایا،

فاذا نزلت بساحتہم فلا تقاتلہم حتی یقاتلوک (ابن سعد مغازی ص ۱۲۲)

جب تم وہاں پہنچ جاؤ، تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں، جو فتح مکہ کے بعد بت شکنی کے لیے عرب ملک میں روانہ کئے گئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بتخانے تھے، فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جاہلانہ وہم رفتہ رفتہ بعض قبائل سے دفع ہو سکا [illegible] گو وہ ان کو لائق پرستش نہیں سمجھتے تھے تاہم ان کے دل میں ان [illegible]

[1] تاریخ طبری ص ۵۹ ج ۳

جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی، اُس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں، جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب کا اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا، اہلِ طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ اُن کا بتخانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظور نہ فرمایا تو دوسری طرف شرط یہ پیش کی کہ ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے بعض اور نومسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں ہچکتے تھے، اس بنا پر ان مقامات میں چند، راسخ العقیدہ، اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ اُن کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں، چنانچہ سریہ خالد بن ولید بتخانہ **عزّی** سریہ عمرو بن العاص، بتخانہ سواع، سریہ سعد بن زید اشہلی بتخانہ **مناۃ** سریہ ابوسفیان و مغیرہ بن شعبہ بتخانہ **لات** سریہ جریر بتخانہ ذی الخلصہ سریہ طفیل بن عمرو دوسی بت خانہ **ذی الکفین** اور سریہ علی بن ابی طالب بنی طے **فلس** کے توڑنے کو روانہ کیے گئے[1]

جنگی اصلاحات

جنگ خیالِ انسانی کا بدترین منظر ہے، عرب کی جنگ تو ظلم، توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی، اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی لیکن، اعجازِ نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی،

کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارتگری متوارث چلی آتی ہے تو شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرزِ عمل کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، جس کو

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ ذی الخلصہ و اس باب میں تمام حالات ابن سعد جزو مغازی سے ماخوذ ہیں

جنی اصطلاح میں علاج بالمثل کہہ سکتے ہیں، آغاز اسلام میں حملہ آور جنگ کے متعلق بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں، جو پہلے سے رائج تھے، مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے، اور قتل و قید کرتے تھے، اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا، لیکن ابتدا ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا، تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعۃً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے، اور مسلمان اُن کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے، یا کرتے تو پہلے اُن کو خبر کرتے جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے، یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے، لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی، اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے، یہاں تک کہ ایک ایک کے سب کا خاتمہ ہو گیا،

اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا، اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے اُن کو ہم تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں، اُن صفحات کو دوبارہ سامنے رکھو، اور اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں،

اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بڈھے، بچے، صغیر السن جو میدان جنگ میں قتل کیے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردار فوج کو جو ہدایتیں دی جاتے تو اُن میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا[1] ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے،

لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا
ولا صغیرا ولا امرأۃ

---

[1] صحیح مسلم باب بجی دعاۃ کتاب ... ابوداؤد میں یہ باب کتاب ... پہلا باب مراد ہے) س"

غزوات مین کبھی کسی عورت کی لاش آپ کی نظر سے گذرتی تو آپ نہایت سختی سے منع فرماتے، صحیح مسلم مین متعدد حدیثین اس کے متعلق مذکور ہین،

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمن کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیرون کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے، عربی مین اس طریقہ کو صبر کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا،

ایک دفعہ حضرت خالدؓ کے صاحبزادے (عبدالرحمن) نے ایک لڑائی مین چند آدمیون کو گرفتار کرکے اسی طرح قتل کرایا تھا، حضرت ابو ایوبؓ انصاری نے سُنا تو کہا "مین نے رسول اللہ کو سُنا وہ اس سے منع فرماتے تھے، خدا کی قسم مین مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہین رکھتا" عبدالرحمن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے،[1]

لڑائیون مین عہد کی کچھ پابندی نہ تھی، جنگ معونہ وغیرہ مین کفار نے مسلمانون کے ساتھ یہی معاملہ کیا یعنی قول و قسم دے کر مسلمانون کو ساتھ لا گئے، اور گھر لے جاکر قتل کرڈالا، قرآن مجید مین انھی واقعات کی طرف اشارہ ہے،

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا	کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ کسی قسم کا لحاظ
ذِمَّةً إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ	رکھتے ہین نہ ذمہ داری کا، اُن کی قسم قسم
(توبہ - ۲)	نہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے، ہر حال مین اس کی پابندی کیجائے

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۰ باب قتل الاسیر بالنبل

قرآن مجید میں اس کے متعلق جا بجا تاکید ہی اور صاف احکام ہیں، عہد نبوت اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں پابندی عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، اُن میں حضرت حذیفہ بن یمان اور اُن کے والد بھی تھے، جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور اُن کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے، انھوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے، کفار نے اُن سے عہد لے کر چھوڑ دیا، یہ لوگ مقام بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اور یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے مصروفِ جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو،

ابو رافعؓ کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا، دربارِ نبوت میں آکر اُن پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے، اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا، آپ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے، اس وقت واپس جاؤ، پھر آ جانا، [1]

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابو جندلؓ پابزنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے، کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ہاں لیکن قریش سے معاہدہ

[1] ابوداود حصہ ۲ ص ۲۳ (باب فی الامام یستجن بہ فی العہود)

ہوچکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے، اس پر حضرت
ابوجندلؓ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا، لوگ جوش رقت سے بیقرار ہوگئے، اور قریب
تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں حضرت عمرؓ بیتاب ہوگئے، حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن پابندی عہد کی قوت ان سب خطرات
سے زیادہ تھی، حضرت ابوجندلؓ کو پابزنجیر واپس جانا پڑا،

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا، صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا، اور
قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا، لیکن باہر والوں نے بچا لیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کئے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد
بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ نے فرمایا کہ قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل
کر دیا جاتا، مورخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد
قتل نہیں کئے جاتے تھے،

اسیران جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے، اور تمام قوموں میں بھی
یہی طریقہ جاری تھا، جنگ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی
تھیں، تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں،

علامہ ابن جبیر جب حروب صلیبیہ کے زمانہ میں سسلی میں گذرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر
تڑپ گئے چنانچہ لکھتے ہیں ۔۔

ومن الفجائع التی یدالہم من	اور منجملہ ان دردانگیز حالات کے جو ان شہرون
حل بلادھم اسری المسلمین	مین نظر آتے ہین، اسیران اسلام ہین جو
یرسفون فی القیود ویصرفون فی	بڑیان پہنے نظر آتے ہین، اور جن سے سخت
الخدمۃ الشاقۃ والاسیرات	محنت شاقہ لی جاتی ہے، اور اسی طرح
المسلمات کذلک فی اسوقھن	مسلمان عورتین پنڈلیون مین لوہے کے
خلاخیل الحدید تتفطرلھم	کڑے پہنے سخت محنت شاقہ سے کام
الافئدۃ،[1]	کرتی ہین جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے؛

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کی نسبت تاکید کی کہ ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیران بدر کو جب آپ نے صحابہ کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے چنانچہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے، اور قیدیون کو کھانا کھلاتے تھے؛ غزوہ حنین مین چھ ہزار اسیر تھے، سب چھوڑ دیئے گئے، اور آپ نے اُن کے پہننے کے لیے چھ ہزار جوڑے مصر کے کپڑے کے، عنایت فرمائے چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے؛ حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی، تو آپ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ مین اسکو مقیم کیا، اور فرمایا کہ کوئی تمھارے شہر کا آجائے تو مین اس کے ساتھ تم کو رخصت کردون چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ اُن کو بھجوا دیا،

قرآن مجید مین جہان خدا نے بندگان خاص کے اوصاف بتائے ہین وہان فرمایا ہے؛

ویطعمون الطعام علی حبہ	اور یہ لوگ خدا کی محبت مین مسکین کو یتیم کو

[1] رحلہ ابن جبیر مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۷ء ص ۳۰۷،

مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا (دهر ۱) اور قیدیون کو کھانا کھلاتے ہین،

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہلِ فوج چارون طرف دور دور پھیل جاتی جس سے راستے بند ہوجاتے، گھرون مین آنا جانا مشکل ہوجاتا، راہ گیرون کا مال ومتاع لُٹ جاتا، یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا، ایک لڑائی مین قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتین لوگون سے سرزد ہوئین، آپ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کریگا اس کا جہاد جہاد نہین،

ابوداؤد مین حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

غَزَوْتُ مَعَ نَبِيِّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	مین فلان غزوہ مین آپکے ساتھ تھا لوگون
غَزْوَةَ كَذَا وَكَذَا فَضَيَّقَ النَّاسُ	نے دوسرون کے پڑاو پر جاکر ان کو تنگ کیا،
الْمَنَازِلَ وَقَطَعُوا الطَّرِيْقَ فَبَعَثَ	لوٹا مارا، آپ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے
النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنَادِيًا يُنَادِيْ	منادی کی کہ جو دوسرون کو گھرون مین
فِي النَّاسِ اَنَّ مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا	تنگ کرے یا لوٹے، مار اس کا جہاد
اَوْ قَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَ لَهُ[1]	قبول نہین،

ابوداؤد مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر ادھر پھیل نہ جایا کرین تو لوگ اس طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اوس کے نیچے آجاتے[2]

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۰۵ (باب ما یومر من انضمام العسکر) [2] ابوداؤد کتاب الجہاد (باب ما یومر من انضمام العسکر)